باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

ناولٹ

رمضان مبارک

افسانے

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا' افریقہ' یورپ......5000روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی OB-7 تالپور روڈ، کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو
زرِمبادلہ بھیجیے
اندرون ملک =/890 روپے
ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زرسالانہ
کویت 155امریکی ڈالرز
ایران 155امریکی ڈالرز
سعودی عرب 155امریکی ڈالرز
سری لنکا 155امریکی ڈالرز
یواے ای 155امریکی ڈالرز
جاپان 155امریکی ڈالرز
مصر 155امریکی ڈالرز
لیبیا 155امریکی ڈالرز
یونان 155امریکی ڈالرز
ڈنمارک 155امریکی ڈالرز
فرانس 155امریکی ڈالرز
جرمنی 155امریکی ڈالرز
برطانیہ 155امریکی ڈالرز
ہالینڈ 155امریکی ڈالرز
ناروے 155امریکی ڈالرز
پولینڈ 155امریکی ڈالرز
امریکہ 165امریکی ڈالرز
کینیڈا 165امریکی ڈالرز
افریقہ 165امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 165امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

دعا

رمضان المبارک کا بابرکت ماہ ایک بار پھر ہمیں نصیب ہو رہا ہے۔ یہ وہ ماہ ہے جس میں اللہ رب العزت اپنے بندوں کی تمام دعائیں قبول فرماتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اس بار اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم رمضان المبارک کو اس کے حقیقی جذبے کے تحت اپنے درمیان پائیں۔ سچے دل سے عبادت کریں، اللہ کی خوشنودی کے لیے بھوک اور پیاس برداشت کریں اور اس کی مخلوق کے کام آئیں۔ عید کی خوشیوں میں اپنے تمام بہن بھائیوں کو شریک کرسکیں۔ میری دعا ہے کہ رب کائنات اس بابرکت ماہ کے صدقے میرے وطن عزیز کو دشمنوں اور دوست نما دشمنوں سے محفوظ رکھے، میرے وطن میں امن ہو...... اور ہم وطنوں کے چہروں پر سچی خوشی...... اور اے تمام جہانوں کے رب میری دعا ہے کہ تُو میری تمام دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ (آمین)

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزق حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

مدیرِ اعلیٰ

میرے عزیز لکھاری اور قارئین اللہ مجھ سمیت آپ سب کو رمضان کی برکتوں سے مالا مال فرمائے۔ رمضان سے پہلے عید کی تیاری زوروں پر ہے۔ بھئی میں شاپنگ کی بت نہیں کر رہی بلکہ عید غم کی بات کر رہی ہوں لہٰذا سکھیوں ذرا جلدی جلدی قلم چلاؤ اور زبردست قسم کے افسانے بھیجو۔ عید کے بعد انشاء اللہ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی بھی تیاری ہے۔ بس اللہ کرے موسم بہتر ہونا شروع ہو جائے ورنہ موجودہ حالات دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے فنکشن کا تخت سمندر پر بچھانا پڑے گا۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے پہلے ان تمام پڑھنے والوں کا شکریہ جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر دوشیزہ کا مطالعہ کیا اور مجھے تفصیلاً آگاہ بھی کیا۔ کچھ لوگ اپنی تحریر بھیج کر پھر غائب ہو گئے ہیں۔ ان سے گزارش کی جاتی ہے کہ اب غائب نہ ہوں...... غائب ہونے کے لیے اور بہت سی چیزیں ہیں جیسے بجلی، پانی، محبت، خلوص وغیرہ وغیرہ...... سو میری پیاری بہنوں اپنی پیاری سی مدیرِ اعلیٰ کی بات مانو اور جلدی جلدی اپنی حاضری لگاؤ پھر کہیں ایسا نہ ہو دیر ہو جائے...... ان محبت بھری دھمکیوں کے بعد اب چلتے ہیں محفل کے پہلے خط کی طرف، عقیلہ حق کراچی سے لکھتی ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ، خوش رہیے۔ بہت دنوں بعد نہیں بلکہ کئی مہینوں کے بعد تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس قدر خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ اگر غائب ہو جاؤں گی تو لوگ یاد کریں گے۔ واللہ کیا ارمان خاک میں ملے۔ کسی نے پلٹ کر بھی نہ پوچھا عقیلہ حق کہاں ہو؟ کدھر ہو؟ خیر کوئی بات نہیں سوچا خود ہی آ جاؤں سو آ گئی۔ بچوں کے امتحانات ہو رہے تھے اور میرے بیٹے وجیہہ حق کا اکیڈمک کے ساتھ ساتھ وفاق المدارس (شعبہ حفظ) کا بھی امتحان قریب ہے۔ تو رائٹر تو کہیں جاسوئی اور ایک ماں آج کل کمربستہ ہے۔ جو رات دن بچوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے اُن کا سلیبس اِس قدر یاد ہو گیا کہ دل چاہ رہا ہے۔ خود جا کر پیپرز دے آؤں اور پھر پورے سندھ میں ٹاپ کرنے کا خواب پورا کرلوں۔ لیکن ماشاء اللہ یہ خواب بچے پورا کرنا چاہتے ہیں اللہ پاک اُن کو اُن کے ارادوں میں کامیاب کرے (آمین) اور پھر فیس بک کی طرح کہوں گی کہ ایک آمین کا تو حق بنتا ہے۔ تو پہلے لائک کریں اور پھر Comments میں آمین لکھ دیں۔ ادارا یہ دل دُکھانے والا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے میں چند دن کے لیے (اس حادثے سے پہلے) لاہور گئی تھی۔ اور پھر میرے بچے بہت ضد کر کے گلشن اقبال پارک گئے تھے۔ یا اللہ جو جگہ بم بلاسٹ کی دکھائی گئی تھی،

وہاں کھڑے ہو کر تو میں اپنے بچوں کے ساتھ، اپنے ٹرن کا انتظار کر رہی تھی۔ اللہ پاک سب کو محفوظ رکھے (آمین) دوشیزہ کی محفل واقعی دوشیزہ کی محفل ہے۔ میں سب کے خط پڑھ کر بہت انجوائے کرتی ہوں اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آسان لکھنا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت مشکل لفظوں کے ساتھ لکھنے کے...... کاشی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا کب؟ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلا۔ بھائی کاشی خیریت سے ہو، اپنی خیریت سے آگاہ بھائی۔ رائٹر عبدالعزیز صاحب کی والدہ کے انتقال پر دلی تعزیت قبول ہو۔ اب آتے ہیں رسالے کی طرف میکال حسن کے بارے میں پڑھنا اچھا لگا، اچھا تو رفعت سراج صاحبہ کا ناول بھی ہے اور ناول سے یاد آیا، منزہ صاحبہ پری کا ٹائٹل تو آپ کو مل چکا ہے۔ میری طرف سے تحفہ حسن کے ساتھ حسینہ کا ٹائٹل میرے ناول کے ساتھ قبول فرمایئے جو میں آپ کو بھیج رہی ہوں، اور میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ اور کاشی چوہان کی حوصلہ افزائی اور آپ کے ادارے کے تعاون سے میں ایک طویل ناول لکھ سکی۔ اس کے لیے میں ادارہ دوشیزہ کے دوشیزہ کے ہر فرد کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اُم مریم کا ناول بہت طویل ہو گیا ہے۔ زیادہ طوالت حسن کھو دیتی ہے جیسے قدر کھو دیتا ہے روز...... روز کا آنا جانا...... مہتاب خان کا افسانہ اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے تھا۔ میں بھی اس بات کی قائل ہوں کردار صرف لڑکی کا ہی نہیں، مرد کا بھی دیکھنا چاہیے۔ میں نے بھی اپنی زندگی میں ایک رشتہ یہ کہہ کر منع کیا تھا کہ آپ نے کیسے سوچ لیا ہر لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھنے کے بعد آپ مجھ سے شادی کر لیں گے۔ پاکباز مرد...... میری اولین ترجیح ہے اور الحمدللہ مجھے ایک پاکباز مرد ملا۔ نسیم سکینہ صدف کی کہانی درمیانے درجے کی رہی۔ روحیلہ خان نے اچھا لکھا، سباس گل اچھا لکھتی ہیں اور اُن کا مکمل ناول بہت عمدگی سے اپنے اختتام کو پہنچا۔ ڈیئر منزہ بے انتہا مصروفیات کی وجہ سے پورا رسالہ ابھی تک نہ پڑھ سکی لیکن پڑھوں گی ضرور، پڑھوں گی نہیں تو سیکھوں گی کیسے؟ لیکن جتنا پڑھا اُس پر تبصرہ حاضر ہے۔ افسانہ تو عنقریب لے کر حاضر ہوں گی ہی...... کچھ گپ شپ بھی لگاؤں گی لیکن کیا کروں مجھ سے اچھا تو میرا ڈرائیور ہے جب دل چاہتا ہے چھٹیاں لے کر گاؤں روانہ ہو جاتا ہے اور ہم خواتین...... ایک دن کی بھی چھٹی نہیں...... خیر ملاقات تو کرنی ہے۔ کاشی کی خیریت ضرور پوچھیے گا، دفتر میں سب کو درجہ بدرجہ سلام اور آپ کو اپنے حسینہ بہت سارا......؟

ج: بہت ہی عزیز عقیلہ کراچی میں رہ کر اتنی زندہ دلی ہر لفظ کھلکھلاتا ہوا میری نظروں کے سامنے ہے تمہارا خط پڑھ کر ہمیشہ ہی بہت مزہ آتا ہے۔ اب تو مزاح لکھنا شروع کر ہی دیں۔ ناول کتابی شکل میں موصول ہوا تو دل سے آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ اس دفعہ تو رسالے میں آپ ہی آپ ہیں ظاہر ہے بھئی اب دوشیزہ میں دوشیزہ ہی تو ہوگی۔ بس اب تو آپ کے وعدے پر جی رہے ہیں۔ دیکھیے کب دیدار نصیب ہوتا ہے۔

✉: کراچی سے ہی تشریف لائی ہیں غزالہ عزیز، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ جی! السلام علیکم! پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ امید ہے کہ آپ اپنی فیملی اور رخسانہ آنٹی کے ساتھ خیر و عافیت سے ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے دوشیزہ کی محفل اور آپ کے کاشانۂ اہل عیال کو سدا سرسبز و شاداب رکھے۔ آپ کے مسکراتے چہرے کی چمکتی مسکراہٹ کو دوام ملے آمین۔ دوشیزہ کی محفل میں کافی عرصے کے بعد حاضر ہوں۔ چونکہ دوشیزہ کی محفل آج کل آپ نے سنبھالی ہوئی ہے۔ اس لیے ایک افسانہ حاضرِ خدمت ہے۔ افسانے کا نام 'ستی' (**Satti**) ہے۔ اُمید ہے آپ دوشیزہ کے کسی قریبی اشاعت میں شامل ضرور فرمائیں گی۔ چونکہ دوشیزہ کے مئی کے شمارے پر

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ
مئی 2016 کا نتیجہ۔ قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے
نگہبان اُمید صبیحہ شاہ
دردِ دل کے واسطے سنبل
آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟
دوشیزہ
جون 2016
عنوان
قلم کار
نام
پتا
ماہنامہ دوشیزہ کراچی

تبصرہ کے لیے لیٹ ہو چکی ہوں۔ اس لیے معذرت کے ساتھ تبصرہ اگلے شمارے کے لیے اُدھار رہا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ رفعت سراج اور اُم مریم کے سلسلے وار ناول کے ساتھ ناولٹ اور تمام افسانے بہترین جا رہے ہیں۔ باقی سلسلے بھی گلدستے میں اپنی اپنی بہار اور خوشبو بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ خدا کرے آپ کے پرچوں اور آپ کا ادبی شخصی مقام بلندیوں کی جانب محو پرواز رہے (آمین)۔ صرف آخر میں آپ سے ایک شکایت کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔ کیونکہ شکوے گلوں کی روایت ہے کہ یہ ہمیشہ اپنوں سے ہی ہوتے ہیں۔ چند ماہ پہلے میری آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ اور اتفاق سے اُن ہی دنوں دوشیزہ کی جانب سے اپنی معزز رائٹرز خواتین کے لیے لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کاشی نے مجھے فون پر انوائٹ کیا تھا تو میں نے آنے سے معذرت کر لی تھی۔ کیونکہ اُس روز میری آنکھ کے آپریشن کو دوسرا دن تھا اور میرا شریک محفل ہونا ممکن نہیں تھا۔ اب اللہ کے کرم سے آنکھ بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے آنکھوں میں سوزش بتائی ہے۔ جس کا ٹریٹمنٹ اب بھی چل رہا ہے۔ شکایت یہ ہے کہ پچھلے دنوں نیلوفر عباسی صاحبہ کی پاکستان آمد پر دوشیزہ (ادارے) کی طرف سے اُن کے اعزاز میں دوستوں کی محفل منعقد کی گئی۔ دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی نیلوفر عباسی سے ملنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کی خواہش تھی۔ اپنے دوز کی اتنی چلبلی اداکارہ سامنے سے دیکھنے اور سُننے میں کیسی ہیں۔ مگر ادارے کی طرف سے آپ نے اور کاشی چوہان نے اس محفل میں شرکت کی دعوت نہیں دی۔ مجھے مئی کے شمارے میں کاشی کے قلم سے ایک خوبصورت شام کا احوال پڑھ کر خوشی کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ میں اس شام کا حصہ نہیں تھی۔ بہر حال یہ ایک چھوٹا سا گلہ ہے کہ اتنے سالوں سے دوشیزہ میں شرکت کے باوجود اگر کسی عذر کی وجہ سے ہم رائٹرز حاضر نہ ہو سکیں تو ہماری غیر حاضری کسی کو Feel نہ ہو۔ یہ تو زیادتی ہے۔ مگر یہ شکایت آپ کی ذات سے نہیں ہے۔ آپ نے تو کچھ ہی عرصے سے دوشیزہ کی محفل کی میزبانی سنبھالی ہے۔ بس میں نے ادارے کی طرف سے جو بے اعتنائی محسوس کی اُسے بیان کر دیا۔ امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ کیونکہ آپ جیسی پیاری شخصیت سے بہت کم ہی کسی کو شکایت ہو سکتی ہے۔ یہ شکوے گلے کا سلسلہ شاید طویل ہو رہا ہے۔ اس لیے میں اب اجازت چاہوں گی۔ افسانہ پڑھ کر ضرور اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔ آخر میں یہی دعا ہے کہ تیرے رُخسار کی نرمی و ملاحت، چمکتی پیشانی کا نور تیرے لہجے کی شیریں بیانی لبوں کی مسکراہٹ شگفتگی خدا کرے کبھی زوال نہ پائے (آمین)۔

ڈیئر غزالہ! بہت اچھا لگا تم دوشیزہ کی محفل میں آئیں تمہارا شکوہ سر آنکھوں پر بس کچھ رائٹرز لنچ پر بلانے سے رہ گئے تھے۔ جو دوشیزہ کے سینئر موسٹ رائٹرز ہیں۔ یہ اہتمام انہی کے لیے تھا۔ پھر ہماری قسمت اچھی تھی کہ نیلوفر بھی آئی ہوئی تھیں۔ لہٰذا ایک اچھی شام ہم سب کو مل گئی۔ تمہارا افسانہ مل گیا ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔ ایک راز کی بات بتاؤں تم تبصرے کے لیے لیٹ نہیں ہوئی تھیں۔ چلو اگلی دفعہ تبصرے کے ساتھ آنا۔ خوش رہو۔

اور یہ ہیں ہماری خولہ عرفان، لکھتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح ڈھیروں دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ حاضر محفل ہوں۔ جب سے سنا تھا کہ خط کے جواب میں آپ نے پُرخلوص سی چائے کے لیے مدعو کیا ہے۔ نظر آپ کے جواب کی چشم بوسی کے لیے بیقرار ہو گئی تھی بالکل! ایسے ہی جیسے جواب زیرِ مطالعہ لانے کے بعد یہ انگلیاں لکھنے کے لیے اتنی بیقرار تھیں کہ ایک دن میں ہی یہ نظریں ناولوں کو چھوڑ کر جملہ افسانے اور ناولٹ مع

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا

کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو

ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ

سی کوشش

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

نئے لہجے کی آواز ہیں۔ دوشیزہ گلستان کے زیر مطالعہ لے آئیں۔ اب آپ یقیناً سوچیں گی کہ خولہ کو پڑھنا نہیں آتا یا نظر کہ اُس نے خط سنا تو جناب بات دراصل یہ ہے کہ گلستان ادب کا ایک بہت خوشبودار اور خوبصورت پھول خوش قسمتی سے میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ جی ہاں آپ کی بہت پیاری رائٹر اور شاعرہ فرح اسلم سے گزشتہ تین سالوں سے کولیگ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اللہ اس کو اور آپ کو اپنی فیملی سمیت دین و دنیا میں کامیابیاں اور سرخروئیاں نصیب فرمائے (آمین) چونکہ میرے پاس اُس وقت تک دوشیزہ نے رسائی حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے جب اُس نے یہ خبر دی تو میں بضد ہوگئی کہ رسالہ لے کر آنا چاہیے تھا میں صرف خط پڑھ کر واپس کر دیتی۔ لہٰذا وہ اگلے دن نہ صرف رسالہ لے کر آئی بلکہ دو دن زیر مطالعہ رکھنے کا عندیہ بھی دے دیا۔ میں نے سوچا نیکی اور پوچھ پوچھ میں تو پھولے نہیں سمائی۔ ایک تو ویسے ہی ماشاءاللہ ہوں دوسرے اتنی پیاری دوست کے ساتھ نے خوشی سے اور پھولا دیا ہے تیسرے آپ کی محبت و خلوص نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ یقین جانیں منزہ خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی لیکن اگر آپ اسی حساب سے تعریف کرتی رہیں تو مجھے ڈر ہے کہ وزن دن دوگنی رات چوگنی ترقی نہ کر جائے۔ مذاق برطرف منزہ ذرہ نوازی کا شکریہ، آپ کی نظر شناسی و قدردانی ہے ورنہ بندی کس قابل، آپ کی خواہش اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے شرفِ ملاقات کا ضرور وسیلہ بنائے (آمین)۔ بس آفس کا ایڈریس کنفرم کر دیجیے گا اور فون نمبر بھی تاکہ آنے سے پہلے آپ کی مصروفیت کے پیشِ نظر آپ کو مطلع کر دوں۔ منزہ جی تبصرہ سے پہلے ہی میرا خط اتنا طویل ہو جاتا ہے اس لیے اگر آپ اس میں سے جو سطور حذف کرنا چاہیں آپ کو اختیار ہے۔ تبصرہ رسالے کے لیے ہے باقی سارا خلوص آپ کے لیے ہے۔ کیونکہ آپ کی محبتوں اور قدردانی کا اکاؤنٹ جو میرے دل میں کھل چکا ہے اس میں آپ کے ہر جواب کے ساتھ روز بروز محبتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سکون اور اطمینان کی دولت سے مالا مال فرمائے (آمین)۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف پچھلے مہینے تحریروں میں جو کمی بیشی نظر آئی تھی اس مہینے آپ نے وہ کسر پوری کر دی۔ ہر افسانہ لاجواب' ہر تحریر پختہ متنوع موضوعات کے ساتھ۔ مزہ آگیا منزہ...... الیکٹرانک میڈیا کی بے سروپا خبروں سے مربوط آپ کا اداریہ دل کو چھو گیا۔ آپ کے حرف حرف سے یہ بندی مکمل اتفاق کرتی ہے۔ صبیحہ شاہ کا افسانہ نگہبان امید مختلف موضوع لیے ایک بہترین افسانہ تھا جس میں اندازِ بیان نے موضوع کی اہمیت اور حساسیت کو دوچند کر دیا تھا۔ بہت عمدہ صبیحہ مریم شاہ بخاری کا ناولٹ جب جب دل ملے موضوع کے اعتبار سے اگرچہ روایتی سا تھا۔ لیکن مربوط جملوں اور اندازِ بیاں نے اس کو پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ سنبل کا ناولٹ دردِ دل کے واسطے بھی اصلاحی رنگ لیے نمایاں تھا۔ اُن کی تحریروں کا انداز دھیما اور خوبصورت ہے کسی بھی موضوع کو پورے جذباتی تاثر کے ساتھ پیش کرتے ہوئے واضح مقصد کی ترجمانی کرتی ہیں۔ منزہ ہاشمی کا آسیب بھی اخلاقی پہلوؤں کی ترجمانی کرتا مختلف اندازِ تحریر کے ساتھ اچھی تحریر تھی۔ حبیبہ عمیر کا ناولٹ پلکوں پر ٹھہرے خواب توقع کے عین مطابق اختتام پذیر ہوا لیکن سب پر بازی لے جانے والی تحریر تحسین انجم انصاری کا شجرے ثابت ہوئی بے انتہا موزوں انداز میں فعل و نتیجے کی عکاسی کی ہے۔ کہانی کا انتخاب بھی شاندار اور جملوں کا اُتار چڑھاؤ موضوع کی مناسبت سے کردار کی تمام تر نفسیاتی' جذباتی اور ذہنی پہلوؤں کی بہترین عکاسی کر رہا تھا۔ بہت خوب بہت عمدہ تحسین، اس کے علاوہ دردانہ نوشین خان کا سنہری اوراق بھی

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearl publications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔ جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے.....

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

جذبات نگاری میں عروج پر نظر آیا۔ نیئر شفقت کا ادھورے سپنے، ارم ناز کا جیلہ کار رشتہ اور مہ وش طالب کا فریب محبت، ثمینہ طاہر بٹ کا تاریکی نصیب میرا اور دانیہ آفرین کا کنارے دور نہ تھے بھی موضوع کی خوبصورت عکاسی کرتے ہوئے عمدہ طرزِ تحریر کے افسانے تھے۔ جہاں تک ڈاکٹر اقبال ہاشمانی کے ڈاکٹر بابو بڑے دیالو کا تعلق ہے تو وہ کسی تعریف کے محتاج نہیں وہ تو پہلے سے ہی خوبصورت تحریروں کے گدی نشین ہیں۔ دوشیزہ گلستان بھی اسماء اعوان کی انتھک کاوشوں کا آئینہ دار تھا اور نئے لہجے نئی آوازیں ماشاء اللہ ہمیشہ ہی عمدہ شاعری سے مزین ملتا ہے۔ ابھی ناول پڑھنے سے رہ گئے ہیں۔ لیکن وہ جن مصنفات کی تحریریں ہیں۔ ان کے لیے میں ہمیشہ رطب اللسان ہی رہتی ہوں۔ البتہ کاشی صاحب کی جھلمل جھلمل شام کی خوبصورت عکاسی کا ذکر ضرور کروں گی۔ جس میں آپ، نیلوفر عباسی اور باقی رائٹرز بھی خوشگوار موڈ میں نمایاں نظر آئے۔ مونی خان کا طاہر شاہ سے متعلق فیچر کا مطالعہ بھی کیا۔ طاہر شاہ نے بیک وقت گلوکاری کو مزاح اور اذیت سے دوچار کر دیا ہے۔ فیس بک پر بھی ان پر جو کمنٹس ہوتے ہیں وہ تعریف کی نسبت تنقیدی زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک ناقص سی رائے ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے معیاری رسالے میں اگر جگہ نہ دیں تو اچھا ہے۔ رسالے کی ساکھ کے ساتھ ساتھ ہم جیسوں کا دل بھی ضرور متاثر ہوتا ہے۔ منزہ خط لکھنے کی اتنی جلدی تھی کہ رسالے کے مکمل مطالعے کو ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ خط پوسٹ کر کے انشاء اللہ دوبارہ شروع ہو جاؤں گی۔ ایک نظم ارسال کر رہی ہوں۔ جگہ عنایت فرما دیجیے گا۔ دوشیزہ کے مصنفین، اراکین اور منزہ جی و دوشیزہ کی صحت و ترقی کے لیے دعاگو۔

✍: سویٹ خولہ! شمارہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ذرا شروع کے صفحات پر نظر ڈالو تمہیں وہاں وفتر کا پتہ نظر آئے گا۔ بس چلی آؤ۔ ہمیشہ کی طرح بھرپور تبصرہ تھا۔ یقیناً جن لکھاریوں کی تحریر کو تم نے پسند کیا وہ بہت خوش ہوں گے اور طاہر شاہ بہت دکھی...... تمہارے ذمے ایک کام لگا رہی ہوں۔ ذرا فرح اسلم کو جھنجھوڑتی رہا کرو۔ کاشی اب بہت بہتر ہیں اور بہت خوش ہیں اور شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

✉: یہ ہیں حبیبہ قیصر جو تشریف لائی ہیں لاہور سے، لکھتی ہیں۔ منزہ سہام صاحبہ، تسلیمات! خدائے بزرگ و برتر سے آپ کی خیریت مطلوب ہے۔ عرصہ دراز کے بعد اپنی کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ جلد آپ کے پرچے کے صفحات پر دیکھ پاؤں گی (انشاء اللہ) میں ناراض ہوں بھئی آپ سے، مجھے اپریل کا شمارہ موصول نہیں ہوا اور انتظار میں ہی مہینہ کٹ گیا۔ پلیز ماہ مئی کا شمارہ جلد ارسال کیجیے گا تاکہ تھوڑا بہت ہی پڑھ کر ایک تبصرے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہو سکوں، بہت زیادہ دعاؤں کے ساتھ۔

✍: پیاری سی حبیبہ! اچھے بچے بڑوں سے ناراض نہیں ہوتے اور تم تو ویسے بھی بہت اچھی لڑکی ہو وعدے کی پکی...... مئی کا شمارہ بھجوا دیا تھا تاہم مجھے ضرور مطلع کرنا کہ ملا یا نہیں...... تمہاری تحریر جلد شائع کروں گی اب تو خوش......

✉: اور یہ ہیں ہماری فرح اسلم قریشی جو تشریف لائی ہیں سانول کے شہر کراچی سے، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ، السلام علیکم! یقین مانو کہ یہ وقت اور خیالات کی ملی بھگت ہے کہ مجھے دوشیزہ سے کسی ولن کی طرح دور کر رکھا ہے، کبھی جو لکھنے کی تحریک ملی تو وقت نے چکمہ دے دیا اور جو وقت ہاتھ آیا تو خیالات گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب...... بھلا ہو آپ کی محبت سے بھری آواز کا کہ جس نے دونوں کو گردن سے پکڑ کر میرے حوالے

نیا ناول

پیارے قارئین! ہماری بہت عزیز لکھاری اُم مریم کا ناول ''رحمٰن، رحیم، سدا سائیں'' اپنے اختتامی مراحل طے کر رہا ہے۔ اس ناول کے بعد دوشیزہ کی ہردلعزیز لکھاری زمر نعیم جنہیں ناول لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ ایک بار پھر اپنے قلم سے دوشیزہ قارئین کے لیے ناول کی صورت میں ایک سوغات لیے حاضر ہوں گی۔ امید ہے زمر نعیم کے دیگر شاہکار ناولز کی طرح جلد شائع ہونے والا یہ ناول بھی یقیناً بہنوں سے پذیرائی کی سند حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا۔

کر دیا اور آج بالآخر میں محفل میں شامل ہو ہی گئی۔ تمام اہلیان دوشیزہ کو شاباش کہ اُن کے دم سے محفلیں سجی رہیں اور ہر ان کی تحریروں سے مستفید بھی ہوتے رہے مگر تبصرہ نہ کر سکنے میں وہ ہی امر مانع تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ جانتی ہوں میرا یہ خط دیر سے پہنچے گا اس لیے وقت پر محفل میں شامل نہیں ہو سکتا پھر بھی فرزانہ آغا کے ناول کی تعریف ضرور کروں گی کہ فرزانہ کے قلم کا طلسم دلوں کو اسیر کر لیتا ہے۔ گو کہ فرزانہ آغا سے مواصلاتی رابطہ نہیں مگر فراز سے استوار کیا گیا خود ساختہ رشتہ دعاؤں کی صورت بحال رہتا ہے۔ خدا فراز کو زندگی اور صحت دے (آمین) عقیلہ حق کا شکریہ کہ **Loin's Club** کے ذریعے اچھی ساتھیوں سے ملاقات ہوگئی۔ صبیحہ شاہ اور غزالہ رشید کو بہت عرصے بعد دیکھ کر اچھا لگا، ساتھ میں ہینامت عاصم، سیمار ضا ردا، سارہ غلام نبی اور آپ بھی تو تھیں۔ میری تمام خیر خواہ ساتھی بالخصوص سنبل، رضوانہ کوثر، نزہت جبیں آپ سب کیسی ہیں؟ فریدہ مسرور تو پروڈکشن ہاؤس میں یوں مصروف ہوئیں کہ ہم ان کی تحریروں کے لیے ترس گئے۔ شمع حفیظ کچھ اتا پتہ تو دیں..... آئندہ خط میں انشاء اللہ اوروں کو بھی آواز دینی ہے۔ فی الحال کم لکھے کو زیادہ سمجھیں۔

ج: مصروفیت کے باوجود آپ نے دوشیزہ کے لیے وقت نکالا اور میرا مان رکھا۔ اس کے لیے میں شکر گزار ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ بار بار اس شکریہ کا موقع دیں گی۔ افسانہ جلد شمارے کی زینت بناؤں گی۔ اب محفل میں ہر ماہ انتظار کروں گی آتی رہیے گا۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں ہم سب کی پسندیدہ سنبل، کہتی ہیں۔ ڈیئر منزہ السلام علیکم! اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ یہاں پر سب خیریت ہے۔ اور آپ سب کی خیریت رب کریم سے نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہیں کہ آخر میرے لکھے ہوئے خط کہاں چلے جاتے ہیں چھپتے کیوں نہیں ہیں۔ آخر ڈاکیہ کو میرے ہی خطوط سے کیوں مسئلہ ہے جبکہ میں تاریخ کا بھی بطورِ خاص خیال رکھتی ہوں۔ لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیوں۔ بہرحال اب آتے ہیں محفل کی طرف۔ سب سے پہلے عزیز جی آصاحب کی والدہ کے انتقام کا دلی افسوس ہے۔ اللہ انہیں صبر اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) محترم سلیم اختر کی صاحبزادی کی شادی کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ اللہ جویریہ کو ایک خوشگوار اور خوب صورت زندگی عطا کرے (آمین) شاہدہ ناز قاضی کو ایک عرصے بعد محفل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ رفعت جی آپ کی تدریسی حیثیت کے تو ہم قائل ہیں مشکوک کیسے ہوں گے۔ ڈیئر خولہ مجھے تبصرہ کرنے والوں سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں نے ان کی بات کی تھی جو اپنی گا کر

چلے جاتے ہیں ہم نے افسانہ بھیجا ہے۔ چھاپ دیجیے گا ہم نے شاعری بھیجی ہے چھاپ دیجیے گا اور خط ختم یا اپنی مصروفیات کا احوال لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بتایئے آپ کی مصروفیات سے کسے دلچسپی ہوگی علاوہ آپ کے۔ خولہ جتنا آپ ہمیں مان ومحبت دیتی ہیں یقین کیجیے میرے دل میں بھی اپنے قارئین کے لیے اتنی ہی محبت، احترام و مان ہے خولہ آپ نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں آپ کے تبصرے کو درخور اعتناء نہیں سمجھوں گی یہ ہی تو میرا فیول ہے۔ خواہ تعریف ہو یا تنقید۔ یہی فیول تو مجھے مزید لکھنے پر اکساتا ہے۔ میرے پہلے افسانے سے آج تک میری ہر تحریر پر جو تعریف وتنقید ہوتی ہے۔ وہ میں اپنی ڈائری میں ضرور لکھتی ہوں تبصرہ نگار کے نام کے ساتھ امید ہے تسلی ہوگئی ہوگی۔ صبیحہ شاہ کو ایک عرصے بعد محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔

میکال خوبصورت تو ہے مگر اداکاری میں کورا ہے۔ ماوراء سوبری میں پاکستان سے باہر جاکر اس کا نام خراب کرنے والوں کو پسند نہیں کرتی۔ دام دل بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ وہ ابتی منجھی ہوئی رائٹر ہیں کہ نہ کہانی میں بوجھل پن آنے دیتی ہیں نہ ٹھہراؤ۔ نگہت اعظمی نے ایک بہت اچھے پوائنٹ پر لکھا ہے ہم ایسے ہی بچوں کے ذہنوں سے کھیلتے ہیں۔ رحمن رحیم اب مجھے بور کرتی ہے۔ نزہت جبیں نے بہت اچھا افسانہ لکھا عجلی نے بالکل درست اور بروقت فیصلہ کیا۔ فرزانہ آغا کی تعریف تو گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے لگتا ہے وہ ایک اور ایوارڈ کی مستحق ٹھہری ہیں۔ افسانے کا نام کباڑی کے بجائے کباڑیے کی جورو ہونا چاہیے تھا بہر حال اچھا افسانہ تھا۔ یہ انسانی خواہشات کا کاسہ کبھی نہیں بھرتا۔ بنت حوا نفیسہ اچھا لے کر چل رہی ہیں۔ ماریہ نے بھی حنان کو اچھا سبق دیا مگر ماریہ تم اچھا لکھ سکتی ہو موضوعات پر توجہ دو۔ سباس گل کا ناول اچھا تھا لیکن آخری قسط غیر ضروری طوالت کا شکار تھی۔ روحیلہ کا افسانہ بھی اچھا تھا نسیم کا افسانہ ٹھیک ہی تھا۔ مہتاب خان صاحب یا صاحبہ حالیہ ختم ہوئے ڈرامے گل رعنا سے شدید ترین متاثر نظر آئے ابتداء سے انتہا تک ہیں اینڈ بدل کر انہوں نے ہم پر احسان کردیا۔ پلکوں پر ٹھہرے خواب تو اُلجھی ہی چلی جارہی ہے مگر بور نہیں کرتی ہے۔ اور آخر میں چلتے ہو تو شاپنگ پہ چلیے بطور شوٹ ڈش موجود تھی بہت کمال تحریر تھی۔ دوشیزہ گلستان پھل پھول اور خوشبوؤں سے مہکنے لگا ہے نئے لہجے میں خولہ، ماریہ، فریدہ جی اور ستارہ کی شاعری اچھی تھی اس بار کچن کارنر کی ڈشز اچھی تھیں۔ اب آپ سنائیں کیا حال احوال ہے ہائی ٹی میں آپ نے کہا تھا کہ میرا ناول لگ رہا ہے۔ خوشی خوشی ڈائجسٹ کھولا مگر حسرت ان غنچوں پہ ہے۔ جو بن کھلے مرجھا گئے۔ کیوں آخر کیوں میرے ساتھ ایسا کیوں منزہ...... ہائی ٹی کا احوال بھیجا تھا لگ رہی ہیں ناں! رخسانہ آنٹی کیسی ہیں۔ زین کہاں غائب ہے اب اجازت دیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

✍: جان سے پیاری سنبل! کدھر ہو ہائی ٹی کا احوال ابھی تک تو ملا نہیں تبصرہ بھی اپریل کے شمارے پر کیا ہے مگر میں چھاپ رہی ہوں آخر تمہاری ناراضگی سے بھی تو ڈر لگتا ہے۔ تبصرہ تازہ شمارے پر کیا کرو اور **20** تاریخ تک بھیج دیا کرو پھر کسی کی مجال کہ تمہارا خط شائع نہ کرے۔ تمہاری تعریف اور تنقید لکھاریوں تک پہنچادی ہے۔ امی ٹھیک ہیں اور زین امتحانات میں مصروف...... ناولٹ دیکھ کر یقیناً خوش ہوگئی ہوگی۔ اب مکمل تبصرے کے ساتھ آنا۔

✉: طویل غیر حاضری کے بعد لاہور سے تشریف لائی ہیں نسرین اختر نینا، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ، السلام علیکم!

کیسی ہیں آپ؟ یقیناً بخیریت ہوں گی۔ کافی عرصے بعد آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ اور اُس کی وجہ بھی آپ ہی ہیں۔ جی ہاں، آج میرا کچھ گلے شکوے کرنے کا موڈ ہے۔ پہلے تو چند ماہ تک بھی میری کوئی تحریر شائع نہیں ہوتی تھی یا میں محفل میں شامل نہیں ہوتی تھی تو اکثر آپ کی جانب سے خط موصول ہوتا تھا کہ میں دوشیزہ سے غائب کیوں ہوں جبکہ میرے کم از کم سال میں **6** افسانے دوشیزہ میں شائع ہونے جارہے ہیں اور پھر تحریک ملتی تھی تو فوراً ہی کچھ نا کچھ لکھ کر ارسال کردیتی تھی۔ جو دو تین ماہ کے اندر اندر شائع ہوجاتا تھا مگر اب تو سالوں گزر جاتے ہیں نا آپ کی طرف سے کوئی لیٹر موصول ہوتا ہے اور تحریر بھی کئی کئی سال تک شائع نہیں ہوتی۔ تو پھر ایسے میں بھلا کوئی کیوں اور کیسے لکھے۔ میں نے تقریباً دو سال پہلے ایک قسط وار ناول 'سپنے سہانے' بھیجا تھا۔ ابھی تک مجھے اُس کے انجام ہی سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ پلیز بتادیجیے اگر شائع نہیں کرنا تو کیا مجھے واپس مل سکتا ہے؟ اور اب ایک ناولٹ بھیج رہی ہوں۔ یقیناً یہ جلدی شائع ہوجائے گا۔ کیونکہ دوشیزہ سے وابستگی ایسی ہے کہ کہیں اور لکھنے کو موڈ ہی نہیں بنتا۔ پہلے دوشیزہ باقاعدگی سے ملتا تھا۔ اب وہ بھی کئی سالوں سے نہیں بھیج رہے۔

ﷺ: نسرین آپ کا شکوہ بجا 'سپنے سہانے' میرے پاس ہے۔ جلد ہی دوشیزہ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگا۔ ناولٹ مل گیا ہے انشاء اللہ پڑھ کر بتاؤں گی۔ مجھے اپنا پتہ کنفرم کردیجیے انشاء اللہ دوشیزہ پابندی سے ملتا رہے گا۔ اچھا اب جلدی سے ہنس دیں اور لڑائی ختم......

✉ اور یہ ننھا منھا سا خط لکھا ہے مومنہ علی نے جو تشریف لائی ہیں لاہور سے، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ، السلام علیکم! منزہ جی کیسی ہیں آپ؟ امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ ماہ مئی کے شمارے میں دوشیزہ کی جانوں (آپ اور دیگر مصنفین) کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ سب ہی بہت پیارے اور خوش باش لگ رہے تھے ماشاءاللہ، رفعت سراج کا تو نام ہی کافی ہے تعریف کی میں کیا جرأت کروں؟ حبیبہ عبیر بھی عمدہ لکھ رہی ہیں۔ درد دل کے واسطے بھی بہت اچھا لگا۔ افسانے بھی سب ہی کمال کے تھے، خصوصاً ماہ وش طالب کا فریب محبت، طرز تحریر اور مکالمے زبردست تھے۔ آسیب اور تاریکی میرا نصیب بھی دلکش لگے۔ دوشیزہ گلستان اور نئے لہجے نئی آوازیں کے سلسلے میں نہایت خوبصورت ہیں۔

ﷺ: مومنہ! تمہیں ماہ وش کا افسانہ سب سے اچھا لگا یقیناً یہ جان کر ماہ وش کو بہت خوشی ہوگی ایک رائٹر کے لیے اس کی تحریر کی تعریف بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم پابندی سے محفل میں شرکت کیا کرو گی۔

✉ لاہور ہی سے تشریف لائی ہیں ماہ وش طالب، لکھتی ہیں۔ منزہ آپی اپنا پہلا ناول آپ کے ڈائجسٹس کے لیے تحریر کرکے بھیج رہی ہوں۔ کمپوزنگ کا خیال رکھیے گا۔ ویسے مجھے بہت افسوس ہوا، جب میں نے آپ سے آپ کے فون نمبر مانگا، تو آپ نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کردیا کہ موبائل آپ کے پاس نہیں ہوتا۔ خیر! ہر کسی کے یقیناً اپنے تحفظات ہوتے ہیں۔ آپ کو بات کرنا پسند نہیں۔ آپ کی مرضی، بہت بڑا دل کرکے میں ناول تحریر کرکے بھیج رہی ہوں۔ دوسرے بہت سے ڈائجسٹوں میں بھی میری تحریریں منتخب ہوچکی ہیں۔ البتہ دوشیزہ سے جو رشتہ قائم ہوچکا ہے۔ وہ چاہ کر بھی نہیں ختم کرسکتی۔

ﷺ: ماہ وش! تمہارا ناولٹ مل گیا کافی پڑھ بھی لیا ہے۔ مگر مجھے لگ رہا ہے جیسے تم نے بہت جلدی جلدی میں

ہم شکل جیسے عظیم ناول کے بعد
ایم اے راحت کا ایک اور معرکتہ الآراء شاہ کار
"زرد لومڑی"
دہکتے ہوئے رخسار، چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں،
دلکش تراش کے بولتے ہوئے خاموش ہونٹ کچھ کہتے ہوئے،
شاخ نازک جیسے لچکتے ہوئے بدن والی حسینہ لیکن لومڑی سے زیادہ چالاک
جس کے نشانے پر آئے ہوئے دشمن اپنی موت یقین کر لیتے تھے
"زرد لومڑی"
جس کے نام سے بڑے بڑے جیالے کانپ اُٹھتے تھے
ایک انوکھے اِنتقام کی کہانی جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا
انتقام کی ایک ایسی لازوال داستان جسے قارئین کبھی نہ بھلا پائیں گے
ماہ مئی سے "سچی کہانیاں" کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

لکھا ہے۔ کچھ کہانی کا سا انداز ہے بہرحال فرصت ملتے ہی دوبارہ پڑھوں گی پھر تمہیں بتاؤں گی..... دوشیزہ کو دوشیزہ سے ہی جڑا رہنا چاہیے۔ اچھے بچے لڑتے نہیں ہیں۔ چلو جلدی سے دوستی کرلو۔

✉: ڈسکہ سے آمد ہوئی ہے نسیم سکینہ صدف کی، لکھتی ہیں۔ منزہ ڈھیروں خوشیاں آپ کی قدم بوسی کریں (آمین) سیاہ بادلوں نیلا گگن ڈھک گیا تو میرے دروازے پر دستک ہوئی اور دوشیزہ میرے ہاتھ میں آیا تو پکوڑے اور کیچپ چھوڑ کر میں نے منزہ جی کے آدھے، ادھورے سے دوشیزہ کا اسٹارٹ لیا۔ آپ کی اس بات کی میں بھی حامی ہوں کہ لوگوں کی ذاتی زندگی کو قبیح انداز میں ٹی وی اسکرین پر لاکر اُن کا تماشا بنانا انتہائی نامناسب بات ہے۔ کسی فرد کی بھی ذاتیات کو الیکٹرونک میڈیا پر اچھالنا بالکل ٹھیک بات نہیں۔ منزہ جی ویل ڈن بہت کمال لکھا۔ خدا آپ کو مزید بلندیوں پر پہنچائے اور آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو زندگی کی سچی خوشیاں نصیب فرمائے۔ پکوڑوں کے ساتھ کولڈ ڈرنک کے گھونٹ بھرتے ساتھ میں سہانے موسم کے جلوے دیکھتے ہوئے دوشیزہ کی محفل میں داخل ہوئی تو وہاں رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ (اتنی گرمی ہونے کے باوجود کراچی میں) بڑی رونقیں بکھر رہی تھیں اور منزہ جی بہنوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی سب کو فرداً فرداً جواب دے رہی تھیں۔ پیاری خولہ عرفان بہت ڈیسینٹ پرسنالٹی کی مالک رضوانہ کوثر جی، روبینہ شاہین جی میرے افسانے پر اپنی رائے دینے کا شکریہ۔ لو جی اب چھما چھم بارش کے تواتر سے برسنے کے ساتھ کاشی کی جھلمل جھلمل شام میں پہنچ گئے۔ ارے واہ یہاں تو بہت سویٹ سی منزہ جی کے ساتھ خلوص کا پیکر شگفتہ شفق بھی موجود ہیں۔ اور سونی سی رضوانہ پرنس بھی...... بارش ذرا تھمی تو رفعت سراج کے ناول نے اطراف سے بے خبر کردیا۔ دردانہ نوشین کے سنہری اوراق، تحسین انجم انصاری کے شجرے منزہ ہاشمی کے آسیب تک پہنچی تو شام ہوگئی۔ ٹھنڈی ہوا میں سرگرداں رہیں اور اب مجھے کچن میں جانا ہے ابھی اتنا ہی پڑھ پائی ہوں۔ حرف حرف دلکشی پائی۔ منزہ جی ہمارے دوشیزہ کا معیار تو دن بدن بہت ہی بلند ہوتا جارہا ہے۔ اب اجازت۔

ھ: ڈیئر نسیم! آپ کے پکوڑوں کی اشتہا انگیز خوشبو نے تو مجھے بے چین کردیا۔ دوشیزہ کی محفل مکمل کرتے ہی گھر جاؤں گی اور اس آگ برساتے سورج کو مکمل نولفٹ کرتے ہوئے، پکوڑے بنوا کر کھاؤں گی اور تصور میں سامنے لگے درختوں کو بارش میں بھیگتا محسوس کرلوں گی۔ دوشیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ خوش رہیے۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے فرح انیس کی، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! امید ہے آپ اور تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ مئی کے شمارے پر کیا تبصرہ کروں۔ یہاں کافی لیٹ ملتا ہے۔ عید کے بعد میرے ایگزامز ہیں۔ انشاء اللہ ایگزامز کے بعد محفل میں حاضر ہوں گی۔ آپ سے پوچھنا تھا میری کہانی 'آگاہی' کب لگے گی۔ اور میری تحریر 'پیکیج' کیا قابلِ اشاعت ہے؟ میں نے دو بار کال بھی کی تھی۔ مجھے جواب ملا کہ بتادیں گے۔ پلیز مجھے بتادیجیے گا۔ میں نے اور تحریریں بھی بھیجنی ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

ھ: اچھی سی فرح! تمہاری دونوں کہانیاں قابل اشاعت ہیں۔ اور جلد شائع ہوں گی۔ اب تم اپنے امتحانوں پر توجہ دو۔ فرصت ہوجائے پھر اچھی سی کہانی لکھنا اور ارسال کردینا۔ خط اور تبصرہ اگر **20** تاریخ تک بھی بھیجو گی تو شائع ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی پوچھنا ہو تو میرے آفس نمبر پر کال کرلیا کرو (ڈائریکٹ والا) اچھا ہے تم سے بات بھی ہوجائے گی۔ جیتی رہو۔

✉: اور جناب یہ ہیں ہماری حبیبہ عمیر، کہتی ہیں۔ منزہ جی آداب! خدائے بزرگو برتر سے آپ سب کی خیریت مطلوب ہے۔ آپ نے محبت سے بلایا تو لیجیے میں پھر سے حاضر خدمت ہوں اپنی تمام تر مصروفیت کے باوجود۔ بس یہ آپ کی محبت ہی ہے، جو ہم سب آپکی محفل میں حاضر ہوتے ہیں۔ گرمی اپنے جوبن پر ہے اور ہمارا براحال کیا ہوا ہے اوپر سے رمضان کی آمد آمد ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ ماہ مبارک ملک پاکستان کے لیے خیرو عافیت اور امن و امان والا ہو۔ (آمین) اب بات ہو جائے اس ماہ کے پرچے پہ تو جناب والا اس ماہ کا پرچہ میرے ہاتھ میں ہے، ٹائٹل پر دوشیزہ جی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اب اندر چلیں، پرچے میں قوس وقزاح کے رنگ اس بار بھی بکھرے ہیں۔ اپنی کہانی کا اختتام دیکھا، جس کی خوشی ہے کہ مکمل ہوا آپ نے اتنے سالوں بعد جگہ دی اس کے لیے ایک بار پھر مشکور ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ میری کہانی آپ کو موصول ہو گئی ہو گی جسے جلد دیکھنے کی امید ہے آپ کے پرچے میں (انشاءاللہ) اس ماہ کا پرچہ بھی مصروفیت کے باعث زیادہ نہیں پڑھ پائی مگر جتنا پڑھ سکی اتنا اچھا لگا خاص کر ہائیٹی والا حصہ بڑے مزے کا تھا جس میں بہت سی سینئر رائٹرز کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ آخر میں ملک پاکستان کے لیے دعا اللہ پاک اسے ہر قسم کی بلاؤں سے محفوظ رکھے (آمین)

ﷺ: حبیبہ! تمہارا برقی محبت نامہ ملا وہ بھی بالکل آخری لمحوں میں...... تمہاری تحریر موصول ہو گئی ہے۔ تمہارا محفل میں آنا بہت اچھا لگا۔ آخر میں کی گئی تمہاری دعا پر ہم سب ''آمین'' کہتے ہیں۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں شگفتہ شگفتہ شفیق، لکھتی ہیں۔ میری اچھی منزہ سہام جی، السلام علیکم! خط کچھ لیٹ ہو گیا...... وجہ مختصری ہے یعنی طبیعت کی خرابی...... الحمدللہ اب اچھی ہوں۔ امید ہے کہ میرے سارے پیارے دوست بھی ہمارے ساتھ گرمی اور لوڈ شیڈنگ کو انجوائے کر رہے ہوں گے۔ اس بار اداریہ کا ہر لفظ کاٹ دار اور حقیقت پر مبنی تھا، واقعی یہ ادھورا پن اذیت ناک رہتا ہے۔ مئی ۲۰۱۶ کے افسانوں میں تازگی اور سچائی کا پہلو نظر آیا۔ حبیبہ شاہ، دردانہ نوشین خان، سنبل کے ساتھ ماہ وش طالب اور ارم ناز نے بھی بہت اچھا لکھا۔ کاشی چوہان لائے جھلمل جھلمل شام،، واقعی ایسی ہی تھی وہ سہانی شام۔ میری یادوں کی محفل میں ویسے ہی جگمگا رہی ہے ایک شکوہ ہے کہ تصاویر رنگین کیوں نہیں لگائیں۔ محفل میں سب کے خطوط پڑھ کے بہت اچھا لگا پر نسیم آمنہ کا خط بہت اچھا لگا اور سعدیہ سیٹھی کا خط دیکھ کر مسرت ہوئی اور لندن کا وہ خوبصورت دن نگاہوں میں گھوم گیا۔ جب وہ اپنی عزیز دوست ہما اشرف کے ساتھ مجھ سے ملنے کنزل کے گھر آئی تھیں اور ہم نے بہت سارا وقت ہنستے مسکراتے گذارا تھا اور اپنی کوکنگ کی تعریفیں وصول کی تھیں بہت اچھا رہا تھا۔ انشاءاللہ اگلی بار کچھ نہ کچھ خط کے ساتھ ضرور ہو گا اب اجازت دو پری...... اللہ حافظ۔

ﷺ: ڈیئر شگفتہ! بس محفل کا اختتام لکھ رہی تھی جب آپ کا برقی خط ملا۔ کس کی نظر لگ گئی جو طبیعت خراب ہو گئی۔ چھوڑیں سب بس جلدی سے فٹ فاٹ ہو جائیں۔ آپ بستر پر لیٹی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ سعدیہ بھی بہت عرصے بعد محفل میں شریک ہوئی ہیں۔ امید کرتی ہوں کہ اب پابندی سے آتی رہیں گی۔ اور مجھے ابھی سے آپ کے اگلے خط کا انتظار ہے۔

تو جناب اس خط کے ساتھ دوشیزہ کی محفل اپنے اختتام کو پہنچی آج یعنی 21 مئی تک موصول ہونے والے تمام خطوط شامل اشاعت ہیں۔ مجھے آپ کی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اجازت دیجیے۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہو گی انشاءاللہ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

عشنا شاہ

چنچل اداکارہ

مونی خان

عشنا شاہ مشہور اداکارہ ارسا غزل کی چھوٹی بہن ہیں۔ اُن کی پیدائش کینیڈا کی ہے۔ پہلا ڈرامہ 'خود غرض' کیا اس کے بعد ایک طویل فہرست ہے۔ جن میں چند مشہور ڈرامے یہ ہیں۔ 'بشر مومن' 'آگ' 'ہم تیرے گناہ گار' 'میرے جینے کی وجہ' رخسار' 'دعا' 'تھوڑا سا آسمان' 'بھیگی پلکیں' 'اب کر مری رفوگری' 'پیا من بھائے' اور ایک زیر تکمیل فلم افراتفری شامل ہے۔ بچپن میں عشنا نے ریڈیو سے ابتداء کی تھیٹر بھی کیا۔ اگر کسی سینئر اداکار کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے تو محمد قوی خان کی بہت بڑی فین ہیں ۔ اُن کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہیں۔ عشنا نے یارک یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے۔ میوزک سننا بہت پسند ہے۔ اپنے کام سے بہت محبت کرتی ہیں۔ فلمیں دیکھ کر محسوس کرتی ہیں کہ جیسے یہ کوئی جادوئی دنیا ہو۔ عشنا بہت خوش شکل اور

اسمارٹ اداکارہ
ہیں۔ تاریخ
پیدائش
29
جنوری 1984ء ہے۔ یوں ستارہ زحل کے
زیرِ اثر ہیں۔ قد 5 فٹ 6 انچ ہے۔ مشکل
رول کرنا اچھا لگتا ہے۔ سب سے زیادہ

مشکل ڈرامہ 'آگ' کے دوران پیش
آئی جب لگاتار 3 ماہ گاؤں میں شوٹنگ
کی۔ مستقل پیٹ خراب رہے اور زبان سمجھنے
میں بہت دشواری آئی۔
عشنا کی خبریں سوشل میڈیا پر بہت گرم رہتی
ہیں۔ سنا ہے کہ پروڈیوسر ندیم بیگ کی
پارٹی میں ہمایوں سعید کی بیوی نے
ہمایوں اور عشنا کو ساتھ دیکھ
کر خوب مارا۔ ہمایوں
تو وہاں سے بھاگ
کھڑے ہوئے مگر
عشنا پھنس گئیں۔
شاید یہی وجہ ہے
کہ اب عشنا
ہمایوں سعید کے
پروڈکشن ہاؤس
کے تحت بننے
والے کسی بھی
ڈرامے میں کام
نہیں کرتی ہیں۔
☆☆☆

عدیل حسین

R.J، اداکار اور پروڈیوسر

ذیشان فراز

س: شوبز میں آمد کب ہوئی؟

جواب: میں نے ابتدا ریڈیو سے کی تھی 90 میں، بطور RJ شو ہوسٹ کیے، یہ تجربہ میرے لیے بہت بہترین تھا۔ ریڈیو آپ کو بہت سکھاتا ہے، تلفظ، آواز کا اُتار چڑھاؤ یہ سب ایکٹنگ کے لیے بہت ضروری ہے اور میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ریڈیو پر بہت اچھے ٹیچرز ملے۔

س: آپ نے زیبا بختیار کی فلم میں بھی کام کیا، کیسا تجربہ رہا؟

جواب: جی زیبا جی کی ٹیلی فلم 'دنیا گول ہے' کی، بہت مزہ آیا، سیکھنے کو بھی ملا زیبا جی کام کروانا جانتی ہیں۔

س: شہرت کس ڈرامے سے ملی؟

جواب: مہرین جبار کا پلے تھا 'دام' جس میں کام کرنے کے بعد لوگ مجھے پہچاننے لگے کہیں پبلک پلیس پر لوگ دیکھ کر قریب آتے تھے اور میرے کردار کے بارے میں بات کرتے تھے وہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔

س: اچھا عدیل یہ بتائیں سب سے زیادہ مشکل کس کردار کو نبھانے میں آئی؟

جواب: (ہنستے ہوئے) سب سے زیادہ مشکل مجھے متاع جان میں اپنا کردار نبھانے میں

آئی...... ایک ایسا شخص جو بہت مشکل پسند اور Complex شخصیت رکھتا تھا۔ میں نے کردار کے بارے میں پڑھ کر بہت زیادہ ریسرچ کی ایسے لوگوں کو قریب سے جاننے کی کوشش کی مگر سچ

ہے، بہت مشکل پیش آئی تھی۔

س: آپ نے شوبز جوائن کیا گھر والوں کا کیا ری ایکشن تھا؟

جواب: میرے گھر والوں کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا کیونکہ کوئی بھی مجھ سے پہلے اس طرف نہیں آیا تھا اور پھر ان کے نزدیک یہ شوق تو ہوسکتا ہے مگر کیریئر نہیں لہٰذا مجھے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

س: آپ نے بے شمار اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا سب سے اچھی کون لگتی ہیں؟

جواب: دیکھیے ویسے تو سب بہت اچھی ہیں مگر مجھے آمنہ شیخ بہت پسند ہیں وہ سیٹ پر بھی بہت ہلا گلا کرتی ہیں اور بہت Comfort Zone میں رکھ کر کام کرتی ہیں۔ نئے آرٹسٹ کو بہت اعتماد ملتا ہے ان کے رویے سے اور میرے نزدیک یہ بہت بڑی خوبی ہے۔

س: آج کل ہر جانب سوشل میڈیا کا چرچا ہے آپ کی کیا رائے ہے اس بارے میں؟

جواب: سوشل میڈیا اچھا Medium ہے بس صرف ایک مسئلہ ہے کہ پرائیویسی نہیں رہتی آپ چاہیں بھی تو بھی کچھ چھپایا نہیں جاسکتا۔

س: آپ نے ایک کمپنی بھی بنائی ہے اس کے بارے میں بتائیں؟

جواب: جی Vizor کے نام سے Creative کمپنی بنائی ہے جس کے تحت کئی کمرشلز بھی بنائے ہیں، میوزک ویڈیوز بھی آج کل کراچی فٹبال لیگ پر ڈاکومنٹری فلم بنا رہا ہوں۔

س: آپ کا اسٹار کیا ہے؟

جواب: میری تاریخ پیدائش 30 جون 1978ء ہے اس حساب سے میں Cancer ہوا۔

س: پسندیدہ ریسٹورنٹ کون سا ہے؟

جواب: مجھے ویسے بہت زیادہ باہر کا کھانا پسند نہیں ہے مگر Fuscia کا کھانا اچھا لگتا ہے لہٰذا اکثر جا کر کھاتا ہوں۔

س: لوگوں کے کون سے رویے بہت برے

لگتے ہیں؟

جواب: کچھ لوگ بلاوجہ جھوٹ بولتے ہیں مجھے ایسے لوگ اور ایسی حرکتیں بہت بری لگتی ہیں جب کوئی مجھ سے جھوٹ بولتا ہے تو پتہ تو چل ہی جاتا ہے ایسے میں، میں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھے بہت Dumb سمجھ کر جھوٹ بولا گیا تب بہت غصہ آتا ہے۔

س: کیسے لوگوں کی کمپنی Aviod کرتے ہیں؟

جواب: مجھے Selfish اور Rude لوگ بہت Irritate کرتے ہیں میں ایک دفعہ کے بعد پھر ایسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

س: اگر آپ کو موقع ملے تو محبت اور پیسے میں سے کس کا انتخاب کریں گے؟

جواب: دونوں کا کیونکہ دونوں بہت ضروری ہیں کسی ایک کو بھی مس کر کے زندگی گزارنا کافی مشکل ہے۔

س: آپ نے اب تک شادی نہیں کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: بالکل بہت خاص وجہ ہے میرے لیے سب سے اہم ہے پارٹنر کا مخلص ہونا، شکل اسٹائل اہمیت نہیں رکھتے لیکن مجھے ابھی تک کوئی ایسا انسان نہیں ملا جو بہت مخلص ہے۔ بالکل Pure ہو مجھے بناوٹ اور بلاوجہ کی جھوٹی شان و شوکت مرعوب نہیں کرتی۔

س: دوستوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں؟

جواب: ضرور! مجھے دوستوں کے ساتھ ٹائم گزارنا اچھا لگتا ہے ویسے تو فرصت نہیں ملتی لیکن جب تھوڑا سا بھی وقت مل جاتا ہے تو ہم دوست جمع ہو جاتے ہیں اور خوب انجوائے کرتے ہیں۔ وہ لوگ مجھے Addie کہتے ہیں عدیل سے تو شوبز کے لوگ پہچانتے ہیں۔

س: ہومن جہاں کا تجربہ کیسا رہا؟

جواب: بہت اچھا اسکرپٹ اور بہت ذہین Co-Staes کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا بہت مزہ آیا پھر پبلک کے رسپانس نے اور مطمئن کر دیا۔

س: گھر جا کر سب سے پہلے کس کو دیکھنا پسند کرتے ہیں؟

جواب: میری دو Pet بلیاں ہیں جن سے مجھے بہت پیار ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں انہیں ڈھونڈتا ہوں اور وہ بھی میری آواز سن کر فوراً کمرے سے نکل کر میرے پاس آجاتی ہیں۔

س: لوگ کہتے ہیں کہ آپ Work Holic ہیں یہ سچ ہے؟

جواب: I Dont Know لیکن مجھے وقت ضائع کرنا بہت برا لگتا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کام کروں اور کم سے کم آرام۔

س: عدیل اب اپنے چاہنے والوں کے لیے کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: بس یہی کہ میں اُن کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے دیکھتے ہیں، پسند کرتے ہیں، اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے مجھے اپنی غلطیاں ٹھیک کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں یقیناً بہت لکی ہوں کہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔

یوں یہ ملاقات تمام ہوئی۔ عدیل حسین نہایت سلجھے ہوئے آرٹسٹ ہیں جو اپنے کام سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہماری یہ ملاقات بھی بہت اچھی رہی، اگلے ماہ کسی اور ستارے کے ساتھ حاضری لگائیں گے۔

☆☆......☆☆

وہ میری یاد کے جگنو

پیارے قارئین!

☆......یقیناً آپ اپنے پسندیدہ لکھاریوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

☆......ان کی پسند، ناپسند...... ان کی زندگی کے یادگار پل، غرض وہ سب سوال جو اکثر آپ کے ذہن میں اٹھتے ہوں گے۔

تو پھر تھوڑا سا انتظار......

بہت جلد...... آپ کے اپنے دوشیزہ میں، آپ کے پسندیدہ لکھاری' آپ کے درمیان ہوں گے۔

اور

سلسلہ ہے

"وہ میری یاد کے جگنو......"

لائنز کلب کے زیرِ اہتمام

ایک شام دوستی کے نام

عقیلہ حق

آج کل علم وادب سے لگاؤ رکھنے والے لوگ بہت خوش ہیں اور ملنا ملانا بھی ہو رہا ہے اور سبب ہیں لیجنڈ اداکارہ، براڈکاسٹر محترمہ نیلوفر عباسی صاحبہ جو آج کل نیویارک سے پاکستان تشریف لائی ہوئی ہیں۔ Lions International Club کی Lions BroadCaster Branch کا تعلق کیونکہ ہے ہی Broad Casting کے شعبے سے سو ہم نے بھی ایک شام نیلوفر عباسی صاحبہ کے ساتھ منانے کا اہتمام کیا، کلب کی جنرل سیکریٹری محترمہ غزالہ رشید نے اس تقریب کو 'ایک شام دوستی کے نام' کا نام دیا۔ اس تقریب کا اہتمام Village Salt & Paper سی ویو پر کیا گیا، تقریب کی چیف گیسٹ محترمہ نیلوفر عباسی تھیں، گیسٹ آف آنر جناب سلطان

> محترمہ منزہ سہام صاحبہ جو کہ گیسٹ آف آنر تھیں، آپ کو کلب کی طرف سے نیلوفر صاحبہ کے ہاتھوں پھول پیش کیے گئے۔ لائنز کلب کی روایت کے مطابق پروگرام اپنے وقت پر شروع ہوا۔ صدر عقیلہ حق نے مہمان خصوصی اور دیگر مہمانانِ گرامی کی آمد پر شکریہ ادا کیا جنرل سیکریٹری محترمہ غزالہ رشید صاحبہ نے تقریب کے مقاصد کو اپنے خوبصورت لہجے اور لفظوں سے سجایا اور پھر چائے کے ساتھ ساتھ نیلوفر عباسی صاحبہ سے سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ نیلوفر عباسی بہت رواداری، اور بااخلاق خاتون ہیں۔ ''نہیں'' کا لفظ اُن کی ڈکشنری میں نہیں ہے۔

مسعود صاحب P.C.C.I اور محترمہ منزہ سہام صاحبہ اور محترمہ عذرا رسول صاحبہ تھیں۔ کلب ممبرز محترمہ صبیحہ شاہ صاحبہ، نورالعین صاحبہ، عمیرہ صاحبہ،

روایت کے مطابق پروگرام اپنے وقت پر شروع ہوا۔ صدر عقیلہ حق نے مہمان خصوصی اور دیگر مہمانانِ گرامی کی آمد پر شکریہ ادا کیا جنرل

لائن براڈ کاسٹر کلب کی جانب سے مدیراعلیٰ دوشیزہ محترمہ منزہ سہام صاحبہ کو نیلوفر عباسی صاحبہ کے ہاتھوں پھول پیش کیے گئے

نزہت، فرحت جمال صاحبہ، جویریہ جمال صاحبہ، فیصل اور دیگر ممبرز کے ساتھ، امریکہ سے آئی ہماری بہت پیاری دوست بازغہ صاحبہ بھی شریک

سیکریٹری محترمہ غزالہ رشید صاحبہ نے تقریب کے مقاصد کو اپنے خوبصورت لہجے اور لفظوں سے سجایا اور پھر چائے کے ساتھ ساتھ نیلوفر عباسی صاحبہ

لائن براڈ کاسٹر کلب کے ممبران، خوبصورت پل، خوبصورت تصویر

تھیں۔ تو ساتھ ساتھ خوبصورت مسکراہٹ والی شائستہ فرحان بھی موجود تھیں، لائنز کلب کی

سے سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ نیلوفر صاحبہ دھیمے لہجے اور خوبصورت مسکراہٹ کے

والی ایک بہت نفیس اور سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ جن کے لہجے اور لفظوں اور سوچ کی گہرائی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ رضوانہ پرنس ہنستی کھلکھلاتی میرے ساتھ گئی تھیں۔ منزہ سہام انتہائی سادہ لباس میں بے انتہا پُروقار لگ رہی تھیں، اور منزہ کو دیکھ کر پہلا خیال یہ آتا ہے ناحق تیار ہونے میں اتنا وقت صرف کیا۔ ماند تو ہمیں پڑ ہی جانا تھا۔ لیکن ہمت مرداں مددِ خدا...... واقعی ساتھیوں یہ کہنے کی بات نہیں۔ منزہ کے آگے کم از کم میں تو ماند پڑ جاتی ہوں۔ اب آپ لوگ کہیں گے بہن تم کون سی چاند کا ٹکڑا ہو۔ ہوں تو نہیں...... لیکن سمجھنے میں کیا جا رہا ہے؟''

تقریب میں صبیحہ شاہ، غزالہ رشید، سنبل، شگفتہ شفیق، سکینہ فرخ، نسیم آمنہ عابدہ رؤف، رفعت سراج، رضوانہ پرنس، سیمارضا ارے ہاں بہت پیاری سی محبت کرنے والی سیما مناف بھی شریک تھیں اور شائستہ بھی شریک تھیں، منزہ کے دونوں صاحبزادے، حمیرا راحت ان کی صاحبزادی اور رفعت سراج صاحبہ اپنے بہت پیارے بچوں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہی تھیں۔

بہت عرصے کے بعد گپ کا رس پیا، بہت مزہ آیا۔ چائے کے ساتھ گفتگو اور ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری تھا۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ تصویریں بھی بنوا رہے تھے اور گرما گرم کبابوں سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ میں رفعت سراج صاحبہ کے ساتھ بیٹھی تھی اور اُن سے باتیں کرنے میں مجھے بہت مزہ آتا ہے اور پھر میں منزہ اور رضوانہ پرنس مستقل اس کوشش میں لگے رہے کہ ہر اُس جگہ کھڑے ہو جائیں جہاں تصویر میں کچھ نہیں تو آنچل ہی لہراتا نظر آ جائے۔ خیر یہ سب تو دل لگی تھی ورنہ حقیقت میں تقریب بہت پُروقار تھی۔

نیلوفر صاحبہ نے اپنے ٹھہرے دھیمے اور متاثر کن لہجے میں بہت ساری یادیں شیئر کیں جن کو سننا بہت اچھا لگا۔

میں نے نیلوفر عباسی صاحبہ کی گفتگو سننے کے بعد ایک بات کہی کہ میں اپنے بچوں سے کہتی ہوں کہ ایک دن سب کو چلے جانا ہے ایک دن میں بھی چلی جاؤں گی اور جب کوئی تم سے پوچھے کہ تمہاری ماں کون تھی تو تم میری کتابیں، میری تحریریں دکھا کر کہنا یہ ہماری امی تھیں...... اُس پر کسی نے جملہ کسا اور جو کتابیں نہ ہوئیں تو بچے کیا دکھائیں گے۔

تو میں نے کہا۔ میری بہن تم ایک ساڑھی چھوڑ جانا...... بچے اُسی کو دکھا دیں گے۔

تقریب کا اختتام خوشگوار ماحول میں گروپ تصویر پر ختم ہوا۔ لیکن گروپ تصویر نہ جانے کتنے کیمروں میں اور کتنی بنیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب میں واپس لوٹی تو بہت دنوں بعد میرا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا، یقیناً وہاں شریک ہر رائٹر ایسے ہی تاثرات لے کر اپنے گھر گئی ہوں گی۔ میں ایک دفعہ پھر منزہ سہام صاحبہ کا شکریہ ادا کروں گی کہ اُن کی وجہ سے ہم رائٹر نے ایک ساتھ کچھ وقت بہت خوشگوار گزارا اور امید کرتی ہوں وہ ہر ماہ دو ماہ میں اس طرح کی تقریبات کرتی رہیں گی۔

تو ساتھیوں پھر فیس بک کی طرح پہلے لائک کرو اور پھر Comments میں ''آمین'' لکھ کر Share کریں۔ کم از کم 1000 آمین تو ہونے چاہئیں نا...... ایک اور Hi-Tea کی منتظر والسلام آپ کی اپنی عقیلہ حق......

☆☆......☆☆

لائف بوائے... یقین، محبت جگائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

گو بات اتنی بڑی تو نہ تھی جتنی کر لی گئی تھی مگر کیا کیا جائے کہ ہمیشہ رائی کا ہی پہاڑ بنتا ہے۔ سحر جانتی تھی کہ عباد طبیعت کا شروع سے لاپروا، شوخ اور دل پھینک ٹائپ مرد ہے مگر۔

وہ جلدی جلدی اپنے کپڑے جہازی سائز بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔ غصہ اتنا تھا کہ جیسے سب کچھ بھسم کر دے گی۔

''پہلے سوچ لو اچھی طرح' اس کے بعد کوئی قدم اٹھانا۔'' باجی بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑیں۔

''بس باجی بیگم' میں روز روز کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی' میری برداشت کی حد جواب دے چکی ہے۔'' آنسو آپ ہی آپ رخسار بھگونے لگے تھے۔

''ارے میاں تو لاکھ عیب کرتے پھرتے ہیں' ایسا کیا کر دیا عباد نے؟'' بھائی کی محبت میں کیسے نہ بولتیں۔

''یعنی کہ میں اب آپ کو سب کچھ بتا کر پھر سے اپنا دکھڑا بیان کروں، پھر سے اپنی جمع کی ہوئی ہمتیں کھو دوں؟''

اس کے ہاتھ رک گئے اور آنکھیں یک ٹک باجی بیگم کو دیکھنے لگیں۔

''دیکھو نہ تم غیر ہو نہ وہ کہیں اور سے آیا ہوا ہے۔ میں تم دونوں کو خوب سمجھتی ہوں' تم کو پسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تم معاملہ فہم ہو اور بی بی سب سے اہم وجہ تو تم بھی خوب جانتی ہو۔

تمہارے لائف بوائے شیمپو نے جانے کیا جادو کیا کہ تمہارے ریشمی بالوں سے ہی وہ بندھ گیا اور تمہاری عباد سے متعلق شکایت جائز ہے۔

تم غلط نہیں ہو مگر یہ بتاؤ' اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے یا نہیں؟''

باجی بیگم نے جیسے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

''محبت......''

وہ بھلا کیسے جھوٹ بولتی؟ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ان پانچ ماہ میں عباد نے جی بھر کر اس پر

محبت لٹاتی تھی۔ وہ تو خود پر رشک کرتی تھی کہ اسے اتنا... لگتا۔

چاہنے والا ہم سفر ملا ہے' کتنا خیال رکھتا ہے وہ اس کا مگر عورت جس سے محبت کرتی ہے' اس کی مکمل توجہ چاہتی ہے' وہ ہر ہر طرح سے اسے صرف اپنا دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے۔

نکاح کے تین بول بلا شرکت غیرے انسے اس کا کل اثاثہ بنا دیتے ہیں۔ پرائی ہوا کے چھونے پر بھی بیوی شاکی ہو جاتی ہے اور وہ کوئی پرائی ہوا نہیں بلکہ جیتی جاگتی خوبصورت ماہ لقائیں ہوتی تھیں۔

اس کے لیے اس وقت زمین میں گڑ جانے کا موقع ہوتا تھا جب بھی وہ بالکل دو سے ایک ہو کر کسی تفریحی مقام یا کسی فوڈ پوائنٹ پر جاتے تھے اور عباد..... اس کی نظروں کی پروا کیے بغیر' خوبصورت چہروں کے پیچھے پیچھے تعاقب کرتی اس کی نظریں۔

کتنی ہی بار وہ روٹھ کر اٹھ جاتی' چلنے لگتی' سانسوں کی گھٹن' دھڑ دھڑ کرتے دل کے بھانبھڑ اور بھڑک جاتے' کتنی ہی دور وہ چلتی چلی جاتی' ایک' دو' تین' چار اور پانچ منٹ بعد' وہ دوڑ کر آتا اور اسے منانے لگتا۔

''یار' کیوں چلی آئیں؟''

''آپ خود سے پوچھیں۔''

''میں نے ایسا کیا کیا؟'' معصومیت کی حد ہوتی۔

''بس میں ہی باؤلی ہوں' سب کچھ سہہ سکتی ہوں مگر......'' وہ رو دیتی۔

''دیکھو پلیز' بتاؤ تو سہی' ہوا کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے' رونے سے تم اور حسین ہو جاتی ہو۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھے کہتا۔

''اس کو کیوں دیکھ رہے تھے؟''

''کس کو؟'' کچھ کچھ سمجھ میں آتا تو مسکرا نے

''وہی جس نے بلیک گلاسز لگائے ہوئے تھے۔'' نم آنکھیں شکوہ کناں ہوتیں۔

''ارے' اتنی سی بات پر...... بھلا تم سے زیادہ حسین تھی وہ...... اس کے بال میری لائف بوائے شیمپو بے بی سے زیادہ سلکی اور چمکدار تھے۔ تم بھی نا' چلو بابا' غلطی ہو گئی' معاف کر دو۔''

وہ کہتا اور پھر سے نئی غلطی واپسی سے پہلے پہلے پھر سے ہو جاتی۔

یہ وہ شکایت تھی جو میاں بیوی کے درمیان کی بات ہوتی ہے۔ وہ بھلا کس سے اور کیسے کہتی؟ مگر ان پانچ ماہ میں وہ کوئی پانچ سو بار یہ حرکت کر چکا تھا۔

اس نے باہر جانا ہی چھوڑ دیا۔ وہ لاکھ کہتا۔

''یار' چلو کوئی پکچر دیکھ آتے ہیں۔''

مگر جو صورت حال تھری ایڈیٹس والے تھیٹر میں بن گئی تھی' وہ نہیں چاہتی تھی دوبارہ ہے۔ موصوف فلم کی کرینہ کو چھوڑ کسی اور پتلی کمر پر فریفتہ ہو گئے تھے جیسے وہ ایڈیٹ تو خالی خولی فلم ہی دیکھنے گئی تھی حالانکہ اس سے پہلے Rio کے دوران بھی وہ نیلا طوطا خود کو سمجھتی رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے یہ تفریح بھی چھوڑ دی تھی۔

گھر میں کوئی تھا نہیں' لے دے کے باجی بیگم اس کا پورا سسرال تھیں۔

اسے پسند بھی انہوں نے ہی کیا تھا عباد کے لیے۔

اُسے ہمیشہ سے لمبے چمکدار بالوں والی لڑکیاں پسند تھیں۔ تھا تو وہ نظر باز مگر لڑکیوں کے لانبے بال اُس کی کمزوری تھے۔ اُسے شیمپو کے اشتہارات بہت اچھے لگتے تھے خاص طور پر لائف بوائے شیمپو کے اشتہارات کا تو وہ دیوانہ تھا۔ اسے اتفاق کہیے کہ سحر سے باجی بیگم شروع ہی سے اٹیچڈ تھیں۔

اور اسے بولئے اتفاق کہیے کہ سحر کے بالوں کی خوبصورتی کا راز بھی لائف بوائے شیمپو ہی تھا۔

وہ بچپن سے اپنے گھر میں لائف بوائے شیمپو ہی کا استعمال دیکھتی چلی آرہی تھی۔ اُسے خوب یاد تھا کہ کس طرح اُس کی اماں ہر رات خوب اچھی طرح اُس کے سر میں تیل سے مساج کرتی تھیں اور صبح ہوتے ہی لائف بوائے شیمپو سے اُس کے بالوں کو واش کر کے گویا پورے دن کے لیے اُس کے بالوں کی طرف سے بے فکر ہوجایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اس روٹین سے چڑ بھی جاتی تھی تو اماں سے شکوہ کر بیٹھتی تھی۔ اماں بہت پیار سے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کے بالوں کو سہلاتی جاتی تھیں اور بس ایک ہی بات کہتی تھیں۔

''میری بٹیا! جب تُو بڑی ہوجائے گی نا تو پھر تجھے اس روٹین کی اہمیت پتا چلے گی۔ یہ لائف بوائے شیمپو سمجھ لو کہ عمر بھر بالوں کی لائف کی گارنٹی ہے بٹیا۔''

واقعی اماں نے جو جو کہا سچ ثابت ہوا تھا۔

اس کے بال نظر لگنے کی حد تک خوبصورت اور مضبوط تھے اور اس کے ہی کیا، اس کے گھر کی تمام ہی خواتین کے بال لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے مضبوط، توانا اور لانبے تھے۔

سو عباد کے لیے سحر کو بھٹ سے آپا بیگم نے مانگ لیا۔

وہ بھی انہیں ہمیشہ سے بڑی بہن ہی کا درجہ دیتی آئی تھی۔

اب حد ہوگئی تھی، عباد کی نظروں کے تیر کسی اور پر پڑتے تھے مگر چھلنی اس کا سینہ ہوگیا تھا۔ ساری محبت اس نظر بازی کی خاک میں مل گئی تھی۔ وہ اس غلطی کو سرے سے غلطی ہی نہیں مانتا تھا۔

''دیکھو سحر یہ گھر، گھروندے ریت کے نہیں ہوتے، یہ تو اعتبار کے رشتے ہوتے ہیں جن کی مضبوطی کے لیے انہیں اعتبار کا گارا درکار ہوتا ہے۔ ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ عباد لاکھ نظر باز سہی مگر میں حلفیہ اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ وہ دل میں کسی کو نہیں رکھ سکتا سوائے تمہارے۔ تم یقین کرو گی؟ میرے ہاں آکر جو تمہارے گن گانا شروع کرتا ہے کہ جو تمہارے لائف بوائے شیمپو والے بالوں کی طومار باندھتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے برا لگنے لگتا ہے کہ شاید مجھ سے غلطی ہوگئی۔ کوئی نند، بھابھی کی تعریف پسند کرے گی جبکہ نند بھی اکلوتی؟''

باجی بیگم نے رسان سے سمجھایا۔

''تم کچھ عرصہ اور دو اسے، ایک دو بچے ہو جائیں تو خود ہی اس کے یہ چونچلے ختم ہوجائیں گے۔ چلو شاباش، یہ گھر تمہارا ہے، کس کے حوالے کر کے جا رہی ہو؟''

باجی بیگم کے آنسو پونچھنے پر وہ ان کی بات کچھ کچھ سمجھ رہی۔ آج اس نے باجی بیگم کو بلا کر عباد کے بارے میں جو دل میں شکوے تھے، بدگمانیاں تھیں، گوش گزار کر دی تھیں۔ کچھ دیر بعد باجی بیگم اسے منا کر اپنے ہاں چلی گئی تھیں اور وہ کچن میں چولہا جلا کر اپنا دل پھونکنے لگی تھی۔

....

اپنی پندار کی کرچیاں
چن سکوں گی
شکستہ اڑانوں کے
ٹوٹے ہوئے
پر سمیٹوں گی
تجھ کو بدن کی اجازت سے
رخصت کروں گی
کبھی اپنے بارے میں
اتنی خبر ہی نہ رکھی تھی
ورنہ بچھڑنے کی یہ رسم

کب کی ادا ہو چکی ہوتی

مرا حوصلہ

اپنے دل پر بہت قبل ہی

منکشف ہو گیا ہوتا

لیکن...... یہاں

خود سے ملنے کی فرصت کسے تھی

اور پھر اس نے سمجھوتے کی سل اپنے سینے پر رکھ لی جس کے نتیجے میں پہلے اس کے ہونٹ مسکرانا بھولے اور پھر ایک خاموش احتجاج اس کے اندر اترتا چلا گیا۔

عباد کو وہ کبھی کبھی الوہی لمحات میں پتھر کی سی سل لگا کرتی۔ وہ اپنی محبت سے لاکھ اس مورتی میں حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا مگر...... جب جذبات مر جاتے ہیں تو زندہ لاشیں وجود میں آ کر تکمیل پا جاتی ہیں اور یہ لاشیں صرف روبوٹ بن جایا کرتی ہیں۔

تمام فنکشن ان کے اندر موجود ہوتے ہیں لیکن دل نام کا عضو اپنی بیٹری صحیح طرح چارج نہیں کر پاتا اور اسی کے سبب سے دل جذبات والی لہریں دماغ تک پہنچنے نہیں دیتا اور یوں ایک نیا نروس سسٹم تمام افعال انجام دینے میں متحرک ہو جاتا ہے۔

وہ بھی اسی نئے اندرونی نظام کے تحت جینے لگی تھی، بالکل روبوٹ کی طرح سے۔

اچانک ہی اب اس کے اندر کا یہ نیا سسٹم ٹوٹنے پھوٹنے لگا تھا۔ اس کے اندر ایک اور دنیا اپنا مقام بنانے لگی تھی۔ تبدیلیاں واضح اشارہ تھیں کہ خدا نے اس کے قدموں تلے جنت رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

......•......•......•

آج وہ ایک عرصے بعد جی اٹھی تھی۔ عباد کی محبت اس کی روح میں پنجے گاڑ چکی تھی اور ایسی پائیدار محبت نے اسے واپس پتھر سے انسان بنایا تھا۔

اس نے اس خبر کے ملتے ہی اس دن بہت محبت سے بلیک جارجٹ کی ساڑی پہنی اور ہلکا پھلکا سا میک اپ کیا تھا اور بالوں کو لائف بوائے شیمپو سے خوب اچھی طرح واش کر کے عباد کی پسند کے مطابق کھلے چھوڑ دیا تھا۔ عباد کی فیورٹ ڈش بھی بڑے دل سے تیار کی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر سجاوٹ کے انتظامات دیکھ کر وہ پلٹی ہی تھی کہ اس کی سماعتوں میں موبائل کی وائبریٹنگ ارتعاش پیدا کرنے لگی۔ وہ ان ارتعاش کی لہروں کی مدد سے موبائل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر عباد کا موبائل پڑا تھا جو اتفاقاً جیب سے پھسل کر گرا ہو گا۔ اس نے نادانستگی میں 'کی پیڈ' ٹچ کیا تو کسی کا میسج تھا اور میسج کے ساتھ بھیجنے والی کی تصویر بھی آ گئی تھی جسے یقیناً خود save کیا گیا تھا۔ اس حسینہ کا نام حرا تھا۔

اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ خون میں ابال بھی اٹھنے لگا تھا۔ تختی سے اس نے msg پڑھنے کے لیے بٹن پش کیے تو inbox کی جگہ outbox کے میسج آ گئے۔ حرا کے نام کے ساتھ کوئی آٹھ دس لگاتار send msg کیے گئے تھے۔

پہلے میسج میں لکھا تھا۔

'سوری یار' ایک کپ چائے صرف تمہارے ساتھ۔ جہاں تم کہو۔'

دوسرے میں لکھا تھا۔

'فرینڈ ہونا' اس لیے بتا رہا ہوں ایک بہت پیاری بیوی کا شوہر ہوں اور اُس کے بالوں سے اٹھتی لائف بوائے شیمپو کی خوشبو کا دیوانہ ہوں میں...... واؤ کیا زبردست پرسنالٹی بنا دی ہے۔ اس لائف بوائے شیمپو نے میری لائف، میری وائف کی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تیسرے ہیں۔ میری بیوی مجھ پہ بہت بھروسہ کرتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے میں نے کبھی اس کے بھروسے پر آنچ آنے نہیں دی۔ آئی لو اونلی مائی وائف۔''

اس نے اتنا پڑھ کر موبائل واپس وہیں رکھ دیا۔

•......•......•......•

بیل کی آواز پر وہ دروازے کی سمت آئی۔ عباد معمول کے جوش و جذبے سے اس کا سامنا کر رہا تھا۔ آج اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا' بالکل سچا' کہیں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ اس کا حسن آج واقعی دوآتشہ سا لگ رہا تھا۔ رہی سہی کسر جو میک اپ کے باوجود رہ گئی تھی' وہ کچھ دیر پہلے رونے کی وجہ سے آنکھوں میں گلابی پن نے پوری کر دی تھی۔

''کیا میں آج اپنے ہی گھر میں آیا ہوں؟'' عباد نے اس کے جوش و خروش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''کھانا لگا دیا ہے۔ آپ فریش بھی ہو گئے ہیں۔ چلیے' ڈائننگ ٹیبل پر میں آتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے جیسے اسے کچھ بھی کہنے سے روکا تھا۔

''جو حکم سرکار۔'' وہ محبت سے کہتا' ڈائننگ ٹیبل تک پہنچ گیا۔

سحر نے کھانا سرو کیا اور اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔

ابھی عباد نے ایک نوالہ ہی لیا تھا کہ اس کے موبائل کی مخصوص وائبریٹنگ نے اپنی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی۔

''اوہ نو...... یہ یہاں رہ گیا تھا؟ میں تو سمجھا' شاید کہیں باہر گر گیا ہے' سارا دن پریشان رہا۔'' اس نے موبائل اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

''کس کی کال آرہی تھی؟''

تفتیش شروع ہو گئی تھی۔

''ارے یار' msg تھے۔'' وہ جھنجلا کر کھانے کی جانب متوجہ ہوا۔

''لگاتار...... اتنے ڈھیر سارے میسج؟''

''بھئی اب تو سب ایک ہی میسج کو دس بار کر دیتے ہیں۔''

''آپ پہلے msg پڑھ لیں' کیا پتا بہت اہم msg ہوں۔''

عباد نے جھنجلاتے ہوئے میسج پڑھے۔ مسلسل ایک ہی میسج کی تکرار اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔

''پاپا جی!

نا جانے کیوں ہمیں تم پر بڑا بھروسہ ہے
خیال رکھنا کہ قائم یہ اعتبار رہے
آئندہ آپ کی نظر بازی بالکل برداشت نہیں کروں گی۔

آئی لو یو پاپا جی......!''

اس نے بڑھ کر سحر کو تھام لیا۔

''پرامس' بالکل نہیں آج کے بعد' صرف ان نظروں کی قید میں' عمر قید کی سزا آج سے۔'' یکدم وہ الگ ہو کر کچھ لے کر آیا تھا۔

''ارے جان' وہ تمہارے لیے پاپا جی' کا ایک چھوٹا سا گفٹ......''

''کیا لے آئے پاپا جی......؟'' وہ مسکرائی۔

''تم سے بڑھ کر خدا کا کوئی تحفہ ہے کیا۔'' عباد نے ایک ساتھ لائف بوائے شیمپو کی کئی بوتلیں اس کے ہاتھ میں دے دیں۔

سحر نے اُس کے کاندھے سے سر ٹکا دیا اور عباد اس کے لائف ٹائم خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جو لائف بوائے شیمپو ہی کی مرہونِ منت تھے۔

محبت اور اعتبار نے نئے رشتے کو جنم دے دیا تھا جو واقعی کل سے زیادہ پائیدار تھا۔

☆☆......☆☆

دامِ دل

قسط 17

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی' رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

ایک بے ترتیب پرانے فرنیچر سے لدا پھندا گھر...... آدھے سے زیادہ تاریکی میں ڈوبا ہوا۔ آدھے سے زیادہ سیور فیوزڈ، ٹیوب لائٹس کے اسٹارٹر اتنے پرانے کہ آج کی مارکیٹ میں کوئی ان کے نام سے بھی آشنا نہ ہوگا۔

جھاڑ فانوس شیشے کے بجائے مٹی کے بنے دکھائی دیتے تھے۔ ندا تو صفائی کے لیے کمر کس لیتی تھی مگر شبیر حسین ماسی کو اضافی چار جز ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور ماسی منہ پھاڑ کر ہزار دو ہزار صفائی کی مد میں طلب کرتی تھی۔ سو جیسا چل رہا تھا۔ اسے جاری رکھنا ندا کی مجبوری تھی۔ یہ ایک دم سے کیا ہوگا؟

یہ نرم روشنیوں سے جگمگاتا خوشبوؤں سے مہکتا بیڈ روم۔ فرش پر اتنے دبیز Rugs کہ پاؤں دھنس جائیں۔

بیڈ پر مخملی بیڈ کور، چار بڑے سائز کے نرم نرم گالوں جیسے تکیے۔ ساتھ میں کشن، خرگوش کی کھال جیسا نرم بلینکٹ، محرابی پشت والی سنہری بڑی بڑی دو کرسیاں، درمیان میں گول گلاس ٹیبل، اس پر بلوری گلدان، دونوں سائیڈ روشن ٹیبل لیمپس بھاری پردے، ڈریسنگ، واش روم اتنا صاف اور چمکتا ہوا گویا ابھی ابھی تعمیر کے بعد فنشنگ کا کام مکمل ہوا ہے۔

سفید تولیے، مختلف سائز کے، وہ بھی دو تین نہیں پورے آٹھ ایسی خوابناک خواب گاہ کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ثمر بیڈ پر دراز تھا اور وہ آئینے کے سامنے کھڑی پہنی ہوئی جیولری اُتار رہی تھی۔
ثمر کی تشنگی باتوں سے نشہ چڑھا ہوا تھا۔ جو آنکھوں میں اُترا ہوا تھا۔
اس نے آئینے میں خود کو بہت توجہ سے دیکھا۔
وہ ایک دم سے اتنی حسین کیسے ہوگئی۔ خود کو پہچاننا مشکل ہو رہا ہے۔
آئینے میں دیکھنا منع ہے۔ ثمر کی شریر آواز عقب سے اُبھری۔ مگر ندا نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے

آئینے میں ہی اسے دیکھ کر شرمائے شرمائے لہجے میں سوال کیا۔
''وہ کیوں؟''
''میری آنکھیں کس دن کام آئیں گی؟ جھانک کر دیکھو ان میں۔ تمہیں صرف اور صرف اپنی تصویر نظر آئے گی۔''
''ہائے اللہ......'' دل دھک سے رہ گیا۔ اسے تو ایسی باتوں کا جواب بھی نہیں دینا آتا۔ اور اسے مرض تھا کہ جواب تو ضرور دینا چاہیے۔
ثمر کہہ تو گیا...... مگر اسے اپنے ہی الفاظ بالکل کھوکھلے محسوس ہوئے۔ گویا کہ بانس...... باہر سے چکنا اور مضبوط اندر سے کھوکھلا، خالی یہ الفاظ تو شاید اس نے 'دوسری عورت' سے پہلی بار بولے ہیں۔ پہلی شادی سبق سکھاتی ہے۔ دوسری زندگی سکھاتی ہے۔
بہت سے الفاظ خزانے کی طرح جمع رہتے ہیں۔ پھر ان پر رویوں کا ناگ پھن اُٹھا کر بیٹھ جاتا ہے۔
شادی پرانی یا ختم ہو جاتی ہے خزانے کی دیگ کا ڈھکن کبھی نہیں کھلتا۔
کند چھری سے انا ذبح ہوئی۔
ناگ کو زیر کرنے کا طلسم ہاتھ لگا۔ دیگ کا منہ کھل گیا۔ الفاظ اُبلنے لگے۔
مگر سکہ رائج الوقت تبدیل ہو چکا تھا۔ موتی نگینوں کے دام بک رہے تھے۔
ثمر ایک دم سے ہونق سا ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے پہلے جھوٹ کے بعد حالت غیر ہو جاتی ہے۔
مگر ندا کا نشہ دو آتشہ ہو گیا۔
جسے پیا چاہے وہ سہاگن......
مگر عورت یہ تو کہہ سکتی ہے پیا اُسے چاہتا ہے...... مگر اس پر حلف نہیں اُٹھا سکتی۔ پیا کی چاہت کا اظہار ہوتے ہی...... دھڑکنوں اور اندیشوں کی بھی تو Open House Sale لگ جاتی ہے۔
محبتوں میں ہے دلوں کو عجب دھڑکا سا
کون جانے کب کہاں راستہ بدل جائے
کیا سوچ رہے ہیں۔ ندا اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور بہت غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
ثمر ایک دم سنبھل گیا اور ندا کے دونوں ہاتھ تھام کر مہندی کے ڈیزائن پر نظریں جما دیں۔ نرگس آنٹی نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ کنواری بچی کا کوئی ارمان دل میں نہ رہ جائے۔
ندا کو اپنے گھر بلا کر مہندی لگانے والی ایکسپرٹ لڑکی بھی بلالی تھی۔ خود جا کر شبیر حسین کا پہرہ دینے بیٹھ گئی تھیں۔ گھر میں تو کوئی جوان لڑکی نہیں تھی مگر اپنے بھائی بہن کی بچیوں کو خود ہی مدعو کر لیا تھا۔ بڑی سادہ سی تقریب تھی۔
رخصتی کے وقت شبیر حسین سوئے ہوئے تھے۔ نرگس احتیاط کر رہی تھیں کہ اب انہیں ہر قسم کے شاک سے بچایا جائے۔ عروسی ملبوس، جیولری، میچنگ سینڈل، کلچ، جیولری خود ہی خرید لائی تھیں۔ ٹائم ہی نہیں تھا کہ بازاروں کے چکر لگتے۔ ثمر نے شاپنگ کے لیے ایک لاکھ روپے کا پیکٹ دیا تو اس نے جوں کا توں نرگس آنٹی کو تھما دیا تھا۔

دو تین ڈریسز مزید لے لیے تھے۔ جو ندا ہوٹل میں ساتھ ہی لے آئی تھی۔ ثمر نے بتایا تھا ابھی وہ تین چار دن اسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔

آدم اور حوا جنت میں اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ شیطان ابھی 'پلاننگ' میں بزی تھا۔

ابھی آدم و حوا کے شعور میں ہی نہیں تھا کہ اس آباد بستی میں اللہ اور اس کے فرشتوں کے علاوہ بھی کوئی ہوسکتا ہے۔

ابھی عزازیل ابلیس کے تخلص سے عاری تھا۔ دُکھ کی تخلیق کا فن ابتدائی مداحل میں تھا۔ مہندی کا ڈیزائن دیکھتے دیکھتے روشنیاں گل ہونے لگیں۔

مہندی کے پھول اوجھل ہوگئے۔ دلوں میں پھول کھلنے لگے۔ نشاط کے دو ساتھی...... ایک سر سے پاؤں تک محبت سے چور دوسرا محبت کے نام پر 'آنا بچاؤ' تحریک کا کارکن......

☆......☆......☆

نئی نویلی زیرو میٹر بہو آئے آج تیسرا دن تھا۔ ولیمہ ایک ہفتے بعد ہونا تھا جلدی کی بکنگ نہ لان ملی نہ ہال ہیں...... ایک ہال اللہ میاں کے پچھواڑے ملا تو جلدی سے بک کرالیا۔ ہفتے اتوار کے علاوہ سب اچھے لانز وہال میں آسانی سے بکنگ مل سکتی تھی۔

مگر فردوس اور حامد حسین ورکنگ ایام میں تقریب رکھنا نہیں چاہتے تھے کہ مہمان عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہیں آپاتے۔ مہمان نہ آئیں تو اتنا اچھا اور مہنگا کھانا پکوانے کا کیا فائدہ......

نہ نیوتے کے لفافے نہ شاندار ڈنر کی تعریفیں......

دونوں میاں بیوی تو سرے سے ولیمہ گول کرنے کے چکر میں تھے۔ مگر ربیعہ کے ماں باپ کا اصرار تھا کہ ان کی بچی کنواری ہے۔

پہلی شادی ہے...... اس کے بھی تو ارمان ہیں...... یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ آپ کا بیٹا تو آٹھ سال سارے ارمان پورے کرنے کے بعد ہماری کنواری بچی کو بیاہنے آ رہا ہے۔

ڈیگیں، شیخیاں اپنی ماری تھیں کہ یہ خرچہ کرنا ہی پڑا۔

تھوڑا سا تکلفات کا پردہ سرکا تو ربیعہ نے پہلا سوال بچیوں کے بارے میں کیا۔

''وہ امی جان...... بچیاں نظر نہیں آ رہیں۔'' فردوس ایک سیکنڈ کے لیے تو بھونچکی سی رہ گئی۔

''ارے...... تم نے اپنے میاں سے نہیں پوچھا......؟'' فردوس کے سینے میں دُبکے شک کے ناگ نے پھن لہرایا۔

''شاید کھوج کر رہی ہے۔ مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتی ہے۔ کیا یاور نے بتایا نہیں ہوگا۔ اُف یہ آج کل کی لڑکیاں...... جتنی زمین کے اندر اتنی زمین سے باہر......''

''مجھے اچھا نہیں لگا۔ یاور خود سے کوئی بات کرتے تو الگ بات تھی۔''

اس نے تمہارا خیال کیا ہے ناں کہ نئی نویلی بیوی سے کیا بچوں کی باتیں کرے۔ پھر تم ہی کہتیں کہ اپنی مرحومہ بیوی اور بچوں کی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔''

''ارے میرا بچہ عورت کے سکھ کو ترسا ہوا ہے۔ اللہ بخشے ایمن کو وہ تو شوہر سے خدمت اور

تیمارداریاں کرانے آئی تھی۔''

''بھئی ہم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی...... ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر اس کی خدمت کی...... اسپتالوں کے چکر کاٹ کاٹ کر گھٹنے جواب دے گئے۔ اب زیادہ چل پھر نہیں سکتی۔

لگے ہاتھوں نئی بہو کو جتا دیا کہ وہ ان سے خدمت کی کوئی امید نہ رکھے اب ان کے گھٹنے بول پڑتے ہیں۔

یہ تو سب قسمت کی بات ہے۔ بیمار پڑنے کا کسی کو شوق تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اپنی اور سب کی صحت کے لیے دعا کرنا چاہیے۔ ربیعہ نے بڑی سادگی سے کہا تھا ایک طرح سے مرحومہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا تھا۔

''ٹھیک بولیں بیٹا...... میں تو دن رات پڑھ پڑھ کر بخشتی ہوں۔ تہجد میں دو نفل اس کے لیے بھی پڑھ لیتی ہوں۔'' فردوس نے زمانے بھر کی رقت لہجے میں اُتارنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

''ماشاء اللہ...... بہت قسمت والی تھیں...... جو آپ جیسی ساس ملی تھی۔'' ربیعہ بہت متاثر نظر آرہی تھی۔ تہجد گزار مرحومہ بہو پر نثار...... ایسی ساس تو آرڈر پر ہی بن سکتی ہے۔

یاور کی شادی کی وجہ سے بچیوں کو نانا نانی کے پاس بھیج دیا تھا۔

جان دیتے ہیں بچیوں پر...... بھئی ان کی مرحومہ بیٹی کی نشانیاں ہیں...... ہماری خوشامدیں کرتے ہیں کہ بچیوں کو وہیں ہمارے پاس رہنے دیں...... انہیں دیکھ کر ہمارے کلیجے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ظاہری بات ہے امی جان...... نانا نانی تو پیار کرتے ہی ہیں۔ میری نانی اماں تو ابھی تک میرے لیے اپنے ہاتھوں سے ڈریسز تیار کر کے بھیجتی ہیں۔ ربیعہ نانی کا ذکر کرتے ہوئے محبت سے شیریں ہونے لگی۔

درزن ہیں خیر سے تمہاری نانی اماں...... فردوس پھٹا نہ سکیں...... بھوکی نانی اس عمر بھی سلائیاں کر رہی ہے۔ یہی کچھ سمجھ آئی۔

''ارے نہیں امی جان...... میری نانی اماں سلائی کڑھائی کی بہت شوقین ہیں۔ سوئٹر پر اتنے پیارے ڈیزائن بناتی ہیں جو دیکھے تو بس دیکھتا رہ جائے...... سندھی، بلوچی ٹانکوں سے کڑھائی کرتی ہیں۔ بس اپنے نواسیوں، پوتیوں، کے لیے ہی کچھ نہ بناتی رہتی ہیں۔'' ربیعہ نے وضاحت کی۔

''اللہ ان کی آنکھیں سلامت رکھے۔'' اب تو شوگر کی وجہ سے میری نگاہ کام نہیں کرتی۔ ورنہ میں تو کبھی درزی سے کپڑے سلوانا پسند ہی نہیں کرتی تھی۔ فردوس کو کسی صورت دینے کی عادت نہیں تھی۔ ہر معاملے میں پلہ بھاری رکھنے کا جنون تھا۔

''اچھا آپ کو سلائی آتی ہے......؟''

''آتی ہے مگر اب بس کی بات نہیں رہی۔'' فردوس نے جلدی سے کہا۔ مبادا بہو جہیز میں لائے کپڑے (Un Stiched) لا کے نہ پٹخ دے کہ امی جان بیٹھے بیٹھے سلائی ہی کر لیں...... اس میں کھلتے استعمال نہیں ہوں گے۔

''اور ہاں دلہن...... ایک دم سے سارے کپڑے نہ سلوا لینا...... کچھ مہینے گزریں گے تو ناپ بدل جائے گا۔'' فردوس نے ایک متوقع خرچے سے بھی موقع ملتے ہی بچت کا راستہ نکال لیا۔

"امی جان..... آپ فکر نہ کریں...... میں اپنی ڈائٹ کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ Weight بڑھنے سے تو مجھے بہت ہی خوف آتا ہے..... ربیعہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"ارے بیٹا Weight تو اپنے آپ بڑھے گا۔ چاند سا پوتا بھی تو کھلانا ہے مجھے..... جس کے لیے دعائیں مانگتے مانگتے یہ دن آ گیا۔"

تین دن کی بیاہی بہو..... شرم سے دوہری ہونے لگی۔

☆.....☆.....☆

میری بیٹی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا..... یاور نے دوسری شادی بھی رچالی..... عطیہ بیگم رقت بھری آواز میں بول رہی تھیں۔

چمن اور مشکور احمد ان کے سامنے سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ جیسے جواب میں کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔

ان معصوم بچیوں کی خاطر میں اپنی بیٹی کو ان ظالموں کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتی تھی کہ گھر ٹوٹ جائے تو بیٹیاں ساری زندگی آزمائشیں کاٹتی ہیں۔

ظلم کرنے والے طلاق یافتہ کا ماں کا طعنہ دے کر خاموش رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بے گناہ بیٹیاں مجرموں کی طرح زندگی گزارتی ہیں۔

"مجھے کیا پتہ تھا..... میں نے اپنی بیٹی کو مرنے کے لیے وہاں چھوڑا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر عطیہ بیگم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ماں کے آنسو چمن کو تڑپا گئے۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور ماں کے قریب جا بیٹھی۔

"امی..... ہونے والی بات ہو گزری..... پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے سے آپا واپس نہیں آجائیں گی۔ البتہ آپ بیمار ہو جاؤ گی۔

ڈپریشن میں چلی جائیں گی۔ ان بچیوں کے علاوہ مجھے بھی تو آپ کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔

"وہ تو چلی گئی..... اللہ تمہیں جیتا رکھے..... تمہارا دکھ تو میں نے اوڑھ پہن لیا ہے۔ تم سے سوچ نہیں ہٹتی۔" عطیہ بیگم نے بے اختیار چمن کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"عطیہ بیگم..... بیٹی کو مزید احساسِ جرم میں مبتلا مت کرو..... اسے اپنے دکھ مضبوطی دیں گے مگر تمہارا دکھ توڑ دے گا......"

"بہت کچھ ہو گیا..... بہت کچھ ہو رہا ہے۔ کیا مر جائیں؟ مگر کیسے؟ ہمارے ایمان سے زیادہ قیمتی کوئی شے ہے؟"

"یہ مال، یہ اولاد، اس اولاد کے غم اور خوشی، مصروفیات، کچھ بھی تو ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔ اپنی اپنی قبر میں ہم اکیلے ہیں..... وہاں سے ہماری پکار پر کوئی دوڑا نہیں آئے گا۔"

آزمائش اور سختی کے اس وقت میں..... اپنے ایمان کی حفاظت کرو۔ اللہ سے استقامت کی توفیق مانگو..... مشکور احمد نے ہمیشہ کی طرح بڑی ہمت سے رونے والوں کو شرمندہ کیا۔

''آپ کی ہمت ہے تو ہمت پکڑتے ہیں مشکور صاحب..... ورنہ تو کبھی کے مر گئے ہوتے.....عطیہ بیگم نے آنچل سے اپنی آنکھیں رگڑ یں۔
وقت سے پہلے نہ پیدائش ہے نہ موت...... جب تک کی زندگی ہے اس وقت تک موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ مشکور احمد نے اسی وضع داری اور حوصلے سے عطیہ بیگم کو پھر لا جواب کیا۔
''امی...... یہ بھی ہو گیا اور وہ بھی ہو گیا......''
''اب سوچنا صرف یہ ہے کہ اب کیا کرنا ہے؟''
''میں آپ کو بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔''
یہ معصوم بچیاں...... ہماری ذمہ داری اور مستقبل کے دو خاندان ہیں ہمیں انہیں تربیت دینا ہے۔ شعور دینا ہے کہ وہ اپنے گھروں کو کیسے لے کر چلیں گی۔ اپنے بچوں کو کیا سوچ دیں گی۔ مخالف حالات میں خود کیسے سنبھالیں گی۔ دوسروں سے اپنی عزت کیسے کرائیں گی۔ جہالت کے اندھیروں میں اپنے حصے کا چراغ کیسے جلائیں گی؟''
''شاباش میری بیٹی...... شاباش......'' مشکور احمد چمن کی بردباری اور ہمت پر عش عش کر اٹھے اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
''امی...... میں بہت خوش نصیب ہوں۔ میرے ماں باپ کا سایہ میرے سر پر ہے۔ جو دن رات اللہ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر میرے لیے دعائیں کرتے ہیں۔
زندگی میں جو بھی کمی ہوتی ہے وہ خیال اور دھوکہ ہوتی ہے۔ اصل کمی تو ماں باپ کا نہ ہونا ہے۔ میرے ماں باپ موجود ہیں۔ میری زندگی میں کوئی کمی نہیں...... آپ میرے لیے نہ سوچا کریں...... اللہ نے مجھے بہت ہمت دی ہے۔
ایمانداری سے سوچیں کیا یہ بہت بڑی Blessing نہیں ہے کہ کھوٹے سکے جیسے لوگ ہماری زندگی سے خود بخود نکل جائیں۔ دن رات کی ذہنی اذیت سے نجات مل جائے۔
ناشکروں ناقدروں کو اپنا قیمتی وقت دینے کے بجائے ہم کچھ اچھے کام کریں۔ زندگی کو با مقصد بنائیں۔ چمن نے ماں کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔
''عطیہ بیگم...... یہ اولاد ہوتی ہے جو اپنے ماں باپ کا سر فخر سے اونچا کرتی ہے۔ ماں باپ کی بخشش کا وسیلہ بن سکتی ہے۔''
''ہمیں ہماری اوقات سے زیادہ نوازا گیا ہے۔ کم از کم اس زندگی میں تو ہم اپنے مالک کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔'' مشکور احمد کے لہجے میں سچائی اور عاجزی فطری اور خالص تھی۔
عطیہ بیگم کے ڈوبتے دل کو دونوں باپ بیٹی نے جس ذہانت و فراست سے سنبھالا تھا انہیں احساس بھی نہ ہوا کہ آنِ واحد میں ان کی کیفیات کیسے تبدیل ہو گئیں۔
دکھ سہنے کے لیے ہوتے ہیں۔ خوشیاں منانے کے لیے ہوتی ہیں۔ اپنے اعمال کی طرح اپنے دکھ کا بوجھ بھی خود ہی اٹھانا ہو گا۔ مشکور احمد کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
باپ بیٹی کے جادو اثر الفاظ کام دکھا گئے۔ عطیہ بیگم کو خیال آیا کہ بچیاں اسکول سے آتی ہوں گی۔ ان

کے لیے لنچ تیار کرنا ہے۔"

یاور نے شادی کی یا منگنی..... اب ان کا ذہن اس طرف سے ہٹ چکا تھا۔ ماں کی طبیعت میں سنبھالا دیکھ کر چمن نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔

☆......☆......☆

"چار دن کے لیے اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ کہہ رہا تھا آفس کے کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ خالی ڈھنڈار گھر کھانے کو دوڑ رہا ہے۔"

تم دو چار دن کے لیے بچوں کو لے کر آ جاؤ..... گھر میں رونق تو بچوں ہی سے ہوتی ہے۔ بانو آپا بڑے سکون سے افشاں سے باتیں کر رہی تھیں اور افشاں اس وقت 'حالت جنگ' میں تھی۔ باہر دھوبی آیا بیٹھا تھا۔ اس سے گن کر کپڑے وصول کرنا تھے۔ ساس لیٹ ناشتہ کرتی تھیں۔ انہیں تازہ سالن کھانے کی عادت تھی۔ 'ویجی ٹیرین' تھیں ان کے لیے مسالا بھری بھنڈی بنانا تھی۔ بچے الفریڈو کی فرمائش کر کے اسکول گئے تھے۔

"امی جان..... آپ کے پاس آ جاؤں تو اس 'مینا بازار' کو کون سنبھالے گا۔ آنکھ کھلتے ہی چاروں طرف سے آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔" افشاں بہت مصروف انداز میں جواب دے رہی تھی۔

"ارے صاف کہہ دو..... ابھی میری ماں زندہ ہے۔ اسے بھی میری ضرورت ہے۔ دو چار دن گھر خود سنبھالیں۔"

دنیا کی بیٹیاں مہینہ مہینہ بھر ماں کے پاس رُکتی ہیں۔ تم تو ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہو۔ بانو آپا نے بیٹی کے منہ سے صاف کورا جواب سن کر برا منایا۔

"امی جان..... ذرا سا بھی راستہ ملتا ہے تو آپ کے پاس دوڑی چلی آتی ہوں۔ مگر اس وقت اس بری طرح پھنسی ہوئی ہوں کہ آپ سے فون پر بھی بات نہیں ہو سکتی..... ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آپ کو ملاتی ہوں..... خدا حافظ۔ افشاں نے ایک سانس میں سب کہہ کر فون بھی بند کر دیا۔ بانو آپا ہیلو ہیلو کرتی رہ گئیں۔

میری بچی پس کر رہ گئی ہے۔ ساس تو جیسے قیامت کے بورے سمیٹیں گی..... ہر ہفتے ہاسپٹل پہنچ جاتی ہیں۔

"ارے اللہ توبہ ایک بار تو افشاں نے گھر میں سفید چاندنیاں بھی بچھوا دیں تھیں۔ لو پھر چلی آ رہی ہیں۔ گلوکوز کی تھیلیاں نہ ہوئیں آب حیات ہو گیا۔" بانو آپا سارا غصہ افشاں کی ساس پر نکال رہی تھیں۔

کچھ دیر بیٹھی کڑھتی رہیں۔ پھر خیال آیا کہ لاڈلی سہیلی کو فون ملائیں۔

سہیلیوں کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ دو تین پیراگراف تو چمن پر ہی ہو جائیں گے جو لاکھوں کے خرچ کروا کر چلی گئی..... وہ بھی ذلیل کر کے..... ناشکری پر تو جتنا بھی کہا جائے کم ہے پیاری سہیلی کا خیال آتے ہی جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ نمبر ڈائل کرتے کرتے موضوعات بھی منتخب ہو رہے تھے۔

☆......☆......☆

"بہت شکریہ ڈاکٹر..... کہ آپ نے ہمیں یاد رکھا۔ چمن حیرت و خوشی سے ڈاکٹر علی عثمان سے فون پر

بات کر رہی تھی جو مہ وش اور مہ پارہ کو اپنی چھوٹی بہن کی برتھ ڈے پر انوائٹ کر رہے تھے۔

''شکریہ تو آپ کا ادا کریں گے جب آپ بچیوں کو لے کر آئیں گی اور ٹینا کی خوشی میں شرکت کریں گی۔''

''انشاء اللہ میں بچیوں کو لے کر ضرور آؤں گی۔'' چمن نے بلا سوچے سمجھے ایک جذباتی لہر میں بہہ کر وعدہ کر لیا۔

''مجھے ان بچیوں کا اکثر خیال آتا ہے جو اچانک ماں کی شفقت سے محروم ہو گئیں۔ لیکن یہ بھی بہت بڑی Blessing ہے کہ انہیں آپ جیسی خالہ ملی ہے ہر رشتہ Devoted نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر علی عثمان بہت باوقار اور محتاط انداز میں اسے سراہ رہے تھے۔

''شکریہ ڈاکٹر...... بائی داوے ٹینا کی یہ کونسی برتھ ڈے ہے۔ میرا مطلب ہے اس وقت اس کی ایج کیا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے بچے جب برتھ ڈے میں انوائٹ ہوتے ہیں تو گفٹ کی شاپنگ کرنے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کام بہت اہم اور خوشگوار ہوتا ہے۔ چمن نے صراحت کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

''ارے یہ فارمیلیٹیز چھوڑیے...... وہ دونوں ڈولز تو ٹینا کے لیے گفٹ ہی ہیں۔ ڈاکٹر علی نے تکلف کے ضمن میں کہا۔

''آپ تکلف کر رہے ہیں۔ اگر ٹینا کی ایج پتہ چل جائے تو ہمیں سہولت رہے گی اور بچے تو اپنی برتھ ڈے گفٹ کے ساتھ ہی انجوائے کرتے ہیں۔''

چلیے آپ اتنا اصرار کر رہی ہیں تو بتا دیتا ہوں وہ ڈول کا گفٹ پسند کرتی ہے۔ آپ آئیں گی تو دیکھیے گا...... اس کا روم ڈولز سے بھرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر علی کے لہجے میں بہن کے لیے پیار اُمڈ رہا تھا۔

''اوہ...... گڈ...... مہ وش اور مہ پارہ کے لیے تو یہ بہت ہو گیا۔ ڈولز کی شاپنگ کرنا...... اس سے زیادہ دلچسپ کام تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ بہت دنوں بعد ان کے لیے بھی یہ ایونٹ بہت بڑی خوشی ہے۔ جس کے لیے ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ چمن اس خیال سے ہی ہلکی پھلکی ہو رہی تھی کہ اُداس پریوں کو خوش ہونے کا موقع مل رہا تھا۔

''Done...... آج سے میں اور ٹینا اپنے Guests کا Wait کر رہے ہیں۔ خدا حافظ۔ ڈاکٹر علی کی طرف سے فون بند ہو گیا مگر سیل ابھی بھی چمن کے کان سے لگا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ عطیہ بیگم کچن کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئیں۔ دل میں خوشگوار کیفیت لہر کی صورت گزر گئی۔

حیرت سے چمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''ماشاء اللہ......'' آج بہت دنوں بعد تمہیں مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''ثمر کا فون تھا......'' سوال کرتے ہوئے خوشی سے ٹانگوں میں لرزہ سا آ رہا تھا۔

''ثمر......؟'' ٹرین جنگل سے گزر رہی تھی۔ دور تک کوئی جنکشن نہیں تھا۔ لائن کلیئر ہونے کی وجہ سے رفتار تیز اور یکساں تھی۔ مگر یہ کیا ہوا انجن پٹڑی سے اتر گیا۔ بوگیاں اس بری طرح ہلیں کہ مسافر ایک دوسرے پر آ رہے......

اس نے متوحش نظروں سے عطیہ بیگم کی طرف دیکھا۔ خود فراموشی کی سی کیفیت غالب آ گئی۔

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اس حال کو پہنچ گئی تھی کہ بہت ساری مصروفیات تخلیق کر کے خود کو بھلانے کی کوشش میں جت گئی تھی۔

یہ مسکراہٹ انہی مصروفیات میں سے کہیں سے اسے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی۔ ہاں نہ دیکھتی تو دھیان بھی نہ آتا کہ آج کی تاریخ میں وہ مسکرائی تھی۔

ڈاکٹر علی کا فون تھا امی...... اپنی بہن کی کوئی بات سنا رہے تھے۔ بچوں کی باتیں تو ہوتی ہی اتنی مزیدار ہیں کہ انسان اپنی پریشانیاں بھول جاتی ہے۔ چمن نے یوں وضاحت کی جیسے اس نے مسکرا کر کوئی کوئی غلطی کی یا جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

''اچھا...... اچھا...... خیریت سے فون کیا؟'' عطیہ بیگم کے دل پر مایوسی اور اداسی نے جبڑا پھاڑ کر پہلے سے زیادہ درندگی سے دانت گاڑ دیے کہ طویل ناامیدی کے بعد امید کی لہر ابھرنا اور معدوم ہو جانا کرو جانی اذیت کی معراج ہوتی ہے۔

کھوکھلے لہجے میں چند الفاظ پرو دیے۔

''جی...... ان کی بہن کی برتھ ڈے ہے۔ مہوش اور مہ پارہ کو انوائٹ کیا ہے۔ چمن نے مطلع کر دیا۔

''اچھا...... یہ تو اچھی بات ہے...... بچیاں کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ لے جانا...... خوش ہو جائیں گی۔'' عطیہ بیگم طوفان کی طرح نازل ہونے والی مایوسی کو پوری قوت سے پرے دھکیل رہی تھیں۔

چمن کی مسکراہٹ نے ایک پل میں کتنے حسین خواب دکھا دیے تھے۔ آنکھ کھلنے پر افسوس ہوا...... کہ کچھ دیر اور آنکھ نہ کھلتی۔

''جی ای...... میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ مہینوں ہو گئے۔ بچیاں ابھی تک چاروں طرف اُداسیاں دیکھ رہی ہیں۔ کچھ ایسا نظر نہیں آتا کہ تھوڑی دیر کے لیے سچ مچ خوش ہو جائیں۔'' چمن نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب میں کہا۔

''بچے بچوں ہی میں خوش ہوتے ہیں۔''

''ڈاکٹر کے اپنے بچے بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے مہ وش اور ماہ پارہ کی عمروں کے ہوں۔'' عطیہ بیگم اب مکمل طور پر موضوعِ کلام میں جذب ہو چکی تھیں۔

''ایسا کچھ پتہ تو نہیں چلتا۔ خیر...... یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تو سوچ رہی ہوں بچیوں کے نئے ڈریسز بھی لے لوں اور ڈاکٹر صاحب کی بہن کے لیے کوئی گفٹ بھی۔'' چمن گہری سانس لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید اس کو خود اپنے بارے میں بھی آگہی نہیں تھی کہ تبدیلی صرف بچیوں کے لیے ہی نہیں اس کے اپنے لیے بھی ضروری تھی۔

☆......☆......☆

کوئی پوچھتا ہے کہ سرخ کیوں ہیں آنکھیں؟
تو آنکھ مَل کے کہتا ہوں رات سو نہ سکا
ہزار چاہوں گا پر کہہ نہ سکوں گا......!
رات رونے کی خواہش تھی رو نہ سکا

''آپ کی آنکھوں سے لگتا ہے آپ ٹھیک سے سوئے نہیں۔'' ندا ہاتھ گاؤن لپیٹے ٹھنڈے ہاتھوں سے ثمر کو چھو رہی تھی۔

ثمر نے بری طرح چونک کر ندا کی طرف دیکھا تھا۔ یوں جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

''ارے یہ تو تمہاری محبت کے نشے میں نشیلی ہو رہی ہیں۔'' اس نے مسکرا کر فوراً پینترا بدلا...... ندا شرم سے دوہری ہونے لگی۔

''پہلی شادی کا زخمی ایسا ہی منافق ہوتا ہے۔ بانہوں میں کوئی ہوتا ہے اور دھیان میں کوئی اور......''

''مجھے اگر پہلے اندازہ ہوتا کہ آپ مجھ سے اتنی محبت کرنے لگے ہیں تو میں ہر وقت خوشی سے جھومتی رہتی۔ نانا جان کی چیخ و پکار بھی مجھے میلوڈی محسوس ہوتی۔ مزیدار کھانا نہ بھی ملتا تو جیم سلائس کھا کر بھی خوش ہوتی۔'' اتنی زیادہ خوشی ملنے کے بعد تو انسان کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

ندا اپنی فطری بے ساختگی کے ساتھ بولتی جا رہی تھی۔ ثمر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اتنی اہم اور قیمتی ہے اس کی ذات؟ وہ خود سے سوال کرنے لگا۔ ایک لڑکی سمجھتی ہے اسے زندگی میں سب کچھ مل گیا۔

اس عورت نے تو اسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ تو کچرا ہے۔ کاغذ کا پھول گالی یاد آئی تو ازسرِنو شریانوں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ماہ و سال کی گردشیں چہرے پر گہری شکنوں کی صورت نمایاں ہونے لگیں۔ ندا جو اپنی خوبصورت باتوں کا ردِعمل دیکھنے کے لیے ٹکٹکی باندھ کر ثمر کی طرف دیکھ رہی تھی ایک دم ڈر گئی۔

''ثمر...... آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔'' وہ بدحواس ہو کر پوچھ رہی تھی۔
پہلی شادی کے شدید زخمی کی آہ و بکا دوسری بیوی کو پیار کی صدائیں لگتی ہیں۔ اگر وہ شعوری لحاظ سے خود پر قابو رکھے۔
یہ ایسی ہی منافقت بھری زندگی ہے جیسے کہ منہ سے لفظ 'آیئے' کہتے ہوئے ہاتھوں سے 'جایئے' کا اشارہ کرتے ہیں۔
''Oh Yes......''
''Absolutity All Right۔''
کبھی کبھی اچانک سر میں شدید درد کی لہر اٹھتی ہے۔ بس لمحوں کی بات ہوتی ہے۔ فوراً Remove ہو جاتی ہے۔''
''Dont Worry......'' اس نے ندا کے ہاتھ پیار سے تھام کر تسلی دی۔
''آپ نے ڈاکٹر سے Consult نہیں کیا۔ اپنا Proper چیک اپ نہیں کرایا؟'' وہ بہت ہمدردی و پیار سے پوچھنے لگی۔
پھر یہ منحوس چیک اپ پیار کے درمیان آ گیا تھا۔
ندا کے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل گئے۔
''تم تیار ہو جاؤ...... بہت بھوک لگ رہی ہے۔ نیچے چل کر کچھ کھاتے ہیں۔'' ندا کو خود بھوک لگنا شروع ہو گئی تھی۔ اچھا سا اور پسند کا کھانے پینے کے خیال سے فوراً ہی اٹھ گئی اور وارڈ روب سے کوئی پیارا سا ڈریس انتخاب کرنے لگی۔
''زندگی اتنی حسین بھی ہو جائے گی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔'' خوشی کو یوں ترس رہی تھی جیسے پیاسا بوند بوند کو ترس رہا ہو۔
''اسی سرمستی میں یہ دھیان بھی نہ آیا کہ نیک انسائی اس وقت کتنی بڑی آزمائش میں مبتلا ہے۔'' شبیر حسین کی پکاروں پر دوڑتے دوڑتے گھٹنے بول پڑے ہیں۔ ثمر آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹا آگہی سے لڑ رہا تھا۔
''آگہی جو کہ سراسر ماضی ہے...... جو کسی بھی انسان کو حال سے پرے دھکیلنے کے لیے ہر پل مستعد رہتی ہے۔
ندا حال کے لمحوں کا سواگت کر رہی تھی۔ ثمر ماضی کے نوکیلے ناخنوں سے گردن چھڑا رہا تھا۔

☆......☆......☆

ایک بات کہوں آپ سے میں اور لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں۔ میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ اپنی بچیوں سے نہ ملیں...... میں نے تو خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اولاد آخر اولاد ہوتی ہے۔
ربیعہ میچنگ کی چوڑیاں پہنتے ہوئے یاور سے مخاطب تھی۔ یاور کے ساتھ ماں کے گھر کھانے پر مدعو تھی۔ اس کی بڑی شادی شدہ بہنیں بھی آ رہی تھیں۔

وہ بہت اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔ اس کی بہنوں کو اس کی شادی پر بڑے تحفظات تھے۔
ایک شادی دو بچوں کے باپ سے شادی بہت بڑا امتحان ہوتی ہے۔ سسرال کی ذمہ داریاں اتنی بھاری نہیں ہوتیں جتنی کہ کسی کے بچے سنبھالنے کی۔
اب ان کو تو فرشتوں ہی نے بتانا تھا کہ جن بچوں کو وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ ان بچوں کے ذمے واروں کو تو ان کی فکر ہی نہیں۔
سی گرین اور آتشی کے امتزاج سے تیار ساڑھی..... جیولری، تیز میک اپ، نئی نویلی کم عمر دلہن اور وہ بھی شرما شرما کر مسکراتی ہوئی۔
مسکراتی عورت کا تصور بھی زندگی سے رخصت ہو چکا تھا۔
یاور نے خوبصورت جذبوں کی گدگدانے والی آہٹوں کے درمیان بہت پیار بھری نظروں سے ربیعہ کی طرف دیکھا۔
''تمہیں کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔ بچیاں نانی کے پاس بہت خوش ہیں اور وہ تمہاری ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہیں۔'' اس کے لہجے حاذق طبیب جیسی تسلی تھی۔
''یہ کیا بات ہوئی؟'' ربیعہ اٹھلائی۔
''آپ کی ذمہ داری میری ذمہ داری ہے۔ جب خوشیوں میں میرا حصہ ہے تو آپ کی فکروں میں بھی میرا حصہ ہوگا۔ جس کے لیے میں بڑی خوشی سے تیار ہوں۔ ربیعہ کے لہجے میں خلوص کی حلاوت تھی جس نے یاور کو درحقیقت بہت متاثر کیا۔ نئی نویلی شریک سفر دھڑکنوں میں ہم آہنگ ہونے لگی۔
''بہت شکریہ ربیعہ..... تمہارے خیالات نے مجھے بہت ہلکا پھلکا کر دیا۔'' وہ اپنی فطرت کے بوجب ممنون انداز میں گویا ہوا۔
''شکریہ..... یہ تو تکلف کی نشانی ہے..... میں اپنے اور آپ کے بیچ کچھ بھی برداشت نہیں کروں گی۔ شکریہ بھی نہیں۔'' وہ بہت قریب آ کھڑی ہوئی۔
''نئی نئی شادی کے وقت..... گلابی جذبے حاوی ہوتے ہیں۔ چاند کی سرزمین کے موسم ظاہر ہوتے ہیں۔
ستارے روشنی کے راستے رومان کی بارش کرتے ہیں۔ مور کے پاؤں جیسی حقیقتیں پردوں میں ہو جاتی ہیں۔ جس کو شاعروں نے دن عید اور رات شب برات کہا ہے۔
''میں سوچ رہی تھی اسی کی طرف جاتے جاتے تھوڑی دیر کے لیے بچیوں سے بھی ملتے چلیں..... ان کا بھی تو اب مجھ سے تعارف ہونا چاہیے۔ آہستہ آہستہ مانوس ہو جائیں گی تو پھر خود ہی جا کر ان کو لے آؤں گی۔''
ربیعہ آج کی تاریخ میں خلوص و محبت کا ایوارڈ لینے کے لیے تل گئی تھی۔
''بچیاں..... گھر لانے کی بات کر رہی تھی۔
یاور پیار کے زبردست اظہار پر بجائے پُرسکون ہونے کے بری طرح الجھ گیا۔
''ابھی وہاں جانا مناسب نہیں ربیعہ..... کسی دن آرام سے چلیں گے تاکہ ان کے ساتھ کچھ وقت تو

گزاریں.....؟

''اور......'' یاور نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اور......؟'' ربیعہ اپنا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے آئینے کی طرف بڑھی تھی۔ راہ میں رُک گئی اور یہ کہ ابھی مرحومہ کا غم تازہ ہے۔ مجھے اپنی نئی بیوی کے ساتھ دیکھ کر اپنی بیٹی کو یاد کرکے اور غم زدہ ہوجائیں گے۔''

''یہ تو آپ واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ بس ذہن میں بچیاں ہی گھوم رہی تھیں۔''

''ٹھیک ہے پھر..... کسی دن سادہ سے کپڑے پہن کر آپ کے ساتھ چلوں گی۔ آپ نے دوسری شادی کرکے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اور میں مجرم نہیں ہوں جو اُن سے منہ چھپاؤں۔ ہاں اگر ان کی بیٹی کی زندگی میں آپ دوسری شادی کرتے تو یقیناً اُن کا دل دکھتا۔''

ربیعہ بہت ذہین تھی۔ اس نے آن واحد میں یاور کو ایک احساسِ جرم سے آزاد کرادیا تھا۔ ورنہ ابھی تک تو وہ یہ محسوس کررہا تھا کہ جیسے اس کی دوسری شادی کا سن کر اس کی پہلی سسرال اسے لعن طعن کرے گی۔ وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہوگیا اور تشکر بھری نظروں سے ربیعہ کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

''ارے ہم دونوں کیا..... دیگ بھر کھانا کھالیتے..... بیٹی داماد کو کھانے پر بلالیا..... ہم دوپہر کا باسی کھائیں۔''

''کہہ رہی تھی امی جان دوپہر کا دم کا قیمہ رکھا ہے۔ شامی کباب بھی ہیں۔ پاپا سے نان منگوالیجیے گا۔'' فردوس نے نوبیاہتا بہو کی نقل اتارتے ہوئے جل بھن کر کہا۔

''ارے تو آئی کس گھر سے ہے..... ایک وقت پکتا ہوگا۔ تین وقت کھاتے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ مہنگائی کا زمانہ ہے۔ جو تیس ہزار کماتا ہے آج کل وہ بھی غریب ہے۔ دس ہزار تو یوٹیلیٹی بلوں میں چلے جاتے ہیں۔ اب بیس ہزار میں بچوں کی تعلیم، ہاسپٹل، روز کا کھانا پینا..... مہمان داری، لینا دینا..... بچوں کے گرمی سردی کے کپڑے.....''

''آپ تو جنت میں بیٹھی ہیں۔ چالیس ہزار پنشن آجاتی ہے۔ چالیس ہزار دکانوں کا کرایہ۔ اللہ رحم کرے ابھی تک تو ایک AC سارا دن چلتا نہیں، اب بہو بیگم چوبیس گھنٹے AC چلائیں گی۔ یاور پچیس ہزار آپ کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔ دو چار مہینے بعد معذرت کرلے گا۔ دبا کے کپڑے دھلیں گے۔ استریاں ہوں گی۔ اسپلٹ چلیں گے۔ ہوٹل بازی ہوگی۔ سیر تفریحاں، CNG، پیٹرول کا خرچہ.....''

''بھئی نئی نئی شادی ہے۔ خرچے پر خرچہ..... تیار رہو۔'' حامد حسین کا تو باسی کھانا کھانے کی خبر سن کر ہی موڈ خراب ہوگیا تھا۔

''ہر مہینے بیگم کے اکاؤنٹ میں اسی ہزار روپیہ بھی ڈلواؤ اور باسی کھانا کھاؤ۔''

''چلیں اٹھیں..... تیار ہوجائیں.....'' فردوس نے اٹھتے ہوئے یوں کہا جیسے حامد حسین کہیں جانے پر تلے بیٹھے تھے۔

''ہیں......؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ بہو کے ماں باپ نے صرف بیٹی داماد کو کھانے پر بلایا ہے؟'' حامد حسین ایک جھٹکے سے سچ مچ اٹھ بیٹھے۔

''بلاتے رہیں ہم بھی ان کے کھانے کے بھوکے نہیں ہیں۔ ہم بھی پزا ہٹ جا کر پزا اور Wings کھاتے ہیں۔''

''ان خودغرضوں کے لیے کیا پیسہ جوڑتے رہیں۔ اپنا پیسہ اپنے آپ پر بھی تو خرچ کرنا چاہیے۔''

فردوس کی بات میں اتنا وزن تھا کہ حامد حسین ہلکا جواب دینے کے بجائے واقعی بستر سے اتر گئے۔ گرم گرم پزا...... وہ مؤدب ویٹر کے ہاتھوں جس کو Tip نہ بھی دیتے تو بھی مسکرا کر خدا حافظ کہتا۔

''ہونہہ...... بہو کی ماں نے کیا پکا لیا ہوگا۔ برائلر مرغی کا قورمہ بریانی...... بکرے کا گوشت بقرعید پر ہی پکتا ہوگا۔''

خرچہ کرنے کو تیار تو ہو گئے تھے مگر خرچے سے ہونے والی فطری تکلیف کو تو خون سے نچوڑ کر الگ نہیں کر سکتے تھے۔

''ویزہ کارڈ یاد سے رکھ لینا...... میرے پاس کیش نہیں ہے۔'' وہ وارڈ روب کی طرف جاتے ہوئے بیگم کو تاکید کر رہے تھے۔

بڑی مشکل سے تو بیگم سے کچھ چھپا پاتے تھے وہ بھی بہو کی 'نااہلیت' کی وجہ سے ٹھکانے لگا دیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

ویزہ کارڈ پر تو وہ ٹو پرسینٹ ایکسٹرا چارج کرتے ہیں۔ راستے میں ATM سے لے لیں گے۔ فالتو پیسے کیوں دیں؟'' فردوس نے تنک کر کہا۔

''پزا کھانا بھی 'سول سوٹ' بن گیا تھا۔''

لوٹ مار کے دھندے ہیں...... ٹو پرسینٹ بھی دو، ٹیکس بھی دو، ٹپ بھی دو......'' حامد حسین بڑبڑا رہے تھے۔

''ارے اپنے پرس میں دیکھ لو...... تین چار ہزار تو پڑے ہوں گے۔''

''دو ہزار پکڑا کر تین ہزار کا سودا منگوا لیتی ہو......'' یہ کہہ کر چھپاک سے واش روم میں گھس گئے۔ دبا ہوا شکوہ نکال کر بیگم کا سامنا کرنے کی تاب نہ تھی۔

☆......☆......☆

گھر واپسی تک رات کے اندھیرے اُتر آئے تھے۔ ڈرائیو وہ بھی جگہ جگہ جام ٹریفک میں...... چمن تھک کر چور ہو گئی تھی۔ ماہ پارہ برابر والی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ مہ وش بیک سیٹ پر......

گھر پہنچ کر سوتی ہوئی بچیوں کو گاڑی سے اتارنے کا مرحلہ...... پھر شاپرز کے لیے اندر سے پورچ تک کا دوسرا چکر...... عطیہ بیگم اور مشکور احمد کا بیڈروم فرسٹ فلور پر تھا۔ وسیع ٹیرس کی وجہ سے مشکور احمد نے بیڈ روم اوپر ہی رکھا تھا۔ بیڈروم سے نکل کر چار قدم پر ٹیرس تھا۔ وہاں آ کر کھلی ہوا میں بیٹھ جاتے تھے۔

اس لیے دونوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ چمن گھر کب واپس آئی۔ گیٹ کی Key اس کے پاس ہوتی تھی۔ کال بیل بجانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

آج اس نے بچیوں کو دل کھول کر شاپنگ کرائی تھی۔ جو انہوں نے کہا خرید کر دیا۔ ان کا فیورٹ ملک شیک، فالودہ آئسکریم بھی کھلایا۔ ان کے چہروں پر حقیقی خوشی کی چمک نے وقتی طور پر اسے سارے غموں سے دور کر دیا تھا۔

مہ پارہ نے اپنے سائز کی ڈول گفٹ دینے کے لیے پسند کی۔ جس کی مالیت پانچ ہزار روپے تھی اس وقت وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ اتنی تو راہ ورسم بھی نہیں...... پہلی بار میں اتنا مہنگا گفٹ لے یا نہ لے...... مگر مہ پارہ بری طرح مچل گئی کی یہی ڈول لینی ہے...... سو لینا پڑی......

دونوں بچیوں نے ایک ایک لمحہ خالہ کے ساتھ انجوائے کیا تھا۔ سندباد میں الیکٹرک جھولوں پر بھی بیٹھنے کی فرمائش کی جو خالہ نے پوری کی۔

بچیوں کے چہروں پر پھیلی مسکراہٹوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کیا ان بچیوں کو خوشی دینے کے لیے اسے عظیم دکھوں سے گزرنا تھا۔

جن کے لیے آٹھ پہر ہڈیوں میں تھکن اتاری۔ وہ تو مسکرائے بھی یوں گویا احسان کر رہے ہوں۔

اور یہ بچیاں تو یوں احسان مند ہوئیں کہ خالہ کی دیوانی ہو گئیں۔ مہ وش تو چلتے پھرتے اس کا ہاتھ چوم لیتی تھی۔ اسے اپنی خالہ اتنی پیاری لگتی تھی۔

''شاید...... میری زندگی کا مقصد ہی یہ ہے۔''

تھکاوٹ اس انتہا پر تھی جس پر شوہر بیوی سے چاند کل خریدنے کا وعدہ کرتا ہے۔

بچیوں کو بیڈ پر لٹا کر وہ خود بھی اس خیال سے لیٹ گئی کہ ذرا سا آرام کر کے اطراف کا جائزہ لے گی۔ مگر کس وقت آنکھ لگی اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ جیسے صدیوں کے رت جگوں کے بعد نیند مہربان ہوئی تھی۔

دوسروں کو خوشی دینے کا عمل گویا سارے بوجھ اُتار دیتا ہے۔

☆......☆......☆

ندا کو اٹکھیلیاں سوجھ رہی تھیں۔ ثمر کو خمارِ گندم چڑھ رہا تھا۔

''بور کر رہے ہیں؟'' ندا نے بڑے ناز سے اٹھلا کر ثمر کو کہنی ماری۔ وہ دوسری بیوی جس کی اپنی پہلی شادی ہو اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ فریقِ ثانی کے بہت سے ارمان نکل چکے ہیں۔

''ہاں بس...... پتہ نہیں کیوں بہت زور سے نیند آ رہی ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں گی؟ مجھے تو نیند نہیں آ رہی...... گھر میں ہوتی تو گھر کا کوئی کام ہی کر لیتی......'' ندا نے کوفت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں سو رہا ہوں۔ ایسا کرو تم مجھے دیکھتی رہو۔'' ثمر نے شرارت کے پردے میں رعایت لینے کی کوشش کی۔

''اب تو زندگی بھر ہی آپ کو دیکھنا ہے۔ کوئی اور کام بتائیں۔'' ندا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آؤ...... میں تمہیں سکھاتا ہوں جب نیند نہ آئے تو کیسے سونے کی کوشش کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ثمر نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

عین اسی لمحے ندا کے سیل پر رنگ ہوئی تھی۔ ثمر کو یوں محسوس ہوا گویا کہ 'طبلِ نجات' بجا ہو۔ مگر فکر بھی

ہوئی کہ ندا کو اس وقت کس نے یاد کیا ہے۔
ندا نے لحہ بھر کی تاخیر کے بغیر سیل سائیڈ ٹیبل سے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا تھا۔
''اوہ...... نرگس آنٹی کی کال آ رہی ہے۔''
''اللہ رحم کرے...... ثمر کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔ دھیان فوراً شبیر حسین کی طرف گیا تھا۔
''جی آنٹی السلام علیکم......!'' ندا نے کال ریسیو کی تھی۔
''جی ...... ہاسپٹل سے...... کون سا ہاسپٹل ہے......'' ندا لگاتار سوال کر رہی تھی۔ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔
ثمر اب اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ضمیر نے ایک سن کی آواز سے کوڑا برسایا۔ وہ بوڑھا بیمار اب نرگس کی نہیں اس کی ذمہ داری تھا۔
جب آٹھ پہر نفس حاوی ہو جائے تو اسی طرح کی مجرمانہ غفلتیں سرزد ہوتی ہیں۔ انتقام' غصہ' کینہ' نفسانی سرور' عورت کا نشہ......''
نفس ہی نفس...... روح تو کہیں گھٹنوں میں سر دیے بے اعتنائی و بے حسی پر اشک بہار ہی ہوتی ہے۔
''میں آتی ہوں آنٹی......'' ندا نے نرگس سے تفصیلات سن کر کہا اور سیل رکھ کر بیڈ سے اترنے لگی۔
''ارے کہاں جا رہی ہو؟ میں فون کر کے کیب منگوا تا ہوں۔''
''میں چینج کر رہی ہوں آپ فون کریں اور کہیں گاڑی جلدی چاہیے۔'' ندا پر بدحواسی کے ساتھ ساتھ عجلت بھی طاری تھی۔
''کہاں کی نیند...... کیسی نیند......'' ثمر نے بھی بستر چھوڑ دیا۔
''آنٹی کہہ رہی ہیں...... نانا جان کی حالت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے دعا کرنے کو کہہ دیا ہے۔ ندا نے وارڈ روب کھولتے ہوئے...... اسی طرح عجلت کے انداز میں کہا۔
''ہمت سے کام لو ندا......'' نانا جان کے ساتھ یہ پہلی بار تو نہیں ہوا۔
''پہلے بھی کئی مرتبہ وہ اسی حالت میں ہاسپٹل پہنچ چکے ہیں۔'' ثمر نے تسلی دی۔ ہاسپٹل سے آ کر دوا کہاں کھاتے تھے۔ میں پیپسی اور ٹینگ میں ملا ملا کر دیتی تھی۔ آنٹی کو بھی یہی ترکیب بتا دی تھی۔
وہ ڈریس نکال کر پٹ بند کرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔ خون کا رشتہ تھا جو روح میں جذب ہوتا ہے۔ اور روحانی کیفیات کسی کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔
شاید میری شادی پر نانا جان کو بہت زیادہ دکھ ہوا ہے۔ اسی لیے ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ ندا اپنے فطری پھکڑپن سے گویا ہوئی۔
''تمہاری تو غالباً یہ پہلی شادی ہے؟'' ثمر نے اپنی سلیپنگ شرٹ اتارتے ہوئے سوال کیا۔
نائٹی کے بٹن کھولتے کھولتے ندا کے ہاتھوں کی گردش رُک گئی۔ انتہائی تعجب سے گویا ہوئی۔
''ہیں......؟''
''آپ کو کنفرم نہیں ہے کہ یہ میری پہلی شادی ہے۔''
بھئی تم کہہ رہی ہوں ناں نانا جان کو تمہاری شادی پر شدید صدمہ ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہ ہاسپٹل پہنچ

گئے۔

اس سے پہلے کس وجہ سے ہاسپٹل پہنچے تھے۔

اگر تمہاری شادی نہ ہوتی تو وہ تمہارے بڑھاپے تک تو ضرور زندہ رہتے۔ ثمر نے اس کا "Guilt" مٹانے کی غرض سے یہ جملہ کہا تھا۔

"ہائے اللہ..... کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" ندا مزید ہونق ہوگئی۔ ثمر کیب کے لیے اب نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اس کی

شدید تھکاوٹ کے باعث وہ جس زاویے سے لیٹی تھی کئی گھنٹے اسی انداز میں سوتی رہی۔ ہاتھ سر کے نیچے دبا ہوا تھا اور دبے دبے سن ہو رہا تھا۔ اور اسی وجہ سے یکدم نیند ٹوٹی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کہاں ہے؟"

چند لمحے پلکیں جھپکتی رہی پھر خود بخود نگاہ سوئی ہوئی بچیوں پر گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی تمام حواس جاگ پڑے۔

"حد ہوگئی..... امی نے ضرور آ کر دیکھا ہوگا۔" ان کے تو ویسے بھی فون پر فون آنا شروع ہو گئے تھے۔

"اتنی گہری نیند لگ گئی۔ کمال ہے۔ لیٹتے ہی ہوش نہ رہا۔"

وہ سوچنے لگی۔ چند لمحے خالی الذہن چھت کی طرف تکتی رہی۔ اسے وہ چھت یاد آ گئی۔ جہاں سونے کا بہت اہتمام ہوتا تھا اور چھت پر لگے نیلے شیشے چاروں طرف ہلکی نیلی روشنیاں بکھیر دیتے تھے۔ بیڈ روم کی چھت کا ڈیزائن اس نے بہت عرق ریزی کے بعد منتخب کیا تھا اور خرچہ بھی ٹھیک ٹھاک آیا تھا۔

جب اس نے چھت کا ڈیزائن منتخب کرنے کے بعد ثمر کو اخراجات کا تخمینہ بتایا تو ثمر نے بڑی شان بے نیازی سے کہا تھا۔

"کماتے کس کے لیے ہیں بیگم صاحبہ..... اپنے سب شوق پورے کرو۔"

حادثاتی طور پر جدا ہونے والے شریک سفر کے ملبوس کی مہک بالکل پاس سے آنے لگی۔

تصور اتنا پختہ تھا گویا ہاتھ بڑھا کر ثمر کو چھو لے گی۔

اتنے دن ہوگئے۔ گئے دنوں کے کسی طاقتور لمحے نے کوئی جذبہ بیدار نہیں کیا۔

پھر اسے یاد آیا۔ ثمر تو اس کے باپ کو ٹکا سا جواب دے کر مایوس لوٹا چکا ہے۔ گویا..... کہانی ختم ہوگئی۔

"ایسے کیسے ختم ہوگئی؟ بھنورے نے پھول کی پتی پتی سے رس پیا تھا۔

پھول کو پتی پتی بکھیرنے کے لیے اپنا ہر طرح کا استحقاق استعمال کیا تھا۔ اس کی نیندوں پر حق جتایا تھا۔ تھکن سے ٹوٹتے جسم کو 'بازیچۂ اطفال' جانا تھا۔

سب سے بڑھ کر اس کی زندگی کے پانچ قیمتی سال..... جو اس کی عمر کا سب سے سنہرا دور تھا وہ اپنے نام کیے تھے۔ روحانی مسرتوں کو کاغذ کے نوٹوں کے عوض خریدنے کی نیت رکھی تھی۔

"اور..... اب..... اب..... نہ وہ پھول ہے نہ کلی..... مزار پر پڑے ہوئے پھولوں کی خشک پتیاں

معمولی جھونکوں سے بکھر گئی تھیں۔
اتنا خود غرض انسان...... جہازی سائز بڑے سے بیڈ کا دوسرا کنارہ خالی دیکھ کر بھی اسے کچھ نہیں ہوتا۔ غصہ چڑھتا ہے تو اترتا بھی ہے۔
شریانوں میں جوار بھاٹا سا اُٹھا۔ جیسے سمندر کی شوریدہ سر لہروں کے سامنے ہر طرح کا شور دب جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح...... ساری احتیاطیں احتجاج کے شور میں دب گئیں۔ جی بے قرار ہو گیا۔ جو ہونا طے ہے وہ تو ہو چکا۔

ایک بار اسے کھری کھری سنا ہی دے۔ دل ٹھنڈا ہو...... ایک بار تو سچ کے نشتر اس کے کلیجے میں اتارے...... ایک بار تو الزام کو جرم کا لبادہ پہنائے۔ گالی کیا ہوتی ہے۔ پتہ تو چلنا چاہیے۔ پڑھی لکھی باشعور عورت کو اس تھان پر بندھی گائے سمجھا ہے۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ ماں کی صابرہ و شاکرہ پر کڑا وقت آ گیا۔ احساسِ زیاں کے جھکڑ قدم اُکھاڑنے لگے۔
اس نے بیگ سے سیل فون نکالا اور ثمر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

☆......☆......☆

I.C.U میں شبیر حسین زندگی کا آخری معرکہ لڑ رہے تھے۔ ندا کو دلاسہ دے کر ثمر ڈاکٹر سے حقیقت جاننے کے لیے اُن کے روم میں جا چکا تھا۔
ندا آئی سی یو کے سامنے بے قراری سے ٹہلتے ٹہلتے...... ذرا کی ذرا رک کر مشینوں کے رحم و کرم پر پڑے نانا کو بھی شیشے کے پار جھانک لیتی تھی۔ بار بار آنسو لڑیوں کی صورت رخساروں پر لڑھک آتے تھے۔
معاً کندھے پر لٹکے شولڈر بیگ میں پڑے سیل کی وائبریشن اسے یوں محسوس ہوئی جیسے آنے والی ٹرین کی دھمک اسٹیشن پر کھڑے مسافروں کو پاؤں تلے محسوس ہوتی ہے۔
ثمر کا موبائل اور Key Ring اس کے بیگ میں تھے۔ اور یہ احتیاط کے ضمن میں تھا۔ مبادا ہاسپٹل کی بھاگ دوڑ میں چیزیں نہ گنوا بیٹھے۔ یوں بھی ریسیپشن پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے کہ 'اپنی قیمتی اشیاء کی حفاظت خود کیجیے۔ انتظامیہ آپ کے کسی بھی نقصان کی ذمہ دار نہیں۔'
ندا نے بیگ میں جھانکا تو ثمر کے سیل کی اسکرین چمک رہی تھی۔ گویا کوئی کال آ رہی تھی۔
''ثمر کی امی جان ہی ہوں گی۔'' اس نے پھر بھی دیکھنے کے لیے سیل فون نکال لیا۔ اسکرین پر صرف نمبر تھا کالر کا نام نہیں تھا۔

جبکہ اسے پتہ تھا کہ ماں باپ زندہ ہوں تو بچوں کے سیل میں امی ابو کے نام سے نمبر محفوظ ہوتے ہیں۔
ندا نے تذبذب کی کیفیت میں کال وصول کر لی۔
''ہیلو......؟'' اس کے انداز میں بہت احتیاط تھی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ ثمر کی امی کسی اور نمبر سے کال نہ کر رہی ہوں۔
ہیلو کے جواب میں خاموشی تھی۔ رابطہ بھی بحال تھا۔ شاید اُس کی آواز نہیں جا رہی۔

''ہیلو... ہیلو...'' اس نے بلند آواز سے تین مرتبہ ہیلو کہا اور فوراً ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔ ندا سیل کان سے ہٹا کر اسکرین کی طرف گھورنے لگی۔

چمن کی نظریں بے اختیار وال کلاک کی طرف اُٹھ گئیں۔ رات کے ڈھائی بجے کا عمل تھا۔

اس نے عجب طرح کی بدحواسی میں ڈائل نمبر چیک کیا۔ آیا غلطی تو نہیں ہوگئی اس نے ثمر ہی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اسکرین پر واضح طور پر ثمر کا نام نظر آرہا تھا۔

''یہ اتنی رات کو ثمر کا نمبر کس نے اٹینڈ کیا۔ نہ یہ افشاں کی آواز تھی نہ ہی ای جان کی.....''

''رات کے ڈھائی بجے..... ایک لڑکی آواز..... اس کے پاس ثمر کا سیل ہے اگر ہے تو کیوں.....؟''

عجب طرح کی وحشت سر ہوگئی کہ کچھ کرو۔ پتہ لگاؤ' اندیشہ عظیم ہو تو اس سے جان چھڑانے کے لیے لمحوں میں کچھ کرنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اس نے فوراً ہی لینڈ لائن نمبر ملایا تھا۔

ڈوبنے والے کی آخری ترکیب میں ساری توانائی ضم ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے دوڑ پڑا تھا۔

دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔ وہ مستعد ہوگئی۔ اس کی چھٹی حس جاگ کر ساتویں کو ڈھونڈ رہی تھی۔

''کون ہے؟ کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ جلدی سے سراغ مل جائے۔ رنگ جاتی رہی مگر کال وصول نہیں کی گئی۔

وہ دیوانہ وار ری ڈائل کر رہی تھی۔ آٹھویں کال پر بالآخر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ بانو آپا کی نیند بھری آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیلو.....؟'' چمن حیرت زدہ سی بیٹھی رہ گئی۔ فون سیٹ تو ثمر کے بیڈ روم میں بھی ہے۔ بانو آپا کو تو فون سننے کے لیے لاؤنج میں آنا پڑا ہے۔ اتنی Rings گئیں۔ ثمر نے فون کیوں اٹینڈ نہیں کیا؟''

''بے غیرت رانگ نمبر ملاتے ہوئے یہ نہیں سوچتے ان کی اماں کی عمر کی عورت بھی فون سن سکتی ہے۔''

بانو آپا نیند میں بڑبڑائیں۔ پھر بلند آواز سے بولیں۔

''مرگئی تمہاری معشوقہ..... اماں بیٹھی ہے تمہاری..... یا وہ بھر گولیاں پھانک کر.....'' اس کے ساتھ ہی ریسیور بری طرح پٹخ دیا گیا۔ سیل فون لڑکی کے پاس ہے۔ لینڈ لائن نمبر بانو آپا اٹینڈ کر رہی ہیں۔

''ثمر کہاں ہے؟'' حیرت ابد کنارے پر جا پہنچی۔

☆......☆......☆

فجر کی پہلی اذان سے چند منٹ پہلے شبیر حسین نے داعیٔ اجل کو بالآخر لبیک کہہ ہی دیا۔ کب تک عزرائیل کا بڑھا ہاتھ جھٹکتے رہتے۔

ثمر کا سیل بیگ میں رکھتے ہی ایک افراتفری مچ گئی تھی۔ آئی سی یو سے یکے بعد دیگرے دو میتیں نکلیں تو ندا کے حواس ویسے ہی جواب دے گئے۔ اسے اپنا ہوش نہ رہا ثمر کو کیونکر بتاتی کہ اس کے سیل پر کوئی رانگ کال آگئی تھی۔

اتنی معمولی سی بات اس بحرانی وقت میں کیا یاد رہتی۔

اور اب تو صورتِ حال ہی یکسر تبدیل ہوگئی تھی۔
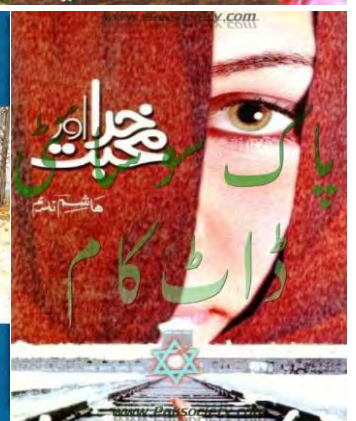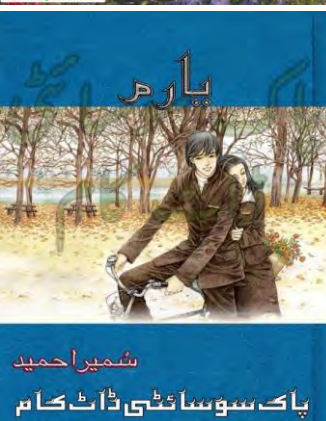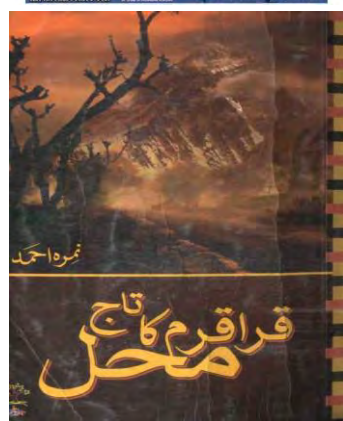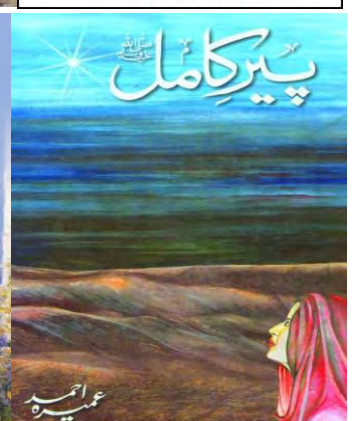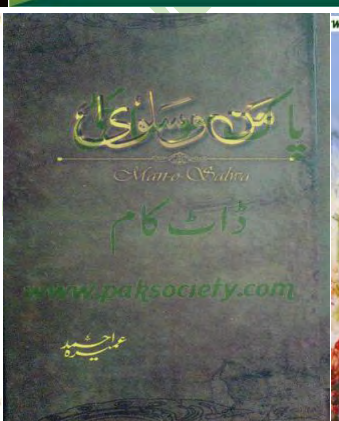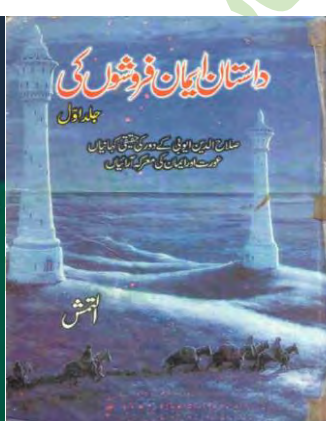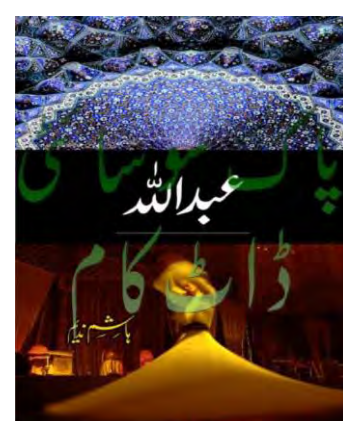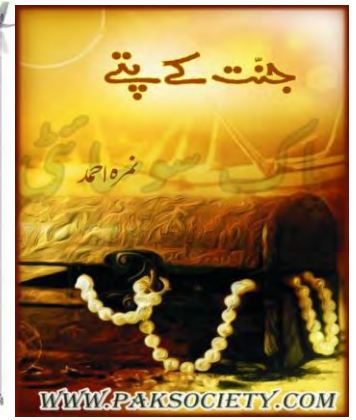
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ثمر اور ندا کے ہاسپٹل پہنچنے کے بعد نرس آرام کرنے گھر چلی گئی تھیں۔
شبیر حسین ابدی نیند سو گئے مگر وہ سرخ رو ہو گئیں۔ ندا کی ماں سے دوستی کی لاج رہ گئی۔ ندا نے انہیں فون پر اطلاع دی۔ اس وقت وہ بری طرح رو رہی تھی۔ ثمر کو بھاگ دوڑ لگی تھی۔ ایمبولینس کا انتظام...... ہاسپٹل کے واجبات کی ادائیگی...... تدفین کے انتظامات...... اس بھاگ دوڑ میں دونوں وقتی طور پر ایک دوسرے سے گم ہو گئے۔ اس نے مصروفیات کے درمیان ندا کو تسلی بھی دی تو یوں جیسے کال بیل سے السلام علیکم کی ریکارڈنگ سنائی دے رہی ہو۔

جس وقت میت گھر پہنچی تو چاروں اور سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میت پہنچتے ہی اہلِ محلہ سے گھر بھر گیا۔ جس گھر میں کسی نے زندگی کے پچاس پچپن برس گزارے ہوں اُسے تو آسمان پر اُڑنے والے پرندے بھی دوستانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یوں بھی اہلِ محلہ کو شبیر حسین سے دلی ہمدردی تھی۔ کہ بیٹے نے ڈالر کمانے کے چکر میں باپ کو بڑھاپے میں اکیلا چھوڑ دیا۔

گھر پہنچ کر گویا ثمر پر کوئی ذمہ داری نہ رہی۔ محلے کے لوگ ہر کام میں آگے آگے نظر آ رہے تھے۔ ندا نے ایک کونہ سنبھال لیا تھا۔ اور تعزیت وصول کر رہی تھی۔ کسی سے لپٹ کر رو تی تھی کسی کو دیکھ کر۔

سنا نوے فیصد حاضرین کا خیال تھا کہ اللہ نے شبیر حسین کی مشکل آسان کر دی۔

☆......☆......☆

شام چھ بجے تقریب کا وقت تھا۔ مگر چمن ٹریفک کی صورتِ حال اور بچیوں کی بے چینی و جوش و خروش دیکھ کر گھر سے جلدی نکل گئی تھی۔

رات ڈھائی بجے جاگنے کے بعد وہ سو نہ سکی تھی۔ ذہن اس آواز سے ہٹتا نہیں تھا۔ وقفے وقفے سے کوئی چلا کر ہیلو ہیلو کہتا تھا۔

اگر اس کا اپنا کوئی ذاتی کام ہوتا تو شاید وہ کسی قیمت پر گھر سے نہ نکلتی۔ لاکھوں کی تجارت خطرے میں ڈال دیتی۔ مگر سامنے دو معصوم بچیاں تھیں۔ جو اپنی خوشی کے لیے اس پر انحصار کرتی تھیں۔

اس نے گرے شیفون کی پلین ساڑھی زیب تن کی اور لپ اسٹک اس کا کل میک اپ ٹھہری۔ ہلکی مہک سے طبیعت کی گراوٹ دور کرنے کی کوشش کی۔ بالوں کی آرائش کرنے کے بجائے سمیٹ کر کیچر میں قید کر لیا۔

مہ پارہ گفٹ میں دی جانے والی ڈول اٹھائے اٹھائے اِدھر سے اُدھر ٹہل کر خالہ کے تیار ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

بڑا سا آنچل شانے پر پھیلا کر وہ عطیہ بیگم کے پاس چلی آئی۔

''ٹھیک ہے امی...... پھر میں نکلتی ہوں...... واپسی تک رات ہو جائے گی۔ آپ کھانا کھا کر سو جایئے گا۔''

''جب تک گھر نہیں آؤ گی نیند کہاں آئے گی۔ بیٹا...... میں تو کل رات بھی تمہارے آنے کے بعد ہی بستر پر لیٹی تھی۔ گاڑی کی آواز سن کر سوچا کہ تم بچیوں کو سلا کر میرے پاس آؤ گی۔ جب نہیں آئیں تو مجھے

پریشانی ہوئی جا کر دیکھا تو تم بے خبر سو رہی تھیں۔"

عطیہ بیگم نے دنوں بعد بیٹی کو مناسب حلیے میں دیکھا تو قدرے پُرسکون ہو گئیں۔ پھر بیٹی رات کو سکون سے سوتی بھی نظر آئی تھی۔

شاید اس نے خود کو آخر کار سمجھا لیا ہے۔ یہ خیال مضبوط ہو رہا تھا۔ اب ان کو کیا خبر کہ آدھی رات کے بعد برہن ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی ہے۔

"جی امی..... کل بہت تھک گئی تھی۔ جگہ جگہ رش ملا۔ لگتا تھا سارا شہر سڑکوں پر تھا۔" وہ جبراً مسکرائی۔ زندگی جبر ہی تو بن کر رہ گئی تھی۔

"ہاں بیٹا..... گاڑی دھیان سے چلانا..... حفاظت تو بہر حال اللہ ہی کی ہے۔"

"جی امی خدا حافظ....." وہ یہ کہہ کر بچیوں کے ہمراہ پورچ میں آ گئی۔ ہر اٹھتا قدم کسی ہیلو کی سنگت میں رواں تھا۔

جلتے خیمے کی راکھ اڑ اڑ کر آنکھوں میں آ رہی تھی۔ بار بار منظر دھندلا تا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر علی عثمان کے چھوٹے سے نو تعمیر شدہ ماڈرن طرز کے بنگلے میں پہنچنے والے وہ پہلے مہمان تھے۔ انٹر کام پر مطلع کیا تو ڈاکٹر علی عثمان خود استقبال کے لیے آ گئے۔ اور بچیوں کو بہت اچھی طرح تیار دیکھ کر بے پناہ خوش نظر آئے۔ سر میں آنچل سنبھالتی چمن کو بھی غیر ارادی طور پر بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"واہ بھئی واہ..... وقت کی قدر کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔"

وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ ان مہمانوں نے انتظار کی اذیت میں مبتلا نہیں کیا۔ پھر وہ تینوں کو لے کر اندر چلے۔

"آیئے..... ٹینا بہت شدت سے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔" وہ چلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ وہ ان کو لیے لاؤنج میں پہنچے جہاں ایک جوان لڑکی وہیل چیئر پر بیٹھی بہت دلچسپی سے مہ پارہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو اپنے سائز کی گڑیا اٹھائے بمشکل چل پا رہی تھی۔

"یہ میری سسٹر ٹینا..... اور ٹینا یہ آپ کی New فرینڈز..... مہ پارہ اینڈ مہ وش....."

ٹینا نے وفورِ مسرت سے زور زور سے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ مہ وش اور مہ پارہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ اتنی بڑی سی فرینڈ کا تو وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

چمن اپنی جگہ ساکت و صامت بحیرۂ حیرت میں غوطہ زن تھی۔

"بھائی جان..... یہ ڈول میرے لیے لائی ہیں۔ اوہ..... Cute..... کتنی پیاری ڈول ہے۔ میں اسے بیڈ پر اپنے ساتھ سلاؤں گی۔" ٹینا کی توجہ اب صرف ڈول پر مرکوز ہو چکی تھی۔

دونوں بچیاں چمن کے ساتھ چپک گئی تھیں۔ اور سہمی سہمی نظروں سے ٹینا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

ایک قیامت خیز دوشیزہ کا سراپا..... انداز پانچ سال کی بچی کا.....

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

شادی کے بعد سارہ نے آنے والی اپنی پہلی سالگرہ پر بڑا اہتمام کیا تھا۔ سارے خاندان والوں اور دوستوں کو انوائٹ کیا تھا۔ بہت زبردست ساؤنڈ ارینج کیا تھا۔ اپنے لیے خوبصورت لباس ڈیزائن کیا تھا وہ بہت زیادہ ایکسائٹڈ تھی۔ شادی کے فقط......

گھڑی نے رات بارہ کا گھنٹا بجایا جب وہ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اندر سناٹے کا راج تھا۔ اس نے حسب معمول کوٹ اُتار کر لاؤنج میں رکھے صوفے پر پھینکا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بیڈروم میں داخل ہو گیا۔ وہاں بھی مکمل تاریکی تھی۔

''ہیلو سارہ کیا تم سو چکی ہو؟'' جواب میں خاموشی تھی۔ اس نے زیرو پاور کا بلب آن کیا تو کمرہ نیلگوں روشنی میں نہا گیا۔ مکمل تاریکی کے بعد ہلکی ہلکی روشنی ایسی لگ رہی تھی۔ جیسے چاندنی چھٹکی ہوئی ہو۔ خوابناک ماحول اور تھکاوٹ اس کے حواسوں پر سوار ہونے لگے۔ اس نے بمشکل جوتے اتارے اور لباس تبدیل کیے بغیر بستر میں گھس گیا۔

نیند بہت بڑی نعمت ہے۔ ہر دکھ اور ہر تکلیف کا سب سے بڑا قدرتی علاج...... علاج یا فرار...... سونے سے پہلے یہ اُس کے دن کا آخری خیال تھا۔

☆......☆......☆

''بہت بری بات ہے سارہ...... میں آج پھر لیٹ ہو گیا۔'' موبائل کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی اسے ہوش کی دنیا میں لائی تو اُس پر انکشاف ہوا کہ گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی ہے۔ اس کے پاس تیار ہو کر نکلنے اور دفتر پہنچنے کے لیے فقط آدھا گھنٹا تھا۔ وہ چھلانگ مار کے بستر سے نکل آیا مگر بیوی سے شکایت کرنا نہیں بھولا تھا۔

جلدی جلدی تیار ہونے کے بعد اس نے صوفے پر پڑا ہوا کوٹ اٹھایا اور تقریباً دوڑتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ اسے سارہ پر غصہ آ رہا تھا۔ سارہ کی عدم توجہی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ حالانکہ اسے غصہ سارہ کے اوپر نہیں بلکہ اپنے اوپر آنا چاہیے تھا۔ نوکری وہ خود کر رہا تھا سارہ نہیں۔

پرائیویٹ جاب تھی، ہینڈسم پیکیج، سہولتیں اور عزت...... یہ سب کچھ اسے اپنے وقت اور محنت ہی کے عوض حاصل تھا جو وہ اس ادارے کو دے رہا تھا۔ اپنا وقت اور کوشش...... کچھ بھی حاصل کرنے کے لیے یہی دو چیزیں ہیں جو انسان کسی کو پیش کر سکتا ہے۔ محبت جیسی نظر نہ آنے والی چیز پر اکثر لوگ یقین نہیں رکھتے۔ کم از کم سعد افتخار کی یہی سوچ تھی۔

"آج سارہ کی برتھ ڈے تھی..... اوہ چوبیس جون....." اسے دفتر میں آدھا دن گزار کے ایکدم یاد آیا۔

وہ آج پورے ستائیس برس کی ہونے والی ہے۔ستائیس یا اٹھائیس اسے صحیح طرح سے یاد نہیں آیا۔البتہ شادی کے بعد آنے والی اس کی یہ تیسری سالگرہ تھی۔ سارہ کو سالگرہ منانے اور ڈیز سیلیبریٹ کرنے کا ضرورت سے زیادہ شوق تھا۔ مدرز ڈے، فادرز ڈے، ویلنٹائن ڈے..... اپنی سالگرہ، اس کی سالگرہ، اُسکی سالگرہ...... بہت ناپختہ سوچ ہے سارہ کی......سارہ اسے ہمیشہ بیوقوف ہی لگا کرتی تھی۔

اور تین سال گزرنے کے بعد بھی اس کی یہ رائے بدستور قائم تھی۔اسے ہلکی سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی سارہ کی سالگرہ کو منا نہیں پایا تھا۔

شادی کے بعد سارہ نے آنے والی اپنی پہلی سالگرہ پر بڑا اہتمام کیا تھا۔ سارے خاندان والوں اور دوستوں کو انوائٹ کیا تھا۔ بہت زبردست سا ڈنر ارینج کیا تھا۔ اپنے لیے خوبصورت لباس ڈیزائن کیا تھا وہ بہت زیادہ ایکسائٹڈ تھی۔ شادی کے فقط تین ماہ بعد اس کی سالگرہ کا دن آیا تھا۔ وہ سعد سے بھی بھرپور گرم جوشی کی توقع کر رہی تھی۔ سعد حیران تھا۔ اس کی بچوں جیسی حرکتیں اسے حیران سے زیادہ پریشان کر رہی تھیں۔

اسی شام جب وہ آفس سے جلدی اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا اس کے باس کی اچانک طبیعت بگڑ گئی۔ دفتر میں ملازمین کی کمی نہ تھی۔ اس کی باس کے ساتھ ڈائریکٹ ڈیلنگ بھی نہیں تھی لیکن باس کی نگاہوں میں آنے کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا تھا۔ ایک سال سے وہ جس ترقی کا متلاشی تھا یہ ایک رات اسے دلا سکتی تھی۔ وہ پوری رات ICU کے سامنے الرٹ کھڑا رہا۔ باس کے دونوں بیٹے ملک سے باہر تھے لیکن اکلوتی بیٹی اور بیگم کے اوپر اس

کی فرض شناسی کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس دھاک کا نتیجہ اگلے مہینے سے قبل مل بھی گیا۔ پروموشن اور تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ...... اسے اور کیا چاہیے تھا۔

ایک رات کی قربانی اسے کہیں سے کہیں لے گئی تھی لیکن سارہ......؟

اس رات جب وہ باس کے اہلِ خانہ پر اپنی دھاک بٹھانے کے بعد اگلی صبح گھر واپس پہنچا تو وہاں ہونے والے فنکشن کے مٹے مٹے آثار موجود تھے۔ لاؤنج میں تحائف کے خوبصورت ڈبے بھرے ہوئے تھے۔

اوہ...... وہ تو سارہ کے لیے کچھ خریدنا ہی بھول گیا تھا۔ سارہ سوئی ہوئی تھی۔ البتہ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے متورم اور سرخ ہو رہے تھے۔ اسے ایک لمحے کو ترس آیا۔ مگر فوراً ہی اس نے سوچا۔ تاہم باس اہم ہوتی ہیں۔ سارہ کی سالگرہ تو اگلے سال پھر آ جائے گی۔ مگر باس کا ہارٹ اٹیک شاید اُسے یہ موقع دوبارہ فراہم نہ کرے۔

سارہ نے مگر اس تلخ تجربے کے بعد آئندہ کسی ایسے فنکشن سے توبہ کر لی تھی۔ اگلی سالگرہ پر اس نے محض اس کے ساتھ باہر جا کے ڈنر کرنے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن چوبیس جون کے دن اور تاریخ کو سعد سے کوئی خاص دشمنی تھی۔

عین اسی دن صبح میں اسے آفس کے انتہائی ضروری کام سے لاہور جانا پڑ گیا۔ وہ تین دنوں کے بعد واپس آیا تو سارہ کی سالگرہ بھول چکا تھا۔ اور شاید سارہ خود بھی بھول گئی تھی کیونکہ اس نے دوبارہ ڈنر کا ذکر بھی نہیں کیا۔

آج پھر سارہ کی سالگرہ تھی۔ وہ شہر ہی میں تھا، اور اسے بروقت یاد بھی آ گیا۔ سارہ ناراض بھی اور اس کو منانے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟'' سارہ میں بچپنا بہت زیادہ تھا یا اسے لگا کرتا تھا۔ مگر وہ سارہ کی جذباتیت سے پریشان ہو جایا کرتا تھا۔

سارہ کو ڈنر اور سالگرہیں منانے کا ہی شوق نہیں تھا بلکہ اسے چیزیں خریدنے گھر سجانے اور برستی بارش میں بھیگنے کا بھی اتنا ہی شوق تھا۔ سارہ کی کم عقلی اسے بالکل نہ بھاتی مگر وہ برداشت کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ سارہ جلد ہی سمجھ جائے گی کہ زندگی کو پریکٹیکل انداز میں کیسے گزارا جاتا ہے۔

اسے شادی کے بعد پہلا ویلنٹائن ڈے یاد آ گیا۔

اس وقت بھی سارہ بے حد پُرجوش ہو رہی تھی۔

''سعد میری خواہش ہے کہ تم مجھے اس ویلنٹائن ڈے پر ایک ایسا سرخ گلاب دو جو خون سے بھی زیادہ سرخ ہو۔'' اس نے سارہ کو حیرت سے دیکھا۔ وہ ویلنٹائن ڈے جیسے فضول دن پر ہرگز یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے سارہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مچل گئی۔

''یہ تو محبت کے اظہار کا طریقہ ہے۔ تم بے شک اسے کسی دن سے نہ جوڑو۔ بس میری یہ فرمائش پوری کر دو۔'' اس نے سارہ کو بہلانے کے لیے وعدہ کر لیا۔ اور پھر سب کچھ بھول گیا۔ لیکن سارہ نہیں بھولی......

اس نے اس دن بہت اہتمام کر رکھا تھا۔ سعد آفس سے حسبِ معمول دیر سے گھر پہنچا مگر سارہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنی خوبصورت وہ اسے پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ گہرا سرخ جوڑا اور ہونٹوں پر گہری سرخ ہی لپ اسٹک اس کے سرخ و سفید رنگ پر عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ڈائننگ ٹیبل پر لے آئی جہاں سرخ موم بتیاں روشن تھیں۔ ٹیبل پر دل کی شکل کا کیک اور سرخ رنگ کے گفٹ پیپر میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پیکٹ رکھا تھا۔ غالباً یہ اس نے سعد کے لیے لیا تھا۔

سرخ گلابوں کا بوکے سارہ نے اسے پیار سے تھمایا۔ اس کی متلاشی نگاہیں سعد کے اردگرد گھوم رہی تھیں۔ اور سعد کو بوکے گفٹ اور کیک میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے کوئی چیز متوجہ کر رہی تھی تو وہ اس کی بیوی اور اس کا بے تحاشہ حسن تھا۔ اس نے سارہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کے خود سے قریب کرلیا۔ سارہ بے چین ہوگئی۔

کچھ دیر کے بعد سارہ کی خوبصورت آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خون سے بھی زیادہ سرخ گلاب..... اس کے بعد اگلا ویلنٹائن آیا اور خاموشی سے گزر گیا۔ سارہ نے ایسا اہتمام دوبارہ نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں؟ وہ آفس سے جلدی اٹھ گیا اور شہر کے سب سے بڑے مال جا پہنچا۔ اس نے سارہ کے لیے سرخ گلابوں کا بڑا سا بوکے تیار کروایا۔ سرخ سوٹ خریدا، روبی کا خوبصورت اور قیمتی سیٹ لیا۔ سرخ لپ اسٹک، پرفیوم جو جو اس کی سمجھ میں آیا وہ خریدتا چلا گیا۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ سارہ کے لیے خریدے گئے گفٹس سے بھر گئی۔ اب تو سارہ خوش ہوگی۔ اس نے وفور مسرت سے سوچا۔ گھڑی اب نو بجا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہ رہا تھا۔ ایسی خوشی اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

گھر پہ تاریکی کا راج تھا۔ اس کی سابقہ کارکردگی کی روشنی میں سارہ لگتا تھا کہ اس سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔

''کوئی بات نہیں...... تمہاری ناراضی اب کچھ دیر کی مہمان ہے۔ آج ملنے والا سرپرائز تمہارے سارے گلے شکوے مٹا دے گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

لاؤنج کی لائٹ آن کی..... کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ حسب عادت اس نے کوٹ اچھال کر صوفے پر پھینکا۔ اگلے ہی لمحے اسے کوئی خیال آیا۔ اس نے لپک کے کوٹ اٹھالیا۔ سیاہ کوٹ پر سفید گرد واضح تھی۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ لاؤنج پر ڈالی۔

''سارہ کو کیا ہو گیا ہے؟'' جتنی نفرت سارہ کو بے ترتیبی اور گندگی سے تھی اتنی ہی چڑ سعد کو ترتیب و نفاست سے تھی۔

سارہ کو جتنا شوق صفائی ستھرائی اور ہر کام وقت پر کرنے کا تھا۔ سعد اتنی ہی خوشی ہر کام غلط وقت پر کر کے اور ہر چیز غلط جگہ پر رکھ کر محسوس کرتا تھا۔ ایسا کرنے سے ایک انجانی آزادی کا احساس ہوتا تھا۔

لیکن آج وہ سارہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ دبے پاؤں بیڈ روم میں داخل ہوا۔ لائٹ آن کی...... اس کا خوبصورتی اور نفاست سے سجا بیڈ روم آج بے ترتیب تھا۔ گرد کی موٹی سی تہہ یہاں بھی نظر آ رہی تھی۔ سارہ سے اس لاپرواہی کی امید ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی مگر بہرحال وہ انسان تھی اور سعد سے سخت ناراض بھی......

سعد نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے ہاتھوں میں پکڑا سامان بیڈ پر رکھ دیا۔ بوکے ہاتھ میں پکڑا اور سارہ کو مخاطب کیا۔

''سارہ دیکھو آج میں صرف تمہارے لیے جلدی آ گیا ہوں۔ آج کا دن تمہارے نام پر گزارا اور آج کی رات بھی تمہارے نام کی......'' سارہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پھر بولنے لگا۔

''تمہیں پھول پیش کرنے سے پہلے تم کو سوری کہنا چاہتا ہوں۔ سوری کہنے کے لیے میں نے آج کے دن کا انتخاب کیا اس لیے کہ مجھے امید ہے تم مجھے ضرور معاف کر دو گی آج تمہاری سالگرہ ہے اور تم اس دن بہت خوش ہوتی ہو۔

سارہ مجھے لگتا ہے کہ شاید میں نے تمہارا دل

دکھایا ہے۔ ہوسکتا ہے مجھے غلط لگتا ہو۔ اصل میں میری سمجھ میں نہیں آرہا بہر حال...... اگر ایسا ہے تو تم نے مجھ سے کبھی کچھ کہا کیوں نہیں......؟ کوئی شکوہ شکایت...... اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تم......؟'' وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ تم عورتوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ جب انہیں اُداس ہونا چاہیے خوشی سے چہکتی نظر آتی ہیں، جب خوش ہونا چاہیے تو رونا شروع کردیتی ہیں۔ جہاں چپ رہنا چاہیے وہاں بول بول کر دماغ کھا جاتی ہیں اور جب بولنا چاہیے وہاں چپ ہوجاتی ہیں۔ جیسے ابھی تم چپ ہو۔''

وہ سارہ کو پچھلے سوا تین سالوں سے دیکھ رہا تھا مگر اس نے سارہ کو سننے کی کبھی خواہش اور کوشش نہیں کی، آج وہ سارہ کو سننا چاہتا تھا۔ آواز کی فریکوئنسی روشنی کی فریکوئنسی سے کم ہوتی ہے۔ چیزیں دکھائی پہلے دیتی اور سنائی بعد میں دیتی ہیں۔

مگر سارہ......؟

دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔ اس نے سارے تحائف بیڈ پر پھیلا دیے۔ سارہ کے لیے اس کی طرف سے خریدے گئے یہ اولین تحائف تھے۔ کمرہ سرخ گلابوں کی خوشبو سے مہکنے لگا تھا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک خاموشی میں عجیب سا ارتعاش پیدا کررہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن کبھی تیز ہوتی کبھی کم...... اس نے سگریٹ سلگائی اور ٹیرس پہ نکل آیا۔

اس کے بیڈ روم کے ساتھ یہ چھوٹا سا ٹیرس سارہ کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اس نے ٹیرس کو بھی پھولوں سے سجایا ہوا تھا۔ اس کا اپارٹمنٹ ففتھ فلور پر تھا عین سمندر کے سامنے...... گو کہ سمندر بہت دور تھا مگر واضح نظر آتا تھا۔ وہ اکثر یہاں کھڑے ہوکر اسموکنگ کرتا تھا اور سارہ کو اس کی اسموکنگ سے چڑ تھی اور اسے سگریٹ سارہ کی کمپنی سے زیادہ عزیز تھی۔

سمندر کی خنک ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے پر محسوس ہوئے اس نے ایک گہرا کش لگایا۔ سارہ جب اس کے ساتھ ٹیرس پر آتی اور وہ اسموکنگ شروع کردیتا سارہ چڑ کے وہاں سے چلی جاتی۔ اسے سارہ کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں تھی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ وال کلاک نے بارہ بج جانے کی اطلاع دی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی آدھی پی ہوئی سگریٹ زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسل دی۔ خود کمرے میں واپس آگیا۔

بیڈ پر ساری چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ سارا سامان ہٹایا۔ بڑے دنوں کے بعد شب خوابی کا لباس پہنا، لائٹ آف کی اور بیڈ پر آگیا۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا۔

چودہ مارچ کی تاریخ ڈھونڈی۔ چودہ مارچ اس کی شادی کی تاریخ تھی۔ تین برس پہلے سارہ اس کی زندگی میں اسی دن شامل ہوئی تھی۔ اور اس برس چودہ مارچ کو سارہ خاموشی سے اس کی زندگی سے نکل گئی۔ سے یقین نہیں آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟''

''سارہ ایسا کیسے کرسکتی ہے؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟'' یہ وہ سوال تھے جو پچھلے تین ماہ سے اس کے ذہن میں گردش کررہے تھے۔

اس نے سارہ کے ساتھ کبھی کوئی برا سلوک نہیں کیا، روپے پیسے کھانے پینے، اپنی مرضی سے جینے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ پھر سارہ نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ وہ بھی اسے بتائے بغیر اس سے مشورہ کیے بغیر......''

اس نے چودہ مارچ رات بارہ بج کے دس منٹ پر آنے والا میسج پڑھا تین ماہ اور دس دنوں میں شاید

سوویں دفعہ......

مسٹر سعد افتخار میں جانتی ہوں آپ کا وقت بہت قیمتی ہے میرا میسج (عموماً آپ میرے میسج پڑھتے ہیں نہ جواب دیتے ہیں) آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لے گا۔ بہرحال میری یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ آپ کو آگاہ کردوں کہ میں آپ کو چھوڑ کے جارہی ہوں...... تین برس پہلے بارہ بج کے دس منٹ پر میں نے آپ کے اس اپارٹمنٹ میں قدم رکھا تھا اور آج اسی وقت یہ جگہ چھوڑ رہی ہوں۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ ٹائمنگز اہم ہوتی ہیں۔ نہ جانے ٹائمنگز سے آپ کی کیا مراد ہے کیونکہ میں نے آپ کو زندگی میں کبھی کوئی کام وقت پر کرتے نہیں دیکھا کہیں وقت پر پہنچتے نہیں دیکھا (اس ٹائمنگز سے آپ کی مراد شاید موقعہ پرستی ہو) آپ اپنی زندگی گزار رہے ہیں ایسے جیسے آپ چاہتے ہیں۔ اور میں وہ زندگی گزار رہی ہوں جو میں نہیں چاہتی۔

مجھے افسوس ہے کہ گزشتہ تین سال میں، میں نے آپ کی زندگی میں زبردستی شامل ہو کے گزار دیئے۔ باقی ماندہ زندگی میں اپنے لیے بچا کے لے جارہی ہوں۔

چار بجے میری امریکہ کے لیے فلائٹ ہے۔ میں اپنی بہن کے پاس جارہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری کمی اپنی زندگی کے کسی بھی حصے میں کبھی محسوس نہیں کریں گے۔ اسی طرح میں بھی آپ کے ساتھ گزارے ان تین سالوں...... میری زندگی کے بدترین تین سالوں کو جلد فراموش کرنے کی کوشش کروں گی۔ ہمیشہ کے لیے...... بائے۔''

جب وہ اس رات باس کے غیر ملکی مہمانوں کو ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے کے بعد ان کے ہوٹل پہنچا کے ساڑھے تین بجے اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تب سارہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے موبائل نکالا تو اسے یہ میسج نظر آیا اور اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

کاش یہ میسج وہ بارہ بج کے دس منٹ پر ہی دیکھ لیتا تو...... وہ تو اس وقت ایئرپورٹ پر ہی تھا۔ وہ سارہ کو روک لیتا۔ لیکن کیا وہ واقعی سارہ کو روک سکتا تھا؟ ہمیشہ کی طرح اس نے دیر کردی تھی۔

وہ اُلجھے ہوئے ذہن سے حالات و واقعات کے تانے بانے ملاتا رہا۔ سارہ اس کے بعد پاکستان واپس نہیں آئی تھی۔

نہ وہ سارہ سے مل سکا نہ ہی اس کی آواز سن سکا۔ وہ اس کی زندگی سے نکل گئی تھی اور کاغذی تعلق اس کے والدین نے ختم کروادیا۔

وہ اپنا قصور ہی ڈھونڈتا رہا۔

سارہ اگر ناراض ہوتی تو شاید مان جاتی...... مگر وہ تو اس سے نفرت کی راہ پر چل پڑی تھی۔ ناراضی قابلِ واپسی عمل ہے مگر نفرت نا قابلِ واپسی...... جس طرح محبت نا قابلِ یقین...... اس نے سوچا۔

وہ محبت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ آج وہ سارہ کے لیے وہ محبت محسوس کر رہا تھا جو شاید پہلے کہیں پوشیدہ تھی۔

سارہ آج تم کو گئے تین ماہ اور دس دن گزر چکے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم نہیں ہو۔ میں جانتا ہوں تم اب کبھی نہیں آؤ گی۔ لیکن بہت ساری باتیں تم سے کرنے والی رہ گئیں۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ تم چلی گئی ہو میں تو سمجھتا تھا کہ تم ہمیشہ میرے پاس ہی رہو گی۔

''سارہ سنو...... آئی لو یو...... ریئلی آئی لو یو...... ہیلو سارہ کیا تم سن رہی ہو...... وہ زور سے چلایا...... کمرہ خاموش تھا۔ اور اس کی آواز کی بازگشت اُسے بری طرح توڑ گئی بالکل اسی طرح جیسے دور کہیں ایک تارہ ٹوٹ کر اندھیروں میں کھو گیا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

ثمینہ فیاض

وہمی دل

کیا کہہ رہی ہو؟۔ تم کو کس نے کہا یہ سب؟۔ کیسے جانتی ہو؟۔ میری صاد بھائی اور رضا بھائی دونوں سے بات ہوئی تھی دونوں نے آپ کو بتانے کے لیے کہا تھا۔ جب کہ چچی جان سب جانتی ہیں حوریہ اپنی امی کی ڈانٹ سے ڈرتے ہوئے اک ہی سانس میں۔

صاد، رضا، بسمہ اور حوریہ یونیورسٹی کی کینٹین میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔

کوئی تو راستہ ہوگا۔ حوریہ بہت فکر مندی سے کہہ رہی تھی

یار! راستہ ہوتا تو پہلے نہ نکال لیتا اتنا یوں نہ پریشان ہو رہا ہوتا۔ صاد اب کی بار چڑ گیا تھا رضا قدرے تحمل سے سوچ رہا تھا۔ جبکہ بسمہ تو رونے ہی بیٹھ گئی تھی

میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے میں اس موٹے گینڈے سے شادی نہیں کروں گی چاہے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑ جائے۔ بسمہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

تو کیا کروں میں کورٹ میرج کر لوں کیا۔ صاد بھی جھنجلا رہا تھا اک ہی ماں ہیں میری انہیں چھوڑ تو نہیں سکتا اور وہ بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس دنیا میں میرے سوا ان کا اور ان کے سوا میرا کوئی نہیں ہے کس کے سہارے چھوڑ دوں انہیں۔

تو مجھے چھوڑ دیں گے کیا۔ بسمہ اور رونے والی ہوگئی تھی۔

او! یار یوں لڑنے سے کام نہیں بنے گا زرا سوچو سکون سے کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ اب کی بار رضا نے معاملہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

میں نے کب کہا آپ انہیں چھوڑ دیں بس کوئی ایسا راستہ نکالیں جس میں ہماری شادی بھی ہو جائے اور آپ کی امی بھی خوش رہیں۔ بسمہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

یار میں پوری کوشش کر تو رہا ہوں انہیں سمجھانے کی تم رو تو نہیں نا پلیز۔ وہ مان بھی گئیں تھیں مگر پتہ نہیں یہ سمیرا کہاں سے آ گئی پھوپھو نے بھی پتہ نہیں امی سے کیا کیا کہا کہ وہ فوراً راضی ہو گئیں اور میرے پیچھے ہی پڑ گئیں!۔

رضا اور حوریہ دونوں بھائی بہن صاد کے کزن (تایازاد) تھے جب کہ بسمہ اور حوریہ کلاس فیلوز کے ساتھ ساتھ بہت اچھی دوستیں بھی تھیں اور یہ بات چاروں جانتے تھے کہ صاد اور بسمہ اک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں اور اب جب کہ صاد کی والدہ نے صاد کے لیے لڑکی ڈھونڈنی شروع کر دی تھی تو صاد نے بسمہ کے بارے میں انہیں بتایا جس پر وہ راضی بھی ہو گئیں تھیں کہ جیسے تمھاری مرضی تمھیں جو پسند

ہو گی تمھاری شادی اسی سے ہو گی لیکن راحیلہ پھوپھو نے سارا کام بگاڑ دیا تھا اور اپنی بیٹی سمیرا کا رشتہ صاد کے لیے دے دیا تھا اور نہ جانے کیا کہا تھا کہ امی جان تو کسی طور بات سننے کو تیار ہی نہ تھیں۔ دوسری طرف بسمہ کے لیے بھی اک رشتہ آ گیا تھا اور لڑکے والے جواب مانگ رہے تھے بسمہ نے سوچنے کا ٹائیم لے کر فل فی الحال ٹال دیا تھا اور اب وہ دونوں ہی پریشان تھے اس مسلئے کا حل نکالنے کے لیے صاد اور رضا دونوں آفس سے جلدی آف لے کر بسمہ اور حوریہ سے ملنے یونیورسٹی آ گئے تھے اب سر جوڑے بیٹھے تھے۔

کچھ سمجھ نہیں آ رہا تم فکر نہ کرو بسمہ ہم تینوں تمہارے ساتھ ہیں بھابھی تو تم ہی بنو گی ہماری حوریہ نے بسمہ کو تسلی دیتے ہوئے گلے لگا لیا تھا۔

"ہم گھر جا کر سوچتے ہیں تم بھی گھر جاؤ اور ریلیکس رہو زیادہ سوچو گی تو طبیعت خراب ہو جائے گی ہم گھر جا کر کچھ نہ کچھ کرتے ہیں اس بارے میں اور وہ وہاں سے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔

صاد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا جب کہ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور رضا اور حوریہ دونوں اس کے تایا زاد بھائی بہن ہیں اور تایا ابو کی فیملی صاد کی فیملی کے ساتھ اک ہی گھر میں رہتے تھے۔

تینوں جب گھر میں داخل ہوئے تو لان میں پھوپھو کو اپنی دونوں بھابیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر تینوں کے چہروں پر کوفت کے سائے لہرا گئے مگر مرتا سلام کر کے گھر میں چلے گئے۔

صاد اب حوریہ کی خوشامد کر رہا تھا تم جاؤ
سنو نا کیا ہو رہا ہے میں تو جا نہیں سکتا اور میرے
گلے مصیبت پڑ جائے گی۔
دیکھو اپنی شادی کی کتنی جلدی ہے اس لڑکے کو
۔صاد نے منہ بناتے ہوئے کہا یہ تجربہ اسے حال
ہی میں ہو چکا تھا۔
حوریہ بھی اس کے حکم کو مانتی ہوئے پھوپھو
کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔
اور حوریہ بیٹا پڑھائی کیسی چل رہی ہے پھوپھو
نے اسے دیکھتے ہی ٹاپک بدل دیا تھا۔
جی پھوپھو اچھی ہی چل رہی ہے اب فائنل
ائیر ہے تو زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے دو تین مہینے
رہ گئے ہیں پھر فری ہو جاؤں گی۔
ہم فری ہونے دیں گے تو فری ہو گی نا۔
پھوپھو ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں
مطلب ۔حوریہ اپنی پوری توجہ سے ان کی
بات سنتے ہوئے چونک گئی تھی
تمہاری منگنی کو بھی دو سال ہو گئے ہیں پھر
تمہارے ہاتھ پیلے کر دیں گے اور کیا ۔ پھوپھو
کے ساتھ ساتھ اب کی بار ای جی اور راحیلہ چچی
بھی ہنسی تھیں۔
وہ جھینپتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی... میں ابھی
فریش ہو کر آتی ہوں
وہ وہاں سے اٹھ تو گئی لیکن دل ہی دل میں
بڑبڑا رہی تھی لو اب ساری شامت میرے اوپر
آئے گی۔ کیا مصیبت ہے یار!
مغرب کی نماز کے بعد سب ہی لان میں
آگئے تھے اور چاند کے منتظر تھے رمضان کا چاند نظر
آگیا تھا اور سب کے ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے
اٹھ گئے تھے۔
سب اک دوسرے کو چاند کی مبارک باد دے
رہے تھے جب کہ صاد فون کو تلاش کر رہا تھا کہاں
چلا گیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب وہ کاریڈور
میں آیا تو لان میں کھڑی حوریہ نے فون دکھاتے
ہوئے آئس کریم کی شرط رکھ دی جسے اس نے
بخوشی قبول کر لیا اب صاد رضا اور حوریہ تینوں آئس
کریم پارلر جانے کی تیاری کر رہے تھے وہ لوگ
جب راحیلہ کے بیڈروم کے سامنے سے گزرے تو
صاد کے کانوں میں پھوپھو کے الفاظ جو وہ راحیلہ
سے گلے ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں ٹکرائے اب تو
ہم سمدھن بننے جا رہے ہیں اور صاد کا موڈ وہیں
آف ہو گیا۔
میں نہیں جا رہا کہیں ۔ صاد نے بے زاری
سے کہا
کیوں صادی بھائی ۔حوریہ نے اس اچانک
انکار کی وجہ جاننا چاہی۔
کیا ہوا بسمہ سے لڑائی ہو گئی کیا ۔رضا بھائی
نے بھی اک جملہ اپنی طرف سے بڑھایا
نہیں ہماری ۔پھوپھو کو میری شادی کا خیال
آگیا ہے۔صاد نے اپنے انکار کی وجہ بتائی اور پھر
تینوں اسی سوچ میں ڈوب گئے۔
ارے یار پھر سے ۔رضا نے اک بار پھر تائید
چاہی۔
اور صاد کا پرسوچ ہوں ں ں ں ں ں ں ں ں ں ں
ان کی سوچوں کو سوچنے پر مجبور کر گیا۔
رات کھانا کھاتے ہوئے صاد کے ہاتھ سے
گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔
ای جی ۔ارے دیکھو بھئی کیا ہو گیا لگ نہ
جائے تم بھی بچے ہو گئے ہو گیا۔ای نے ایکدم
صاد کو ٹوکا۔
پتہ نہیں وہ پلیٹ رکھی تو دیہان نہیں رہا گلاس
لڑھک گیا۔
ارے کوئی بات نہیں۔ کانچ کا ٹوٹنا تو اچھا
شگن ہے بھئی میں تو کہتی ہوں آج ہی صاد اور سمیرا
کی منگنی کی تاریخ طے کر دیتے ہیں ۔ پھوپھو
خوب ہنس ہنس کر کہہ رہی تھیں۔
اور صاد بے چارگی سے رضا اور حوریہ کو دیکھ
رہا تھا۔ کھانے کے بعد تینوں لان میں بیٹھ گئے
کچھ کرو یار پھوپھو تو ہٹلر ہی ہو گئی ہیں یہ تو شادی
کروا کر ہی چھوڑیں گی۔

ہم نے کہا تھا کہ اس چھوڑ دو تمہیں نہیں معلوم کتنی وہمی ہیں وہ۔ ہر بات میں شگن اب شگن کرتی رہتی ہیں۔ رضا اس نئی مصیبت سے چڑ کر صاد سے کہہ رہا تھا۔

ہاں! بھائی یاد ہے پچھلی بار پھوپھو ہمارے گھر تک آکر واپس لوٹ گئی تھیں بغیر اندر آئے اور اس لیے نہیں آئیں تھیں کہ دروازے پر کالی بلی راستہ کاٹ گئی تھی اور وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

رضا پھر کیا خیال ہے یہی ٹھیک رہے گا ہاں یہ آئیڈیا اچھا ہے اس سے کام بن جائے گا۔ صاد اور رضا ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔

جب کہ حوریہ ان دونوں کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا؟ کس سے کام بن جائے گا؟ کیا ہوا؟۔ وہ ان دونوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی اور وہ دونوں ہنستے مسکراتے اندر کی طرف بڑھ گئے تھے۔

آج رات یہیں رک جائیں نا پھوپھو کل سے تو ویسے بھی رمضان شروع ہو جائیں گے۔ رضا نے اتنی محبت سے کہا کہ پھوپھو انکار ہی نہ کر سکیں۔

پھوپھو اپنے بھتیجے کی اس محبت پر واری واری جا رہیں تھیں اور کل جانے پر راضی ہو گئیں سب ساتھ میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ پھوپھو کو اک بار پھر سمیرا اور صاد کی شادی کا خیال آ گیا۔

ارے ظہیر بھائی کہاں ہیں وہ بھی آ جائیں تو صاد اور سمیرا کی منگنی کی تاریخیں طے کر لیتے ہیں اور پھر تھوڑی دیر میں ظہیر تایا بھی اپنے اسٹڈی سے نکل کر لاونج میں آ گئے تھے جہاں سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے ابھی ٹاپک شروع ہی ہوا تھا کہ پلان کے مطابق حوریہ اٹھ کھڑی ہوئی پھوپھو آپ کتنی کمزور ہوگئی ہیں میں ابھی آپ کے لیے دودھ لے آئی ہوں پھوپھو کے منع کرنے سے پہلے ہی حوریہ دودھ لے آئی اور ان کو پکڑاتے ہوئے تھوڑا سا ہاتھ کو ٹیڑھا کر دیا جس کی وجہ سے تھوڑا دودھ نیچے گر گیا۔

ارے ارے یہ کیا کیا تم نے۔ پھوپھو اک دم ہی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اب ایسے وقت تم لوگوں سے کیا بات کرنا اب تو اب شگن ہو گیا ہے کیا شادی بیاہ کی بات کی جائے۔ بھئی اب کل ہی بات ہوگی جاؤ بھئی سب سو جاؤ مجھے بھی نیند آ رہی ہے پھوپھو کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

''پھوپھو سوری۔''

میں نے جان بوجھ کر تو نہیں گرایا نا تھوڑا سا ہی تو گرا ہے حوریہ کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے پھوپھو کا موڈ آف ہو گیا۔ تائی امی ظہیر تایا اور امی جی بھی اس ساری سچویشن سے حوریہ کو عجب طریقے سے دیکھ رہے تھے لیکن کہا کسی نے کچھ نہیں اور اس طرح وہ اس وقت تو کامیاب ہو گئے آخر بچپن سے پھوپھو کے ہر شگن اب شگن کو جانتے تھے سب اپنے کمروں میں جا کر سو گئے جب کہ صاد یہ ساری بات بتانے کے لیے بسمہ کو فون کر رہا تھا۔ اب ان کے ہاتھ پھوپھو کی کمزوری آ گئی تھی۔

اگلے دن سے رمضان مبارک کی آمد تھی۔ پھوپھو کے ساتھ رمضان کے پہلے روزے کی سحری سب نے مل کر بہت اہتمام سے کی۔

صبح جب صاد اور رضا آفس کے لیے جا رہے تھے تو حوریہ کو بھی یونیورسٹی چھوڑتے تھے اسی لیے پھوپھو کو بھی ساتھ لے لیا تھا کہ راستے میں انہیں بھی چھوڑ دیں گے اور پھر وہ سب اپنے پلان کے مطابق پھوپھو کو گھیر کر بیٹھ گئے پھوپھو اگلے ہفتے رکھ لیتے ہیں منگنی صاد کی تو جان پر ہی بن گئی یہ مروا ہی نہ دیں یہ دونوں بھائی بہن کیا کر رہے ہیں وہ بڑی ہی غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا اور پھوپھو نے بڑی محبت سے کہہ دیا اچھا چلو ہفتے کا دن ہے سب کی اگلے دن چھٹی بھی ہوگی اچھا میں سوچتی ہوں اور پھوپھو نیم رضا مند ہو گئیں۔

پھوپھو کو گھر پر ڈراپ کرتے ہی صاد چلا اٹھا۔
رضا یار مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔ میری پیٹھ میں چھرا اگھونپ رہے تھے تم۔ تم لوگوں کو شرم نہیں آئی ایسی حرکت کرتے ہوئے۔ صاد شدید غصے میں تھا جب کہ حوریہ اور رضا ہنس رہے تھے۔
اسی حرکت میں تو برکت ہے میرے بھائی۔
مطلب۔ شادی کر لوں اس چھپکلی سے۔
رضا صاد کو دیکھتے ہوئے۔ خیر اب اتنی بری بھی نہیں ہے وہ۔ اچھی خاصی شکل صورت ہے پڑھی لکھی ہے۔ سمجھدار اور سلجھی ہوئی ہے۔
اوہو۔ اتنی سلجھی ہوئی سمجھدار ہے خوبصورت ہے تو تم کیوں نہیں کر لیتے اس سے شادی۔ صاد منہ بناتے ہوئے رضا کو چڑا رہا تھا۔
کاش!۔۔ میں ایسا کر سکتا مگر میرا ایسا نصیب کہاں!
مطلب۔ اس بار حوریہ اور صاد دونوں اک ساتھ بولے تھے۔
کسی کو صاد کو دیکھنے سے فرصت ملے تو کوئی رضا کو بھی توجہ دے نا۔ دونوں اس کی شکل دیکھ رہے تھے اور اگلی ہی بات کی وضاحت جاہتے تھے۔
اب ایسے مت دیکھو۔ یار میرا بھی دل ہے مجھے بھی کوئی پسند آسکتی ہے۔ رضا بڑی سادگی سے اپنے دل کی بات کہہ گیا تھا۔
ہاہاہاہاہا۔ ہاہاہا حوریہ اور صاد کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔
تو پہلے کیوں نہیں بتایا ہم کب سے پاگلوں کی طرح جان چھڑانے کے نسخے ڈھونڈ رہے تھے۔ صاد ہنستے ہنستے اب کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔
کیسے؟۔ حوریہ نے بہت دلچسپی سے پوچھا۔
صاد چٹکی بجاتے ہوئے ہم پھوپھو تائی امی اور امی کو یہ بات بتا دیتے ہیں کہ رضا سیمرا کو پسند کرتا ہے تو ان کا اور میرا دونوں کے مسئلہ سولو ہو جائیں گے۔

ہا۔ ہا۔ ہا اتنا آسان نہیں ہے یہ۔ اب کی بار رضا طنزیہ ہنسی ہنسا تھا۔
کیوں۔ حوریہ پھر وجہ جاننا چاہتی تھی۔
اس لیے میری بہنا کیونکہ میری تاریخ پیدائش تیرا مارچ ہے اور تیرا مارچ بنتی ہے ۳ تیرا کا ہندسہ وہ بھی اک ساتھ پھوپھو یہ تو کبھی نہیں ہونے دیں گی۔
افو۔ تم کو بھی تیرا کو ہی پیدا ہونا تھا۔ صاد کچھ اسے چھیڑتے اور کچھ کوفت سے کہہ رہا تھا
یہ سب چھوڑو پہلے یہ بتاؤ مجھے کیوں پھنسوایا ہے۔ اگلے ہفتے منگنی کر لیں پھوپھو۔ پھوپھو کے چمچے۔ صاد کو اک بار پھر اپنی منگنی کی بات یاد آگئی تھی۔ اور وہ منہ بگاڑ کر رضا کی نقل کر رہا تھا۔
اس کا بھی تم کو معلوم ہو جائے گا ابھی یا شام تک جب تم گھر جاؤ گے تو معلوم ہو گا کہ پھوپھو نے اس ہفتے منگنی سے انکار کر دیا ہے۔ رضا بہت کانفیڈینس سے کہہ رہا تھا۔
تم اتنے کانفیڈینس سے کہہ رہے ہو تو مان جاتا ہوں اچھا چلو فرض کرو تمھاری بات پر یقین کرتے ہوئے یہ مان بھی لوں کہ وہ انکار کر دیں گی اس ہفتے تو اس سے کیا حاصل ہو گا اگلے ہفتے وہ پھر تیار ہوں گی مصیبت وقتی ہی ٹلے گی نا ختم تو نہیں ہو گی۔ صاد بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔
اس سے یہ ہو گا کہ کئی بار ہاں اور ناں کی صورت میں ان کے دل میں یہ گمان پیدا ہو جائے گا کہ تم ان کی بیٹی کے لیے منحوس ہو اور یہ شادی نہیں ہونی چاہیے اور اگر ایسا نہ ہوا تو ہم ان کے دل میں یہ بات ڈال دیں گے اس طرح ان کے اس شگن بدشگن کو بہت ٹھیس پہنچے گی جس سے شاید وہ میری شادی اس سے کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔
او دیکھ لو بھائی۔ تمھارے اس شکاری طریقے سے میں ہی شکار نہ ہو جاؤں۔ صاد بہت پریشان ہو رہا تھا اور ان تینوں کے حسب توقع گھر جا کر پھوپھو کا فون آ گیا اس ہفتے کو منگنی نہیں کرنا کیونکہ اس

ہفتے تو انگریزی میں تیرا تاریخ ہے۔ نا بھائی میں اپنی بچی کی منگنی ایسی منحوس تاریخ کو نہیں کروں گی۔

☆......☆......☆

شام میں جب تائی امی اور امی جی افطاری کا انتظام کر رہی تھیں تو حوریہ بھی ان کے ساتھ کچن میں مدد کروانے لگی۔ امی اب رضا بھائی کی بھی شادی کر دینی چاہیے۔

ہاں سوچ تو رہی ہوں مگر پہلے تمہاری شادی ہو گی پھر رضا کی بات کروں گی اور ویسے بھی اس کے لیے کوئی لڑکی بھی تو نظر آئے۔ تائی امی نے بہت سادگی سے کہہ دیا۔

ویسے صاد بھائی سے بڑے تو رضا بھائی ہیں ان کے لیے پھوپھو نے کیوں نہیں کہا۔ حوریہ نے بات شروع کی۔

ہاں پسند تو مجھے بھی بہت ہے سمیرا مگر تمہاری پھوپھو کو صاد شروع سے ہی پسند ہے اور ویسے بھی رضا تیرا تاریخ کو پیدا ہوا تھا تو وہ تو کبھی نہ مانیں گی ان کی بھی اپنی ہی لاجک ہے۔ تائی امی اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

اس کا مطلب انہیں رضا بھائی بلکل پسند نہیں۔ حوریہ نے وضاحت چاہی

میں نے ایسا کب کہا رضا بھی ان کا بھتیجا ہے اسے بھی پسند کرتی ہیں لیکن اس کی تاریخ پیدائش کو وہ منحوس قرار دیتی ہیں اسی لیے انہوں نے صاد کا انتخاب کیا۔

اک بات بتاؤں امی وہ۔ اصل میں صاد بھائی سمیرا کو پسند نہیں کرتے جبکہ......

جبکہ کیا۔ تائی امی چونک گئیں رضا بھائی اور سمیرا اک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

کیا......تائی امی پر تو جیسے کوئی بم ہی پھٹ گیا تھا۔

کیا کہہ رہی ہو؟۔ تم کو کس نے کہا یہ سب؟۔ کیسے جانتی ہو؟۔ میری صاد بھائی اور رضا بھائی دونوں سے بات ہوئی تھی دونوں نے آپ کو بتانے کے لیے کہا تھا۔ جب کہ چچی جان سب جانتی ہیں حوریہ امی کی ڈانٹ سے ڈرتے ہوئے اک ہی سانس میں سب کہہ گئی تھی۔ تائی امی کا رخ راحیلہ چچی کی جانب ہو گیا تھا۔

راحیلہ تم سب جانتی ہو اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا آخر یہ ہمارے بچوں کی خوشیوں کا سوال ہے۔

بھابھی۔ اتنا کیوں سیریس ہو رہی ہیں بچے ہیں چھوڑیں ان کی باتوں کو راحیلہ یہ تم کہہ رہی ہو۔ مجھے تم سے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ یہ ان کی زندگی کا سوال ہے میں ان کی خوشیوں کو کسی کے فضول وہموں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔

مانا کہ راحیلہ کو ہم دونوں نے نند سے بڑھ کر بہن سمجھا ہے اور ان کی ہر بات کا احترام بھی کیا ہے مگر اپنے بچوں کی خوشیوں پر میں کوئی کمپرومائز نہیں کروں گی۔

بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں رضا کے لیے ان کو کیسے تیار کریں گے آپ تو جانتی ہیں ان کی وہمی عادت کو۔ راحیلہ فکر مند ہو گئیں تھیں۔

سوچنا پڑے گا کچھ میں بات کرتی ہوں ظہیر سے۔

ہاں ظہیر بھائی سے بات کریں دیکھیں پھر کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ راحیلہ نے بھی اصرار کیا

اگلے دن سب بڑے مل کر راحیلہ پھوپھو کے گھر پہنچ گئے تھے اور ان کو گھیر کر بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

سلام دعا اور خیر خیریت کے بعد ظہیر صاحب نے بات کا آغاز کیا

راحیلہ اصل میں ہمیں تم سے اک بات کرنی تھی۔

جی بھائی فرمائیں میں سن رہی ہوں۔ راحیلہ نے ظہیر بھائی کی جانب اپنی توجہ مرکوز کر دی

راحیلہ تمہارے خیال میں رضا کیسا لڑکا ہے؟

کیا مطلب کیسا لڑکا ہے میرا بھتیجا ہے میری آنکھوں کا تارا ہے شریف ہے نیک ہے پڑھا لکھا

سمجھدار ہے اور کیا۔ راحیلہ رضا کو پسند تو کرتی تھیں مگر اپنی وہمی طبیعت کی وجہ سے اسے اکثر نظر انداز کردیا کرتی تھیں۔

اور اگر میں یہ کہوں کہ صاد کی جگہ تم رضا کو اپنا داماد بنا لو تو تم کیا سوچتی ہو اس بارے میں ظہیر بھائی نے بلکل صاف بات کردی تھی۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے میں تو صاد کو اپنا داماد مان چکی ہوں۔ پھوپھو حیران تھیں۔

لیکن رضا اور سمیرا اک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ظہیر بھائی بہت صاف گو انسان تھے۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟۔ اور ویسے بھی رضا تیرا مارچ کی پیدائش ہے اور تین تیرا کا جوڑا ایسے لڑکے سے میں اپنی سمیرا کی شادی کیسے کرسکتی ہوں۔ پھوپھو نے بھی اپنے دل کی بات بیان کردی۔

تم ان بے کار کی تہمات میں پڑ رہی ہو۔ ظہیر بھائی کو اب غصہ سا آنے لگا تھا اور بہن کی یہ بات انتہائی فضول لگی تھی۔

یہ فضول کی بات نہیں ہے اور وہ رونے لگیں اس اچانک افتاد پر سب ہی سٹپٹا گئے۔

اچھا اچھا اب رو تو نہیں دیکھتے ہیں کچھ سوچتے ہیں۔ ظہیر بھائی نے اپنی بہن کو دلاسا دیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر سب واپس آگئے۔

گھر میں وہ تینوں پھوپھو کے مان جانے کی دعائیں کررہے تھے مگر کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔

پندرہ روزے گزر چکے تھے اور کوئی بات آگے نہیں بڑھی تھی پھوپھو نہیں چاہتیں تھیں کہ کوئی کسی سے روٹھے روٹھے عید منائے اسی لیے انہوں نے اپنے گھر پر افطاری کا انتظام کیا اور سب کو افطار پر انوائیٹ کرلیا تھا۔

سب آگئے تھے مگر رضا نہیں آئے تو پھوپھو نے نہ آنے کی وجہ پوچھی جس پر ظہیر بھائی نے صاف کہہ دیا ہمیں تو کچھ نہیں بتایا اور اس نے کہا ہے وہ صرف آپ کو ہی بتائے گا اس لیے آپ خود ہی فون پر اس کے کان کھینچیں پھوپھو نے ہنستے ہنستے فون ملالیا۔

کہاں ہو بیٹا کیوں نہیں آرہے ہو؟۔ پھوپھو

میں جارہا ہوں۔ کہاں؟۔ آپ کی دنیا سے بہت دور آپ کہتیں ہیں نا کہ میں منحوس ہوں تو کہیں میری وجہ سے آپ پر کوئی آفت نہ آجائے اسی لیے میں جارہا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ آپ خوش رہیے گا۔ اک منحوس انسان اس دنیا سے کم ہو جائے گا۔

کیا کہہ رہے ہو تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا نہیں بیٹا تم تو میری جان ہو میرے بچے ہو میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی ایسا کچھ نہیں کروگے تم اور فورا یہاں آؤ۔

نہیں پھوپھو ساری زندگی آپ کے اس وہمی طبیعت کی وجہ سے مجھے ڈر لگتا رہا کہ کوئی بھی مشکل آگئی تو آپ اس کا الزام مجھ پر ہی ڈالیں گی میں اس تکلیف دہ سچویشن کو مزید نہیں جھیل سکتا۔

نہیں میرا بچہ۔ پھوپھو کی آواز کانپ رہی تھی اور آنسو گرنے کو بے تاب تھے

دیکھیں ظہیر بھائی یہ کیا کہہ رہا ہے رضا رضا ہیلو۔ رضا اور فون کٹ چکا تھا۔

سب فوراہی ظہیر مینشن کے لیے روانہ ہوگئے تھے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا مالی چاچا اسے اسپتال لے گئے ہیں رضا کو بستر پر بے ہوش پایا جب کہ مالی چاچا اس کے پاس بیٹھے تھے سب نے مالی چاچا سے اس سارے واقعے کی تفصیل جانی چاچا جی تو انہیں نے بتایا کہ نیند کی گولیاں کھارہے تھے میں چھٹی کا پوچھنے آیا اور اتنی گولیاں کھاتا دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے اسی لیے ان کو فورا اسپتال لے کر آگیا اور یہ تو شکر ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا ورنہ کیا ہوجاتا۔

اب راحیلہ کو اپنا وہ رویہ یاد آرہا تھا جو بچپن سے انہوں نے روا رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے رضا ہمیشہ ہی ان سے دور رہا کرتا تھا ارے تم سب بچے آئس کریم کھانے جارہے ہو رضا بھی جائے گا کیا؟ تو پھر سمیرا نہیں جائے گی میں نہیں چاہتی کہ کوئی ان ہونی ہوجائے اور ظہیر بھائی اس بات کے اثر

کو کم کرنے کے لیے گھر پر ہی آئسکریم منگوا لیا کرتے تھے۔ کسی پکنک پر جانے کی بات ہوتی یا کوئی اور ایونٹ پھوپھو کی وجہ سے رضا ہمیشہ بڑوں کے ساتھ دوسری گاڑی میں سفر کرتا جب کہ وہ بچوں کے ساتھ جانا چاہتا تھا پھوپھو سوچ رہی تھیں اور رو رہی تھیں نہیں میرے بچے کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی کاش میں اپنی اس وہمی طبیعت سے پہلے ہی چھٹکارہ پا لیتی تو ایسا کبھی نہیں ہوتا میرے بچے کو ہوش آ جائے اور آپ سب لوگ یہ چاہتے ہیں نہ کہ میں سمیرا کی شادی رضا سے کر دوں تو میں اس بارے میں بھی غور کروں گی لیکن مجھے کچھ وقت دیجیے گا مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں اور کھجور سے سب روزہ کھول رہے تھے کہ رضا کو بھی ہوش آ گیا اور پھوپھو کی نظر سے بچ کر اس کے منہ میں بھی صاد نے اک عدد کھجور رکھ دی۔

پھوپھو آپ مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو بہت پریشان کیا ہے نا۔ رضا اب واقعی رو رہا تھا۔

نہیں بیٹا تنگ تو میں نے تم کو کیا ہے میری بے وقوفی کی وجہ سے ساری زندگی تم اک اذیت میں زندگی جیتے رہے ہو مگر اب ایسا نہیں ہوگا تم تو میری جان ہو میرے سب سے بڑے بھتیجے ہو اس خاندان کا سب سے بڑا بیٹا۔

نہیں پھوپھو آپ تو اب بھی مجھے منحوس ہی سمجھتی ہیں۔ رضا باقاعدہ رو رہا تھا جبکہ پھوپھو اسے گلے لگائے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

تمہیں اب منحوس نہیں سمجھوں گی۔ بیٹا میں سمجھ گئی ہوں یہ ہماری سوچ ہوتی ہے جو ہم کسی کو منحوس یا خوش قسمت تصور کرنے لگتے ہیں ورنہ سب کو پیدا کرنے والا اک ہی ہے اور دیکھا جائے تو تم رمضان کی ستائیسویں شب کو پیدا ہوئے تھے اور اس سے مبارک رات کیا ہوگی اور جمعے کا دن تھا اس دن کی برکتیں تو بے شمار ہیں۔ میں نے ایسے پہلے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

تو کیا آپ میری شادی سمیرا سے کروا دیں گی۔ رضا کسی چھوٹے بچے کی طرح معصومیت سے پوچھ رہا تھا جس پر راحیلہ پھوپھو کو بے اختیار پیار آ گیا۔ ہاں کرواؤں گی۔

پکا وعدہ (رضا نے پوچھا) ہاں بابا پکا وعدہ پھوپھو نے اک بار پھر تائید کی۔

اور پھر رضا اک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا ارے آرام سے۔ پھوپھو اسے آرام کرنے کا کہہ رہی تھیں اور وہ تو سب سے گلے مل رہا تھا اور سب زور زور سے ہنس رہے تھے مطلب یہ سب ڈرامہ تھا وہ اب سمجھیں تھیں رضا انہوں نے اک گھوری دی۔

رضا ہنستے ہوئے۔ پھوپھو بے وقوف ہوں پاگل نہیں کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر جان دے دوں۔

اب تو آپ وعدہ بھی کر چکی ہیں اب آپ انکار نہیں کر سکتیں۔ رضا نے ہنستے ہوئے کہا۔

چلو بھئی اب سب چل کر جلدی سے ٹھیک سے افطار کرتے ہیں تمہارے چکر میں روزہ بھی ڈھنگ سے افطار نہیں کیا۔ ظہیر تایا نے بات بدلی کہیں پھوپھو پھر نہ بدل جائیں اور سب پھوپھو کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

افطار کے بعد سب نے مل کر رضا اور سمیرا کی شادی کی تاریخ رکھنی تھی اور ساتھ ہی ساتھ صاد کے لیے بسمہ کا رشتہ بھی لے کر جانا تھا اس سلسلے میں بات کرنی تھی۔

پھوپھو اک بار پھر اگر مگر کرنے لگیں تو رضا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس چھوڑ دیا جس سے وہ گر کر ٹوٹ گیا پھوپھو اب تو اچھا شگن ہو گیا ہے اب تو مان جائیں اور سب ہنس کر پھوپھو کو گلے لگانے لگے۔ پھوپھو بھی مان گئیں تھیں۔ سمیرا کے چہرے پر وہ اطمینان تھا کہ چہرا چاند کی مانند چمکنے لگا اور رضا کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ عید سے پہلے عید ہو گئی۔ صاد جلدی سے بسمہ کو فون پر یہ خوشخبری سنا چکا تھا۔ سب ہی خوش تھے اور عید کی خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے اچھے اچھے پلان سوچ رہے تھے۔

☆☆......☆☆

بنت حوا

فرحین نہایت ہی چالاکی کے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں اسے اپنے مطلب کی جانب لانے کی کوشش کر رہی تھی جب کہ بیماری نے ماریہ کے دل کو اس قدر گداز کر دیا تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فیما اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر اسی راستہ کا انتخاب کرے جس نے آج ماریہ کو تمام......

ایک ایسا یادگار ناولٹ جو دلوں سے مکالمہ کرے گا **آخری حصہ**

دعا کیا حرم نوفل کی خالہ زاد تھی اور شاید ان کا نکاح تو اس وقت ہی ہو چکا تھا جب نوفل کی خالہ کا انتقال ہوا اور حرم کی والدہ کی سرپرستی میں آئی اور یہ سب کچھ مجھے حرم نے ہی بتایا تھا

جبکہ آپ یقیناً ان کی فیملی فرینڈ تھیں پھر آپ کو ان تمام باتوں کا علم کیوں نہ تھا مجھے تو اس بات پر حیرت ہے۔''

ڈاکٹر کے آخری جملے نے اسے شرمندہ سا کر دیا، زندگی میں ہر رشتہ کی بنیاد شاید صرف اور صرف دھوکہ پر ہی رکھی جاتی ہے اگر وہ آج تک مختلف نا مساعد حالات سے گزر کر یہاں تک نہ پہنچی تو یقیناً نوفل کے حوالے سے یہ تمام انکشافات سن کر اپنے ہوش وحواس کھو دیتی مگر اس نے تو اپنی زندگی میں اتنی سی عمر میں وہ سب کچھ دیکھا تھا جہاں نوفل کا جھوٹ، دھوکہ، اور بددیانتی اس کے لیے اپنے معنی کھو چکی تھی ہاں البتہ بے اعتبار رشتوں میں اس کے ایک اور رشتہ کا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ تھا محبت کا رشتہ جہاں اس کا اعتبار خونی رشتوں سے اٹھ گیا تھا وہاں اب وہ دل کے رشتوں پر بھی فاتحہ پڑھتی ہوئی خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اچھا ڈاکٹر اللہ حافظ اور بہت بہت شکریہ جی جو آپ نے اپنی اتنی مصروفیت میں سے میرے لیے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا۔ یہ سب کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی اسپتال کا شور، ایمبولینس کی آوازیں، مریضوں کی آہ وبکا اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

تیز تیز چلتی جب وہ مین روڈ پر آئی تو اسے

یاد آیا گاڑی تو وہ ڈرائیور کے ساتھ پارکنگ میں ہی کھڑی ہے ڈرائیور کو موبائل سے کال کر کے باہر پہنچنے کی ہدایت دیتے ہی وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی اسے محسوس ہو رہا تھا اگر کچھ دیر تک گاڑی نہ پہنچی تو شاید وہ وہیں روڈ پر بیٹھ جائے گی تھکن کا شدید احساس اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔

جس نے اس کے تمام جسم کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اپنی غرض کو پورا کرنے کے لیے انسان کس قدر گر سکتا ہے یہ سب سوچتے ہوئے وہ حیرت زدہ تھی۔ ماں، بہن، بھائی، محبوب، دوست غرض دنیا کا کوئی بھی رشتہ پائیدار نہیں سوائے ایک بندے اور اللہ کے درمیان موجود رشتہ کے ہر رشتہ صرف اور صرف غرض اور دھوکہ کا رشتہ ہوتا ہے۔

ایک اللہ ہی ہے جو اپنے بندے کو کبھی بھی دھوکہ نہیں دیتا کبھی مایوس نہیں کرتا اور اس وقت جب دنیا میں کوئی اپنا نہ ہو رب تو پھر بھی اپنا ہی ہوتا ہے یہ ہی احساس تھا جس نے آج تک اسے مایوس نہ ہونے دیا، تھکنے نہ دیا اچھے کی امید اور آس میں وہ ہمیشہ اپنا سفر کرتی رہی مگر آج شاید اس کا سفر ختم ہو جاتا ہے جو اسے اللہ پر یقین نہ ہوتا مگر وہ ان لوگوں میں سے تھی جو کبھی بڑی مصیبت میں بھی اُمید کا دامن نہ چھوڑتے تھے یہ ہی سبب تھا جو تھوڑی دیر کی مایوسی کے بعد وہ پھر سے جی اٹھی اور جب ڈرائیور گاڑی کے ساتھ آیا اس کے قدم مضبوطی سے زمیں پر جم چکے تھے۔

☆......☆......☆

ماریہ نے بڑی کوشش کے بعد احسن کا داخلہ ایک نامی گرامی بورڈنگ اسکول میں کروا دیا۔ جس کا انتظام ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر کے ہاتھ میں تھا جس کے سبب اس ادارے کا ڈسپلن بہت زیادہ اطمینان بخش تھا اپنی ہر طرح کی تسلی اور کرنل صاحب سے باقاعدہ ایک دو میٹنگ کے بعد ماریہ نے یہ قدم اٹھایا جہاں اس کے اس اقدام نے فیھا کو خاصا مطمئن کیا وہیں فرحین کو سخت اعتراض تھا وہ بار بار ماریہ سے ایک ہی اعتراض کرتی۔''

میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم کیوں چاہتی ہو احسن گھر پر نہ رہے جبکہ وہ تو بڑا ہی بے ضرر سا ہے کبھی تمہارے یا میرے مسئلے میں دخل اندازی نہیں کرتا اور پھر کیوں تم اسے گھر سے دور بھیجنا چاہ رہی ہے۔ جانے وہاں کا ماحول کیسا ہو......؟''

اور ماریہ چاہ کر بھی اپنی ماں کو یہ نہ کہہ سکی کہ جو بھی ہو کم از کم وہ ماحول ہمارے گھر سے تو بہتر ہی ہوگا۔'' جب سے وہ ڈاکٹر عبدالمالک سے ملاقات کر کے آئی تھی خاصی ڈپریسڈ تھی اسے حیرت اپنی ماں پر تھی جسے اس کی بیماری یا کسی ناگہانی مرض سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ ماریہ کو اگر کچھ ہو جائے تو اس کا گھر کس طرح چلے گا؟

اس کی وہ شان و شوکت جو زیادہ تر ماریہ کی مرہون منت تھی اب کس طرح پوری ہوگی اور ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں فیھا کو ماریہ کی جگہ دے چکی تھی جب کہ جواہر شرجیل سے شادی کے بعد یہ گھر چھوڑ چکی تھی اور دیسے بھی وہ اس حسن و جمال کی مالک نہ تھی جو ماریہ کے بعد فیھا کے حصہ میں آیا تھا۔

مگر اس کا یہ اطمینان اس دن رخصت ہو گیا جب اس نے اپنی دلی سوچ کا اظہار ماریہ کے

سامنے کیا۔

"پلیز مما آپ فیھا کے متعلق کبھی بھی اس طرح مت سوچیں وہ یہ سب نہیں کرسکتی جو ساری زندگی میں نے اور آپ نے کیا ویسے بھی وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند ہے لہذا آپ اسے اپنا یہ شوق پورا کرنے دیں۔

رات ہی وہ اپنی ٹیسٹ رپورٹ لے کر آئی تھی، مسلسل میڈیسن لینے کے باوجود اس کے پاؤں کی سوجن کم نہ ہوئی تھی اس کے تمام قریبی جاننے والوں کو صرف اتنا علم تھا کہ ماریہ پاکستان میں نہیں ہے؟ وہ کہاں ہے اور کیوں گئی ہے؟

یہ فی الحال کوئی نہ جانتا تھا اس نے اپنا سیل نمبر عارضی طور پر بند کرلیا تھا۔ ابھی بھی وہ تیار ہوکر ڈاکٹر عبدالمالک کے کلینک جارہی تھی جب اس سے فرحین نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔

لو اگر فیھا یہ سب نہیں کرے گی تو تمہار علاج کیسے ممکن ہوگا؟ جانے کتنی رقم تمہارے علاج پر خرچ ہو جائے ذرا سوچو اتنا پیسہ کہاں سے لاؤ گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ فیھا کو وہ راستہ دکھاؤ جس پر سفر کر کے تم نے اسے اس قابل بنایا جہاں آج وہ چار لوگوں میں بیٹھ کر بڑے اعتماد کے ساتھ بات کرسکتی ہے ورنہ مومن آباد کی کچی بستی میں ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھنے والی فیھا اتنی روانی سے انگلش نہ بول سکتی۔ اگر تم یہ سب کچھ نہ کرتیں۔

فرحین نہایت ہی چالاکی کے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں اسے اپنے مطلب کی جانب لانے کی کوشش کررہی تھی جب کہ بیماری نے ماریہ کے دل کو اس قدر گداز کردیا تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فیھا اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر اسی راستہ کا انتخاب کرے جس نے آج ماریہ کو تمام دنیا سے کاٹ کر الگ تھلگ کردیا تھا اسے محسوس ہورہا تھا اس کی یہ بیماری شاید ان تمام گناہوں کا نتیجہ ہے جو آج تک اس سے سرزد ہوئے ویسے بھی بیماری، دکھ اور تکلیف کبھی کبھی بندوں کو اپنے رب کی طرف موڑ دیتا ہے اور ایسا ہی شاید ماریہ کے ساتھ بھی ہونے والا تھا۔

وہ روز بروز اپنی اس بڑھتی بیماری سے کچھ خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوگئی تھی۔

"میں نے آج تک جو کچھ کیا صرف اپنی مرضی اور آپ کی خواہش کے عین مطابق کیا اور اس کا احسان فیھا یا گھر کے کسی اور فرد کے اوپر نہیں ہے اور ویسے بھی ابھی میں ڈاکٹر کے پاس جارہی ہوں لہذا فیھا کی فکر چھوڑ کر کوشش کریں اگر ہوسکے تو میرے لیے کچھ دعا ہی کرلیں شاید اللہ تعالیٰ اپنی اولاد کے حق میں آپ جیسی ماں ہی کی دعا کو بھی شرف قبولیت بخش دے۔"

اس نے اتنا کہنے کے بعد فرحین کے چہرے پر ایک ہلکی سی نظر ڈالی جہاں پھیلی سرخی اس کے غصہ کی کیفیت کو ظاہر کررہی تھی مگر جانے کیا سوچ کر اس نے ماریہ کو کوئی جواب نہ دیا اور وہیں صوفہ پر ٹانگیں لمبی کرتی ہوئی پاس کی ٹیبل پر موجود ڈرائی فروٹ کا چھوٹا سا کرسٹل ٹرے اٹھا کر اپنے قریب کرلیا۔

ماریہ نے خاموشی سے اپنے پاؤں میں موزے پہنے اس کے بعد اس نے ہاتھوں پر بھی گلفس چڑھا دیے اس عمل کے دوران اسے محسوس ہوا شاید اس کے ہاتھوں یا پیروں میں

سے ہلکی اور ناگوار بو آرہی ہے وہ جو پہلے ہی
پاؤں پر ہونے والے زخموں سے پریشان تھی۔
اس بو کو محسوس کر کے ڈر گئی، سر پر اسکارف
لپیٹے اس نے بے اختیار سامنے موجود بڑے
سے دیوار گیر مرر میں اپنا جائزہ لیا چھوٹے
چھوٹے کالے سے دھبے اس کے دائیں گال
کے ساتھ ساتھ تھوڑی پر بھی آ گئے تھے۔
اس نے اسکارف اس طرح لپیٹا کہ اس کی
دائیں گال اور تھوڑی چھپ سے گئے اور اپنا
ہینڈ بیگ اٹھا کر وہ جیسے ہی باہر کے دروازے
کے قریب پہنچی پیچھے سے سنائی دینے والی فیھا
کی آواز نے اس کے قدم روک دیے اپنی جگہ
پر ہی کھڑے اس نے پیچھے کی جانب
پلٹ کر دیکھا اوپر سے نیچے لاؤنج میں آنے
والی سیڑھیوں پر فیھا کھڑی اس سے مخاطب
تھی۔
ماریہ میں تمہارے ساتھ کلینک چل رہی
ہوں تاکہ ڈاکٹر سے ملاقات کر کے یہ جان
سکوں کہ تمہیں کیا بیماری ہے؟ اور اس بیماری کا
بہترین علاج کہاں اور کس اسکن اسپیشلسٹ
سے کروا سکتے ہیں۔'' وہ سیڑھیاں اتر کر ماریہ
کے قریب آ گئی جس نے ایک نظر اپنے سامنے
کھڑے اپنی چھوٹی بہن کے حساس چہرے پر
ڈالی جہاں اس کے لیے دکھ ہی دکھ نظر آ رہا تھا
اور پھر دوسری نگاہ سامنے صوفہ کم بیڈ پر ٹانگیں
پھیلائے مزے سے ڈرائی فروٹ کھاتی اپنی
لاپرواہ ماں پر ڈالی جس کی تربیت نے آج
اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔
جہاں نیکی بدی، اچھائی برائی کا ہر احساس
اس کے دل سے ختم ہو چکا تھا اور شاید کبھی
دوبارہ پیدا بھی نہ ہوتا جو وہ اس نا سمجھ بیماری کا
شکار نہ ہوتی جو آہستہ آہستہ اس کے جسم کو گھن
کی طرح کھا رہی تھی فیھا کو اس سلسلے میں
پریشان دیکھ کر اس کے دل کو گونہ سکون ملا گھر
میں کوئی تو ایسا تھا جسے اس کا احساس تھا یہ ہی
سوچ کر اس نے فیھا کو منع نہیں کیا اور اپنے
ساتھ لے کر ڈاکٹر عبدالمالک کے کلینک جا پہنچی
جہاں آنے والے چند پل میں اس کی بیماری
کھل کر سامنے آنے والی تھی اور وہ اپنی لاعلمی
کے سبب نہیں جانتی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں
اس کی زندگی میں کون سی قیامت رونما ہونے
والی ہے۔
ایک ایسی قیامت جس کے رونما ہونے
کے بعد وہ زندہ قبر میں گاڑ دی جانے والی تھی
ایک ایسی قبر جہاں موت کے انتظار میں اسے
پل پل جینا اور مرنا تھا اور یہ ہی شاید اس کا مقدر
تھا اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کتنی بھی کوشش کر
لے کتنے ہاتھ پاؤں مار لے اپنے مقدر سے
نہیں لڑ سکتا۔ اور یہاں آ کر بے بس ہو جاتا ہے
بالکل ویسے جیسے ماریہ کی ٹیسٹ رپورٹ اسے
اگلے چند لمحوں میں گرانے والی تھی۔

☆......☆......☆

وہ مسلسل رو رہی تھی جانے کتنی دیر سے
شاور کے ٹھنڈے یخ پانی سے نہاتے ہوئے وہ
اپنے جسم کو زور زور سے رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی
تھی مگر پھر بھی اس پر پڑے گندگی کے دھبے
دھل کر ہی نہ دے رہے تھے اسے اپنے چاروں
طرف پانی میں سانپ اور کیڑے مکوڑے
دکھائی دے رہے تھے جو اپنی سرخ آنکھوں کے
ساتھ رال ٹپکاتی زبان لیے اس کی جانب متوجہ
تھے یا شاید انہیں اس وقت کا انتظار تھا جب اس
کی آنکھیں بند ہوں اور وہ اس پر وار کر سکیں

اسی خوف کے باعث وہ اپنی آنکھیں بند نہ کر رہی تھی وہ اپنی حفاظت کے لیے آیۃ الکرسی پڑھنا چاہتی تھی مگر اس کا دماغ اس معاملے میں بالکل بھی اس کا ساتھ نہ دے پا رہا تھا یا شاید اسے آیۃ الکرسی آتی ہی نہ تھی جو بھی تھا اس وقت اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں اسے آج یہ احساس شدت کے ساتھ ہوا تھا کہ گندگی میں گرنے سے بچنے کی اس کی ابتدائی کوششیں بالکل ناکام ہو گئیں اور اب غیر محسوس طور پر اس کا پور پور غلاظت میں لتھڑ چکا تھا جسے شاید چاہ کر بھی اب صاف نہ کر سکتی تھی اور یہ جسم پر لتھڑی غلاظت ہی تھی جس نے سخت سردی میں اس سے ٹھنڈے پانی کا احساس بھی چھین لیا تھا اسے خود پر پڑنے والا پانی سخت گرم اور کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مسلسل گریہ وزاری سے اس کا گلا خشک ہو گیا تھا مگر آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آ رہے تھے۔

شرجیل پچھلے ایک گھنٹہ سے جانے کتنے چکر کمرے میں لگا چکا تھا وہ جاننا چاہتا تھا آخر جو ہی اس طرح اچانک دو ہی گھنٹے میں گھر کیوں واپس آ گئی؟ مگر جب بھی وہ کمرے میں آیا کمرہ خالی ہی ملا جانے باتھ روم میں ایسا کیا تھا جو جو ہی کو باہر نہ آنے دے رہا تھا کہیں جو ہی باتھ روم میں بے ہوش ہی نہ ہو گئی ہو یہ ہی سوچ کر وہ کئی بار باتھ روم کا دروازہ بجا چکا تھا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا مسلسل پانی گرنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی آخر تھک کر وہ وہیں کمرے میں رکھے صوفے پر بیٹھ گیا جب دروازہ کھلا جواہر باہر آئی اپنے سر پر اچھی طرح تولیہ لپیٹتے تو وہ اس کے قریب سے ایسے گزری جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔

کیا ہوا تمہیں؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟

اس کی لاتعلقی دیکھ کر شرجیل کو سمجھ ہی نہ آیا کہ بات کا آغاز کس طرح کرے۔

ہاں کیوں میری طبیعت کو کیا ہونا تھا؟

بنا پلٹے جواب دے کر وہ اپنی الماری میں گھس گئی جہاں جانے وہ کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ پانچ منٹ کے اعصاب شکن انتظار کے بعد جب وہ الماری کا دروازہ بند کر کے واپس پلٹی تو اس کے ہاتھ میں کوئی کپڑا تھا۔

شرجیل خاموشی سے بیٹھا اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا مگر بولا کچھ نہیں جواہر نے ہاتھ میں لیے دوپٹہ کو سر پر اچھی طرح لپیٹا اور کارپٹ پر کھڑے ہو کر نماز کی نیت باندھ لی، شرجیل نے ایک گہری سانس لی وہ سمجھ گیا آج پھر اس پر پارسائی کا دورہ پڑا تھا جو اکثر ہی پڑتا رہتا تھا وہ بنا کچھ پوچھے اپنے جوتے اتار کر کپڑے تبدیل کرنے باتھ روم میں گھس گیا جب کہ نماز کی نیت کے بعد جو ہی کو یاد ہی نہ آیا کہ آگے کیا پڑھنا ہے اور وہ وہیں سجدے میں گر کر رونے لگی وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب اسے یہ سب چھوڑنا تھا جس میں شرجیل بھی شامل ہے اور اس مقصد کے لیے اگر اس کی کوئی مدد کر سکتا تھا تو وہ یقیناً فیہا تھی بے شک وہ اپنی ماں کی موجودگی میں وہاں نہ جانا چاہتی تھی مگر پھر بھی اسے امید تھی فیہا اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس کا ساتھ ضرور دے گی ورنہ دوسری صورت میں وہ کسی دارالامان یا فلاحی ادارے سے رابطہ کرتی بہر حال جو بھی تھا اب اسے اس گھر میں نہ رہنا تھا وہ اپنی بچی کو لے کر یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتی تھی۔

اسے شاید صرف آج کی رات گزرنے کا انتظار تھا جو کچھ زیادہ ہی طویل ہوگئی تھی کہ ختم ہونے ہی نہ آ رہی تھی اس قطرہ قطرہ پگھلتی رات کی صبح کا روشن ستارہ جو ہی کے مقدر کو بھی تابناک کرنے والا تھا۔

☆......☆......☆

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''اس کے موبائل پر کسی انجان نمبر سے آنے والے پیغام کے نیچے لکھے حرم کے نام سے اسے چونکا دیا اور پھر بجائے میسج کرنے کے وہ فوراً ہی جوابی فون کر بیٹھی مگر باوجود کئی بیل کے کسی نے فون ریسیو نہ کیا اب مجبوراً اسے میسج کے ذریعے ہی بات کا آغاز کرنا پڑا۔''

''کہاں ملو گی تم مجھ سے جگہ اور وقت بتاؤ۔''

وہ اپنے دل میں آئی کئی باتوں کو کلیئر کرنا چاہتی تھی وہ جاننا چاہتی تھی کہ حرم اور نوفل کے درمیان کیا رشتہ تھا؟ اگر ڈاکٹر کا بیان درست تھا تو پھر کیوں ان سب نے مل کر اتنا عرصہ دھوکہ میں رکھا اور ان سب سوالوں کا جواب صرف اس وقت ہی مل سکتا تھا جب ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک فرد اس سے مل سکتا اور اب حرم کے میسج آنے کے بعد وہ جلد از جلد اس سے ملنا چاہتی تھی۔

اب یہ حرم پر منحصر تھا کہ وہ کب تک اس سے ملاقات کر سکے گی۔ اگلے پانچ سیکنڈ میں آنے والے جواب نے اسے خاصا مطمئن کر دیا حرم نے اپنا ایڈریس اسے دے دیا تھا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ جب بھی وہ آسانی سے کراچی آسکے اس سے ملاقات ضرور کرے جس کے لیے اسے صرف چند گھنٹے قبل فون ہی کر ذریعے حرم کو اطلاع دینا ہوگی اس کا بس چلتا تو آج ہی کراچی جا کر حرم سے ملتی اور اپنی تمام الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کرتی وہ جاننا چاہتی تھی نوفل کہاں ہے؟

اور کیوں اس سے قطعی تعلق اختیار کیے بیٹھا ہے مگر افسوس اسے آج صبح ہی ڈاکٹر عبدالصمد کا فون آیا تھا جس کے مطابق بابا طبیعت کی خرابی کے باعث رات سے ہی اسپتال میں تھا اور اب صمد چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ فیھا کو لے کر اسپتال پہنچے کہ وہاں پولیس کی موجودگی میں اس کی ملاقات بابا سے کروادی جائے۔

اس کی کئی سال پرانی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی جس پر وہ حرم اور نوفل سب سب کو دان کر سکتی تھی یہ ہی سوچ کر اس نے کراچی جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا ابھی اپنی تمام تر توجہ وہ بابا جی پر مرکوز رکھنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

آپ ان کی کیا لگتی ہیں؟

ڈاکٹر عبدالمالک نے ماریہ کی تمام رپورٹس کو کئی بار پڑھنے کے بعد اچانک اس کے قریب بیٹھی فیھا کو مخاطب کیا اس سے قبل ڈاکٹر پردے کے دوسری طرف ماریہ کی ٹانگوں اور جسم پر پڑنے والے دھبوں کا بھی اچھی طرح معائنہ کر چکا تھا۔

''میں ان کی چھوٹی بہن ہوں۔'' فیھا نے یک دم ڈاکٹر کے اس طرح مخاطب کرتے سے تھوڑا سا نروس ہوگئی اسے یہاں تقریباً گھنٹہ کے قریب ہوگیا تھا اور اس عرصہ میں پہلی بار ڈاکٹر نے اسے مخاطب کیا تھا۔''

''اچھا...... اتنا کہہ کر ڈاکٹر نے اپنے قریب رکھے پیڈ پر کچھ لکھا اور ماریہ کی طرف

یہ انجیکشن ہے ابھی لگوا کر جائیں ہو سکتا ہے اس سے آپ کے پیروں کی سوجن میں کچھ فرق آ جائے اور ہاں آپ باہر جا کر سسٹر تحسین سے انجیکشن لیں تب تک میں آپ کی چھوٹی بہن سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

فیہا سمجھ گئی کہ کچھ ایسا ضرور تھا جو ڈاکٹر صاحب ماریہ کی غیر موجودگی میں اس سے ڈسکس کرنا چاہتے تھے اس سوچ کے آتے ہی اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں پسینے سے بھیگ گئیں وہ ماریہ کی بیماری کو لے کر تھوڑی سی خوفزدہ ہو گئی۔

پھر بھی وہ جاننا چاہتی تھی کہ ایسی کیا بیماری ہے جو ڈاکٹر ماریہ کے سامنے ذکر کرتے ہوئے گھبرا رہے ہیں جب کہ ماریہ خاموشی سے اپنی فائل اٹھا کر کلینک سے باہر نکل گئی بالکل ایسے جیسے اس اپنے آپ سے دل چسپی ختم ہو گئی ہو یا شاید فیہا کو ایسا محسوس ہوا ہو۔

”دیکھو بیٹا شروع میں تمہاری بہن میرے پاس آئی تو مجھے لگا وہ برص کا شکار ہو رہی ہے مگر دو چار دفعہ کے چیک اپ کے بعد میرا خیال غلط ثابت ہو گیا۔

یہاں تک کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے فیہا کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جس پر نظر آنے والا تناؤ اس کی ذہنی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا وہ اس وقت شدید ڈپریشن کا شکار دکھائی دے رہی تھی اور یقیناً اس ڈپریشن کی وجہ ماریہ کی بیماری ہی تھی۔

تمہاری بہن کو برص نہیں بلکہ وہ......

ڈاکٹر صاحب بات کرتے کرتے پھر سے رک گئے فیہا یک دم بے چین ہو اٹھی۔

پلیز ڈاکٹر صاحب مجھے جلد از جلد بتائیں میری بہن کو کیا بیماری ہے۔

اسے جذام ہو گیا ہے جس کی ابتدائی اسٹیج ہے میں نے اپنے لاسٹ چیک اپ میں اسے Promin دی تھی اور آج سے promin کے انجیکشن کا کورس شروع کر دیا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ میڈیسن ہیں جو میں نے لکھ دی ہیں اب آپ کا صرف یہ کام ہے کہ وہ تمام میڈیسن اپنے ٹائم پر لے اور ہاں کوشش کیجیے گا اس کا تولیہ، برش اور استعمال کا دوسرا سامان گھر کا کوئی دوسرا فرد استعمال نہ کرے۔

اگلے وزٹ کی میں نے تاریخ دے دی ہے آپ ان کے ساتھ آئیے گا بلکہ بہتر ہو گا آپ کی والدہ اس سلسلے میں مجھ سے ملاقات کریں میں آپ کو ایک اور ہاسپٹل اور ڈاکٹر کا نام لکھ کر دے رہا ہوں انہیں وہاں بھی لے کر جائیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے پرچہ لکھ کر فیہا کی جانب بڑھا دیا جسے خاموشی سے تھام کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی کوئی ایسی بات نہ تھی جو وہ مزید ڈاکٹر صاحب سے پوچھتی اور اس کے تمام الفاظ گم ہو گئے تھے۔

”ایک بات اور.......

اس کے کھڑے ہوتے ہی غالباً ڈاکٹر صاحب کو کچھ اور بھی یاد آ گیا۔

کوشش کیجیے گا ماریہ لوگوں سے کم از کم ملے یا ہو سکے تو بالکل بھی نہ ملے آپ لوگ بھی اس سلسلے میں احتیاط ضرور رکھیے گا یہ ایک موذی بیماری ہے جو ایک فرد سے دوسرے فرد کو با آسانی لگ سکتی ہے۔

میرا خیال ہے آپ سمجھ چکی ہوں گی میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے بات ختم کر کے فیہا کی جانب سوالیہ انداز میں تکا فیہا

نے صرف ہاں کے انداز میں گردن ہلائی اور خاموشی سے باہر نکل آئی سامنے ہی ویٹنگ روم کی کرسی پر ماریہ بیٹھی تھی یقیناً وہ انجیکشن لگوا کر وہاں صرف اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ فیھا آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب جا رکی۔

انجیکشن لگ گیا تمہیں؟

ہاں..... جواب دیتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی باہر آ گئی۔ جہاں سامنے ہی ڈرائیور گاڑی لیے ان کا منتظر تھا اور پھر گھر آنے تک فیھا سوچتی رہی کیوں ماریہ نے اس سے ڈاکٹر عبدالمالک کی گفتگو کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش نہ کی؟ کیا ماریہ جان چکی ہے کہ اسے کیا مرض لاحق ہو چکا ہے؟ اس ایک سوال نے حساس دل فیھا کو بے چین کر دیا۔

وہ بار بار ماریہ کے چہرے پر اپنی نظریں ڈال رہی تھی جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بالکل ایک سپاٹ چہرہ کو اس کے دلی جذبات کو بڑی کامیابی سے چھپائے ہوئے تھا یا شاید اس کی آنکھوں پر چڑھا کالا چشمہ اس کی تمام دلی کیفیت کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا تھا جو بھی تھا فیھا نے دل ہی دل میں کئی بار ماریہ کے حوصلے کی داد دی تھی وہ جانتی تھی اب ماریہ کے علاج کے لیے ایک کثیر رقم کی ضرورت ہوگی جو یقیناً ان گھر میں موجود نہ ہوگی کیونکہ ان کی ماں شاہ خرچیوں کی عادی تھی اب ماریہ کا علاج کیسے ممکن ہوگا.....

ایک اور نیا سوال جس نے فیھا کو بے چین کر دیا وہ گھر جس میں وہ رہائش پزیر تھے ماریہ کے باس کا تھا پتہ نہیں اس نے پیپرز ماریہ کو دیے تھے یا نہیں یہ سب فیھا کے علم میں نہ تھا مگر اب پیسہ ایک ضرورت کے طور اس کے سامنے آیا تھا اور اسے محسوس ہوا تھا شاید وہ ولدل جس میں ماریہ جان بوجھ کر گری تھی اب باعث مجبوری اس کا مقدر بننے والی تھی کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

آمدنی کا کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے گھر کے اخراجات کے علاوہ ماریہ کا علاج، احسن کی بھاری فیس کی ادائیگی ہو سکے۔ ان ہی پریشانیوں میں گھری وہ گھر پہنچی گھر پہنچتے ہی ماریہ نے اس کی کم از کم ایک مشکل ضرور حل کر دی ایک ایسی مشکل جس نے اسے بدبودار دلدل میں گرنے سے بچا لیا۔

☆.........☆.........☆

یہ کون ہے؟

ڈاکٹر عبدالصمد نے اپنے سامنے کھڑی خوبصورت لڑکی کے پہلو لگی آٹھ نو سالہ بچی کو تکتے ہوئے حیرت سے سوال کیا۔

فیھا...... مختصر سا جواب دے کر وہ اسپتال کے کاریڈور میں آگے کی جانب بڑھ گئی۔

فیھا...... عبدالصمد نے حیرت سے اس نام کو دہرایا۔ دل ہی دل میں بیتے ماہ و سال کا حساب لگانے سے قبل ہی وہ جان چکا تھا کہ وہ اس سے جھوٹ بول رہی ہے مگر یہ وقت اس کے جھوٹ کو پکڑنے کا نہیں تھا یہی سوچ کر وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا اس کے قریب جا پہنچا کیونکہ جب تک اس کے ساتھ بابا جی کے روم میں نہ جاتا اس تنہا لڑکی کو اندر جانے کی اجازت کسی صورت بھی نہ ملتی کاریڈور کے آخری سرے پر کمرہ روم 107 تھا۔

وہ کچھ دیر باہر کھڑی ہو کر بند دروازے کو تکتی رہی جسے آگے بڑھ کر عبدالصمد نے اس

کے لیے کھول دیا بنا کچھ کہے وہ خاموشی سے بچی کا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوگئی چھوٹے سے کمرے کے واحد بیڈ پر وہ شخص موجود تھا۔ جسے چھونے اس سے بات کرنے اور اس کی آواز سننے کو نہ جانے وہ کب سے تڑپ رہی تھی آج بھی کتنے ماہ کی انتھک محنت کے بعد وہ سلاخوں کو درمیان سے ہٹا کر اس شخص کے قریب پہنچی تھی۔

جس کے چہرے پھیلی داڑھی اور گالوں کی زردی نے اسے یکسر تبدیل کردیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں شاید وہ سو رہا تھا ایک بازو پر لگی ڈرپ سے قطرہ قطرہ دوائی اس کے جسم میں سرایت کررہی تھی جب کہ دوسرا بازو بیڈ کے ساتھ منسلک پٹی پر زنجیر سے بندھا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ اس نے ایک نظر عبدالصمد پر ڈالی جو اس کے بالکل قریب ہی کھڑا تھا اور پھر اپنے ساتھ کھڑی بچی کا بازو مضبوطی سے تھام کر ذرا سا آگے بڑھی بابا جی کے سرہانے کے قریب اسپتال کا گارڈ کھڑا تھا۔

جو اسے آگے آتا دیکھ کر ذرا سا سائیڈ پر ہوگیا بچی نے آگے بڑھ کر بابا کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور وہ خاموشی سے ان کے سرہانے جاکر کھڑی ہوگئی کمرے میں موجود ہر شخص اس وقت شدید تناؤ کا شکار تھا جس کی وجہ یقیناً بابا جی کا سابقہ رویہ تھا۔ پھر بھی جانے کیوں عبدالصمد کو یقین تھا کہ اب صورت حال پہلے سے قدرے مختلف ہوگی اس یقین کی وجہ سے وہ ابھی تک سمجھ نہ پایا تھا مگر شاید اس لڑکی کی کوششوں نے اسے یقین کی اس منزل تک پہنچایا تھا جو بھی تھا گھڑی کی ہر گزرتی سوئی

دوسرے افراد کی طرح اس کے دل کی دھڑکن کو بھی تیز کر رہی تھی۔

بابا...... بچی نے بڑے پیار سے اس شخص کے ہاتھ پر اپنا ننھے ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے پکارا اس کے لہجہ کا ہلکا سا خوف صمد کے سمیت دوسروں نے بھی محسوس کیا دو تین بار پکارنے پر بھی بابا جی نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا، ان کی لرزتی پلکیں ثابت کر رہی تھیں کہ وہ جاگ چکے تھے مگر شاید اپنی ذہنی کیفیت کے سبب کوئی ردعمل ظاہر کرنے سے قاصر ہیں، عبدالصمد نے سرہانے کھڑی اس معصوم لڑکی پر ایک نظر ڈالی جس کی سرخ آنکھیں اس کے اندرونی جذبات چھپانے سے قاصر ہو چکی تھیں۔

بابا جی آنکھیں کھولیں پلیز دیکھیں آپ سے ملنے کون آیا ہے؟

وہ اپنا ضبط کھوتے ہوئے اس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہی رو دی تھی اور پھر ایک دم ہی اس شخص نے اپنی آنکھیں کھول کر اپنے قریب کھڑی بچی پر ایک نظر ڈالی کالی، سپاٹ اور کسی بھی پہچان کے احساس سے عاری آنکھیں وہ کئی پل بنا پلک جھپکے اس بچی کو تکتا رہا اور پھر ایک دم گردن موڑ کر اپنے سرہانے کھڑی اس روتی ہوئی لڑکی پر نگاہ ڈالی جانے کیا تھا اس لڑکی میں جو وہ بے قرار ہوا تھا۔

اس کی بے قراری دیکھتے ہی سیکیورٹی گارڈ کے ساتھ ساتھ عبدالصمد بھی تیزی سے آگے بڑھا مگر یہ کیا وہ شخص تو رو رہا تھا وہ بھی دھاڑیں مار مار کر ہر شخص اپنی جگہ دم بخود رہ گیا اتنے سالوں میں کسی نے بھی اسے اس طرح روتے نہ دیکھا تھا یا تو وہ صرف خاموش رہتا یا اپنے غصے کے اظہار میں لوگوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا اس کا اس طرح بچوں کی طرح رونا سب کے لیے اچھنبے کا باعث تھا جس نے کمرے میں موجود ہر فرد کو اپنی جگہ ساکت کر دیا بابا مت روئیں پلیز دیکھیں آپ کی فیھا آپ سے ملنے آئی ہے۔

لڑکی نے آگے بڑھ کر اس بچی کو کندھوں سے تھام کر بابا جی کے سامنے کر دیا۔

فیھا...... ان کے سرسراتے لبوں سے نکلنے والی آواز سب نے ہی سنی اس روتے ہوئے شخص نے اپنے زنجیر میں جکڑے ہاتھ سے یک دم ہی اس بچی کے قریب کھڑی لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم جانتی ہو نا تمہارا باپ بے قصور تھا۔ تم نے کہا تھا نہ مت مارو میرے بابا کو بولو فیھا تمہیں غلام حسین کی بے گناہی پر یقین تھا کہ نہیں جواب دو میری بچی۔''

ڈاکٹر عبدالصمد نے بے اختیار اس لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی جو خود بھی بے تحاشہ رو رہی تھی۔ اس کا مطلب میرا اندازہ درست تھا۔''

فیھا کو اس طرح روتے دیکھ کر ڈاکٹر عبدالصمد کو اپنے اندازے کی اس درستگی کا یقین ہو گیا جو کئی ماہ قبل اس نے لگایا تھا۔

ہر دوسرے دن بے چینی سے اس شخص سے ملنے کی کوشش کرنے والی لڑکی کو وہ پہلے ہی فیھا کی حیثیت سے جان چکا تھا مگر اپنے اس خیال کا اظہار اس نے آج تک اس کے سامنے نہ کیا تھا۔

''ہاں بابا مجھے نہ صرف یقین ہے بلکہ علم ہے کہ آپ بے قصور ہیں اور اب میں یہ سب

کچھ دنیا کے سامنے لاؤں گی ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ آپ ایک پر شفقت باپ ہیں۔ صرف اور صرف اپنے مفادات کے لیے بیوی اور بیٹی نے استعمال کیا۔''

فیھا، غلام حسین کا ہاتھ تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، کمرے میں موجود ہر فرد دم بخود تھا۔ وہ شخص کو کئی سالوں سے کسی کے قابو میں نہ آتا تھا آج اپنی بیٹی کے سامنے ایک معصوم بچے کی طرح بکھرا رو رہا تھا۔

☆......☆......☆

''سیماب ایئر لائن کا ڈائریکٹر شاید ماریہ کا پرانا جاننے والا تھا یہ ہی سبب تھا جو اس کے صرف ایک ہی فون پر اس نے فیھا کو اپنی ایئر لائن میں بطور ایئر ہوسٹس منتخب کر لیا ماریہ کے فون کے علاوہ فیھا کی خوبصورتی اور روانی سے بولتی انگلش سن کر بھی خاصا متاثر ہوا اس شخص سے ہونے والی ایک دو ملاقاتوں سے ہی فیھا کو اندازہ ہو چکا تھا دنیا میں شرافت بالکل ختم نہیں ہوئی یہ ہی وجہ تھی جو اب تک قیامت نہ آئی ورنہ جانے کب کی آ چکی ہوتی۔

برہان الدین پاشا ایک شریف النفس شخص تھا یا شاید فیھا کے نپے تلے اندازے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ دنیا کی ہر عورت ماریہ نہیں ہوتی یہ ہی وجہ تھی جو فیھا کی خاصی عزت کرتا اور اپنی اس ملازمت سے فیھا بھی خاصی مطمئن تھی اچھے سیلری پیکج نے اس کی کافی مشکلات حل کر دی تھیں ماریہ کا علاج جاری تھا جب کہ فرحین پر اپنی جوان بیٹی کی اس اذیت ناک بیماری نے کوئی بھی اثر نہ ڈالا تھا۔

اس عمر میں بھی مختلف مردوں سے تعلقات استوار رکھے ہوئے تھے اور اب بھی کئی کئی دن نشاء کے ساتھ جانے کہاں گم رہتی مگر فیھا کے علاوہ اب ماریہ نے بھی اس کا نوٹس لینا چھوڑ دیا تھا۔

ہر گزرتا دن ماریہ کی بیماری میں اضافہ کا باعث بن رہا تھا ایسے میں اکثر و بیشتر مایوسی کے عالم میں اسے اپنا باپ بے تحاشہ یاد آتا جس پر لگائے جانے والے اتنے بڑے اور رکیک الزام کے بعد بھی وہ ابھی تک زندہ تھی اسے لگتا اللہ تعالیٰ نے اسی جرم کے سبب اسے اس اذیت ناک بیماری میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ پل پل مر کر جیئے اور اسے احساس ہو کہ ایسی ذلت بھری زندگی جینا کتنا دشوار ترین کام ہے اور یقیناً ایسی ہی ذلت بھری زندگی اس کے باعث غلام حسین کا مقدر بنی تھی۔

کاش وہ اس وقت تھوڑا سا اپنے دماغ سے سوچتی تو آج صورتحال یقیناً مختلف ہوتی ہو سکتا تھا آج وہ بھی ویسی ہی صحت مند زندگی گزار رہی ہوتی جیسے اس کے قریب موجود دوسرے لوگ مگر نہیں شاید یہ سب اس کا مقدر تھا اور اب اسی طرح سسک سسک کر زندگی گزارنا اس کا نصیب ٹھہر چکا تھا۔

☆......☆......☆

دیکھو فیھا ہو سکے تو مجھے اور نوفل کو معاف کر دینا یقین جانو نوفل کو آنٹی نے ہمیشہ سمجھایا کہ وہ تمہیں محبت کے نام پر دھوکہ نہ دے بلکہ سب کچھ سچ سچ بتا دے مگر میری محبت اور روپے کی کمی کے احساس نے اسے بے حس کر دیا ورنہ وہ بالکل ایسا نہ تھا۔''

حرم اس کے سامنے بیٹھی ہاتھ جوڑے روئی جا رہی تھی جب کہ حقیقت تو یہ تھی کہ ساری صورتحال جاننے کے بعد اسے ایک لمحہ کے لیے

بھی نوفل یا حرم سے نفرت محسوس نہ ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ جو اپنوں سے پیار کرتے ہیں، اپنوں کے دکھ دور کرنے کے لیے ہر حد عبور کر لیتے ہیں اور ایسا ہی نوفل نے بھی کیا حرم کی محبت میں اسے بچانے کے لیے فیھا سے جھوٹ بولا دھوکہ دیا مگر یہ سب کچھ کر کے اس نے اپنی حرم کو تو مرنے سے بچا لیا تھا اس کے نزدیک نوفل کا جرم کوئی ایسا بڑا نہ تھا جس پر اسے سزا دی جاتی یہ سب کچھ تو وہ بھی برداشت کر رہی تھی۔

اپنے باپ، بہن، بھائی کی محبت میں اس نے بھی تو وہ سب کچھ کیا جو ان کے دکھ اور تکلیف کو دور کر سکے بے شک نوفل نے یہ سب کرنے کے لیے ایک غلط راستہ کا انتخاب کیا مگر پھر بھی مقصد تو دونوں کا ایک ہی تھا۔ دونوں ہی کو اپنوں کی محبت نے روپے پیسے کی قدر کا احساس دلایا تھا ورنہ تو سچ تو یہ تھا ماریہ کی بیماری سے قبل فیھا کو کبھی بھی دولت میں وہ کشش محسوس نہ ہوئی جو ماریہ کی بیماری، اس کے علاج پر خرچ ہونے والی رقم کے احساس نے دی وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی یا شاید نیت جو بھی تھا اسے سیماب ایئر لائن کی جاب نے کافی سہولتیں دیں اور اب تو ویسے بھی وہ ایک انٹرنیشنل ایئر لائن سے منسلک تھی۔

حرم سے بات کر کے اسی ایک طمانیت کا احساس ضرور ہوا صرف یہ سوچ کر کہ اس کی رقم نہ صرف ماریہ کے علاج میں خرچ ہوئی بلکہ بلاواسطہ طور پر حرم کے علاج میں بھی صرف ہوئی جس کا اسے کوئی دکھ نہ تھا ویسے بھی وہ ایک رحم دل لڑکی تھی روپیہ پیسہ اس کے لیے صرف اس قدر اہمیت رکھتا تھا کہ ضرورت کے وقت کام آ سکے ورنہ اس نے روپے کو اپنی زندگی میں کبھی بھی محبت پر فوقیت نہ دی تھی یہ ہی سبب تھا جو اسے خود سے منسلک ہر رشتہ سے ہمیشہ محبت رہی سوائے ماں کے جانے کیوں وہ کبھی بھی اپنے دل میں فرحین کے لیے محبت کا ایک ذرا سا لمس بھی محسوس نہ کر سکی بلکہ کبھی کبھی تو اسے ایسا محسوس ہوتا شاید وہ فرحین سے نفرت کرتی ہے شدید ترین نفرت جو ماریہ کی بیماری کے بعد تو اسے مزید بڑھ گئی تھی ورنہ اس کا حساس دل تو روڈ پر بے یار و مددگار مرتے ہوئے کسی جانور کے لیے بھی تڑپ اٹھتا تھا یہ ہی سبب تھا جو اسے حرم کا مسلسل رونا بے چین کر رہا تھا آخر وہ برداشت نہ کر سکی اور اٹھ کر حرم کے قریب ہی رکھے صوفے پر جا بیٹھی اور پھر نہایت ہی پیار سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔

یقین جانو تمہاری ساری بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ نوفل نے بیماری کے عالم میں تمہیں تنہا نہ چھوڑا بلکہ ہر ممکن کوشش کر کے تمہارا علاج کروایا تم بہت خوش قسمت لڑکی ہو حرم جو تمہیں نوفل جیسا سچی محبت کرنے والا شخص ملا ہمیشہ اس کی قدر کرنا یاد رکھو اس کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو کسی کمزور لمحہ کی زد میں آ کر تمہیں چھوڑ کر میری طرف پلٹ جاتا مگر آفرین ہے نوفل پر جس نے میری خوبصورتی، معصومیت کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ ہی میرے روپے پیسے کی لالچ میں تمہیں اسپتال میں بے یار و مددگار چھوڑا بے شک اس نے مجھے محبت کے نام پر دھوکہ دیا۔

مگر شاید مجھے بھی کوئی اس سے ایسی محبت نہ تھی جو اس کی اصلیت کھل جانے پر میں اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھتی یا پھر زمانے نے مجھے دنیا

کا ہر چلن دکھا دیا ہے اور ویسے بھی مجھے اپنی قوت برداشت پر بے حد فخر ہے جس نے کبھی مجھے دھوکہ نہیں دیا اس لیے پلیز تم اپنے دل میں کوئی بھی ملال محسوس مت کرو بلکہ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے ساتھ ہی مجھے خوشی بھی ہے کہ میرا پیسہ کسی بیمار کو محبت بخشنے کے کام آیا یقین جانو میں تو نوفل کی احسان مند ہو کیونکہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو آج میں اپنے باپ تک پہنچ گئی ہاں حرم اسے یہ بات ضرور بتانا کہ لاہور کے نفسیاتی اسپتال میں موجود پاگل شخص میرا باپ غلام حسین تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کرنا جس نے مجھے میرے باپ تک پہنچایا۔"

حرم کے آنسو صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو میں چلتی ہوں دو گھنٹہ بعد میری فلائٹ ہے اگر میرے پاس مزید وقت ہوتا تو میں نوفل اور آنٹی سے بھی مل لیتی مگر اب تم جانتی ہو میں کافی لیٹ ہو رہی ہوں اس لیے ان کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی۔"

اس کے کھڑے ہوتے ہی حرم بھی اٹھ گئی اور نہایت ہی محبت سے فیھا کے گلے لگ کر اسے خدا حافظ کہا۔

یقین جانو فیھا تمہاری جیسی اعلیٰ ظرف لڑکی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی اور میں چاہوں گی تم ہمیشہ مجھ سے ملنے کے لیے آتی رہا کرو تم سے مل کر مجھے خوشی اور طمانیت کا احساس ملتا ہے جو اپنوں کی محبت عطا کرتی ہے۔

"ہاں بالکل میں جب بھی کراچی آئی تمہارے پاس ضرور آؤں گی۔"

فیھا نے اس کے ہاتھ تھپتھپائے اور جھک کر ٹیبل پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا حرم اسے چھوڑنے باہر گیٹ تک آئی۔

خدا حافظ کہہ کر باہر نکلتی فیھا کو جیسے کچھ یاد آیا وہ یک دم ہی واپس پلٹی۔

"ارے حرم میں تمہیں بتانا بھول گئی اگلے ماہ میری شادی ہے ڈاکٹر عبدالصمد کے ساتھ جسے شاید قدرت نے میری نیکیوں کے انعام کے طور پر عطا کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ تم اس سے مل کر اتنی ہی خوش ہو گی جتنی مجھ سے مل کر میں شادی کارڈ تمہیں کوریئر سے بھیجوں گی اور مجھے خوشی ہو گی جو تم سب لوگ میری شادی میں شریک ہو۔

اس کے چہرے پر پھیلی خوشی کی لہر نے حرم کو بھی دلی طور پر پرسکون کر دیا شرمندگی کا وہ احساس جو ہمیشہ نوفل کے دھوکہ کی صورت میں اس کے دل کو کچوکے لگا تا تھا پل بھر میں ہی زائل ہو گیا۔

مبارک ہو فیھا یقین جانو یہ سب سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور اب انشاء اللہ نہ صرف میں اور نوفل بلکہ آنٹی بھی تمہاری شادی میں شریک ہو کر تمہیں اپنے ہاتھوں سے رخصت کریں گے۔"

حرم کا خلوص اس کے لفظوں سے جھلک رہا تھا۔

فیھا اثبات میں سر ہلاتی سامنے موجود گاڑی میں بیٹھ گئی اور پھر جب تک گاڑی گلی کے اختتام پر نہ پہنچی دروازے پر کھڑی حرم اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

"یہ فلیٹ میرے ذاتی پیسوں کا ہے جس میں کوئی معمولی سی بھی رقم ماں کی نہیں لگی اس

لیے مجھے امید ہے تم اور رومیہ یہاں نہایت اطمینان سے رہو گی۔

اسے جب جوہی نے فون کر کے روتے ہوئے تمام حقیقت بتائی تو وہ بالکل بھی صبر نہ کر سکی اور ایک گھنٹہ بعد جا کر اسے اور اس کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے آئی۔ شرجیل جو یہ سمجھ رہا تھا کہ جوہی پر پڑنے والا یاسیت کا دورہ حسب سابقہ کچھ دنوں بعد خود ہی اتر جائے گا اس کے اس طرح گھر چھوڑ کر فیھا کے ساتھ جانے کا سن کر گھبرا اٹھا۔

اسے شاید جوہی یا رومیہ سے کوئی محبت یا انسیت نہیں تھی مگر پھر بھی جوہی اس کے لیے ایک ایسی انڈے دینے والی مرغی تھی جسے وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ہی سوچتے ہوئے شروع شروع میں تو اس کی منت سماجت کرتا رہا کہ وہ اسے چھوڑ کر مت جائے پھر بعد میں وہ دھمکیوں پر بھی اتر آیا مگر جوہی پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ سب برائیوں سمیت شرجیل کو چھوڑنے کا فیصلہ بھی کر چکی تھی تم اگر مجھے طلاق دے دو تو زیادہ بہتر ہے ورنہ میں کورٹ کے ذریعے خلع ضرور حاصل کرلوں گی کیونکہ اب میں مزید تم جیسے بے غیرت شخص کے ساتھ ایک پل بھی نہیں گزار سکتی۔“

باہر فیھا آ چکی تھی جس کی گاڑی کا مسلسل بجتا ہارن اسے سنائی دے رہا تھا اور وہ بنا شرجیل کا کوئی جواب دیے رومیہ کو تھامے گیٹ سے باہر نکل آئی جہاں سامنے ہی اس کی چھوٹی بہن ایک نجات دھندہ کے طور پر موجود تھی اسے آج صحیح معنوں میں فیھا پر فخر محسوس ہوا اور اس کا یہ فخر اس وقت دو چند ہو گیا جب فیھا نے اسے لے جا کر اپنے ذاتی فلیٹ میں کھڑا کر دیا۔

تم اگر چاہو تو کسی اچھے پارلر میں جاب کر لو ویسے بھی ایک ماہ تک احسن اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آنے والا ہے۔

میں چاہوں گی کہ وہ تمہارے ساتھ اسی فلیٹ میں رہ لے اور ظاہری بات ہے جب وہ اچھی جاب کرنے لگے گا تو مجھے امید ہے تم دونوں ماں بیٹیوں کی کفالت با آسانی کر سکے گا۔ ورنہ جو کچھ مجھ سے ممکن ہوا میں تم لوگوں کے لیے ضرور کروں گی۔

تم خود کیوں نہیں ہمارے ساتھ یہاں آ کر رہتیں۔

جوہی اپنے دل کی بات کو زبان پر لے ہی آئی۔

تم اچھی طرح جانتی ہو جوہی می کی حالت اس قابل نہیں ہے کہ انہیں تنہا چھوڑ دیا جائے ملازمہ کے ساتھ ساتھ کسی اپنے کا بھی ان کے قریب رہنا ضروری ہے ویسے تو بابا کا علاج بھی چل رہا ہے مجھے امید ہے انشاء اللہ ایک دو ماہ تک وہ بھی ڈسچارج ہو جائیں گے اور ہم سب پھر سے ایک ہو کر اپنی زندگی گزاریں گے دو لوگوں کو کھونے کے بعد ایک مما اور دوسری ماریہ۔

جوہی کا لہجہ میں اس کے دل کا دکھ جھلک رہا تھا ماریہ کے نام کے ساتھ ہی فیھا کی آنکھیں بھی جھلک گئیں۔

”مما سے تو مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہے لیکن یقین مانو ماریہ کا دکھ ہمیں ہمیشہ تڑپاتا رہے گا اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا۔

اب جوہی ماریہ کو یاد کرتے کرتے بے تحاشہ رو رہی تھی جبکہ فیھا جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی ماریہ کے لیے اسی طرح

بلک بلک کر جانے وہ کتنی بار روئی تھی اسے یاد بھی نہ آیا اب تو اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

کچن میں سارا راشن اور ضرورت کا ہر سامان موجود ہے پھر بھی اگر کچھ چاہیے ہو تو فون کر دینا میں دے جاؤں گی فریج میں بھی گوشت، پھل دودھ رکھا ہے۔ رومیہ کا سکول اب چینج کرنا ہوگا کہیں ایسا نہ ہو پرانے اسکول سے شرجیل آ کر اسے لے جائے کل ہی اس کے لیے ایڈمیشن کا انتظام کرتی ہوں تم فکر مت کرنا۔ جوہی کو تسلی دے کر وہ باہر نکل آئی۔ اسے ابھی کئی کام نمٹانے تھے پہلے اسپتال جانا تھا پھر اپنی ماں کی دوائیاں لیتے ہوئے گھر جانا تھا۔

☆......☆......☆

یہ ماریہ ہے؟؟

احسن نے یک دم بوکھلا کر فیھا سے سوال کیا، اسے تو کتنی دیر تک یقین نہ آیا کہ اس کے سامنے بیٹھی بدصورت عورت اس کی حسین ترین بہن ماریہ ہو سکتی ہے۔

''ہاں احسن یہ ماریہ ہی ہے۔''

فیھا نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا جب کہ اس دوران اپنے سر پر مضبوطی سے چادر اوڑھے ماریہ سر نیچے جھکائے خاموشی سے بیٹھی رہی اس کی چارپائی کے قریب ہی ماسی سکینہ بھی کھڑی تھی جو حیران تھی یہ دیکھ کر کہ ماریہ کے بہن بھائی کس قدر خوبصورت تھے انہیں دیکھ کر وہ سوچ سکتی تھی کہ ماریہ بھی اس بیماری میں مبتلا ہونے سے قبل کتنی حسین ہوگی ماسی سکینہ نے ایک تاسف بھری نگاہ اپنے قریب بیٹھی ماریہ پر ڈالی جس کے بھوؤں کے تقریباً تمام

بال جھڑ چکے تھے چہرہ سوج کر کپا ہو گیا تھا جسم پر پھیلے ہوئے پھوڑوں کی بو نے ان دونوں افراد کو ناک پر رومال رکھنے پر مجبور کر دیا تھا حال تو ماسی سکینہ کا بھی ویسا ہی تھا پھر ماریہ کی جوانی اکثر اسے رُلاتی تھی اب وہ اسی طرح آہستہ آواز میں رو رہی تھی۔ جب کہ ماریہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھی تھی اچانک ہی احسن آگے بڑھا اور اس نے اپنی بہن کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔

''ماریہ آپی اتنے سالوں کی واپسی کے بعد میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ آپ کو اس حال میں دیکھوں گا مجھے یہ علم ضرور تھا کہ آپ بیمار ہو مگر آپ اتنی بیمار ہو اور کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو کر اس طرح ساری دنیا سے کٹ کر الگ تھلگ زندگی گزار رہی ہو یہ میں نہ جانتا تھا۔'' وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

''احسن مجھے ایک بتاؤ۔ اتنی دیر میں پہلی بار ماریہ نے کوئی جملہ اپنی زبان سے ادا کیا تھا۔''

ہاں آپی پوچھو کیا بات ہے؟ وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

''کیا میرا رب مجھے معاف کر دے گا اس گناہ پر جو میں نے اپنے سگے باپ پر الزام لگا کر کمایا بتاؤ احسن کیا مجھے میرا اللہ معاف کر دے گا۔''

وہ نہایت یاسیت اور دکھ سے بولی اس کے لہجہ میں جانے ایسا کیا تھا جو فیھا بھی تڑپ اٹھی اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب جا بیٹھی۔

''ہاں ماریہ تمہیں تمہارا رب ضرور معاف کر دے گا۔''

مگر کب فیھا وہ مجھے کب معاف کرے گا۔ بتاؤ مجھے میں کب تک اسی طرح سسکتی ہوئی زندگی گزاروں گی جواب دو فیھا جانتی ہو اگر اس نے مجھے معاف کر دیا ہوتا میری سزا ختم ہو گئی ہوتی مگر نہیں شاید وہ مجھے اس وقت تک معاف نہیں کرے گا جب تک میرا باپ مجھے معاف نہیں کرے گا تم بابا سے کہو صرف ایک بار مجھ سے آ کر مل لیں مجھے معاف کر دیں فیھا تم ان سے کہو گی تو وہ ضرور آئیں گے ضرور مجھے معاف کریں گے۔''

انہوں نے تمہیں معاف کر دیا ہے ماریہ دل سے معاف کیا ہے اور یاد رکھو تمہیں تمہارے رب نے معاف کر دیا ہوگا۔ تم اس سے ہمیشہ مانگتی رہنا مجھے امید ہے وہ تمہیں کبھی نہیں ٹھکرائے گا تمہاری معافی ضرور قبول کرے گا ماریہ ہمارا پروردگار ہمارے تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، بے شک وہ ریت کے ذروں کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ بھی اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا وہ تو اپنے بندوں کے لیے سراپا شفقت ہے ماریہ وہ تمہیں ضرور معاف کر دے گا۔ ضرورت صرف تمہارے طلب کرنے کی ہے وہ تمہیں عطا ضرور کرے گا وہ ماریہ کو تسلی دے کر باہر نکل آئی۔

''فیھا تم نے مجھے ماریہ کی اس بیماری کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔''

وہاں سے واپس آتے ہوئے احسن نے فیھا سے شکوہ کیا۔

کیا فائدہ جانتے ہو میں نے کتنی کوشش کی اس بیماری کے لیے اس کے علاج کے لیے مگر شاید اس کی اپنی قوت مدافعت ختم ہو گئی تھی اور کچھ مما بھی اسے اس حال میں گھر پر رکھنے کو تیار نہ تھیں۔ یہ ہی سبب تھا جو مجھے اسے یہاں چھوڑنا پڑا۔

''وہ تو ظاہر ہے تم سب کے لیے ہی یہ ہی بہتر تھا کہ اسے الگ تھلگ رکھا جائے مگر فیھا مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی کیا ہماری ماں سگی ماں ہے ہم لوگوں کی یا اس نے ہمیں کسی کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا تھا۔''

اس کی اس بات کا جواب فیھا کے پاس نہ تھا اس لیے خاموشی سے گاڑی سے باہر جھانکتے دوڑتے نظاروں پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی، جب اچانک ہی احسن نے اس کے ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیے۔

تمہارا بہت بہت شکریہ فیھا جو تم نے مجھے کسی بھی گندگی میں گرنے سے بچا لیا یقین جانو اگر اس وقت تم مجھ پر نظر نہ رکھتیں مجھے گندے کاموں سے نہ روکتیں تو آج شاید میرا حشر بھی ماریہ جیسا ہوتا۔''

نہیں احسن یہ سب کرنے والی ذات تو صرف اللہ کی ہے جس نے غلام حسین کی اولاد کو گندگی میں گرنے سے بچانے کے لیے مجھے استعمال کیا ورنہ شاید مجھ اکیلی میں کبھی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ میں تم لوگوں کو سیدھا راستہ دکھا پاتی۔

جو بھی ہے فیھا سچ ہے کہ وہ برائی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیک لوگوں کو ہی منتخب کرتا ہے اس سبب شاید اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے مجھے تم پر فخر ہے فیھا جو تم نے اپنی کوششوں سے ہم سب کو ایک کر دیا اور پھر سے غلام حسین کی بکھری ہوئی فیملی مکمل ہوئی۔

احسن کا لہجہ اس بات کے غمازی تھا کہ وہ فیھا کی خودی پر دی جانے والی توجہ کا تہہ دل

سے مشکور ہے جب کہ بیٹھا اس وقت صرف اور صرف اپنی ماں اور بہن کے دکھ کو دل سے محسوس کر کے آبدیدہ تھی۔ اے کاش میں ان دونوں کو بھی صراط مستقیم پر چلا سکتی، کاش میں ماریہ اور اپنی ماں کو بھی بچا سکتی۔ اسی سوچ کے تحت قطرہ قطرہ آنسو اس کے گال بھگو رہے تھے۔

☆......☆......☆

کتنی دیر اپنے سامنے برقعہ میں ملبوس جوہی کو دیکھ کر شرجیل کو یقین ہی نہ آیا کہ وہ اس کی بیوی جواہر ہے وہ پچھلے آدھے گھنٹہ سے فلیٹ کے باہر کھڑا جوہی کی واپسی کا منتظر تھا جو شاید پڑوسی کے مطابق اپنی بچی کو لینے اسکول گئی تھی اب جوہی واپس آئی تو اس کے بدلے ہوئے حلیے نے شرجیل کو دم بخود کر دیا۔

جوہی...... اس کے لبوں سے ہلکی سی آواز نکلی جسے یکسر نظر انداز کرتے جوہی دروازے میں لگے تالے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگی جبکہ رومیہ اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ جسے شرجیل، جوہی کے ڈر سے ہاتھ نہ لگا رہا تھا۔ جوہی کے اس طرح نظر انداز کرنے کے عمل نے شرجیل کو تھوڑا سا مایوس ضرور کیا مگر وہ ہمت نہ ہارا اور آہستہ آہستہ چلتا اس کے تھوڑا قریب ہو گیا جب کہ جوہی اس کے قریب جانے پر ہی تڑپ کے کچھ دور ہو گئی اسے شرجیل سے کراہیت محسوس ہوئی۔

جوہی پلیز میری بات سن لو۔

وہ آہستہ آواز میں گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

بولو کیا کہنا ہے؟ اور جو کہنا ہے ذرا جلدی کہو کیونکہ اپنی جگہ جہاں تم کھڑے ہو میں ایک باعزت عورت کے طور پر پہچانی جاتی ہوں۔

وہ اسے جتاتی ہوئی لفظ چبا چبا کر بولی۔

میں حق تو نہیں رکھتا مگر پھر بھی ہو سکے تو مجھے معاف کر دو اور خلع کا کیس واپس لے لو جوہی مجھے اپنی تمام تر غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے اب انشاءاللہ تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو گی۔''

جوہی نے یک دم اس کے چہرے پر اپنی نگاہ ڈالی جہاں سچائی کندان تھی مگر پھر بھی اس کا دل نہ مانا اسے یقین ہی نہ آتا کہ شرجیل جیسا شخص کبھی اپنے آپ کو تبدیل کر سکتا ہے یہ سب صرف اور صرف اسے دھوکہ دینے کی کوشش تھی اسی سوچ کے تحت وہ بنا کوئی جواب دیے دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوئی اس نے اپنے کان اور دل دونوں کو شرجیل کی طرف سے مکمل طور پر بند کر دیا تھا بڑی کوششوں سے ہاتھ پاؤں مار کر وہ جس برائی سے باہر آئی تھی اب اس میں دوبارہ گرنے کا حوصلہ خود میں نہ پاتی تھی۔

دیکھو جوہی مجھے صرف ایک موقع اور دے دو تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمہیں کبھی مجھ سے شکایت نہ ہو گی مجھے بہت اچھی جاب بھی مل گئی ہے اور اب تمہاری اور رومیہ کی مکمل ذمہ داری ہر حال نبھانے کو تیار ہوں تم جو چاہو مجھ سے وعدہ لے لو چاہو تو بے شک حلف اٹھوا لو اور اگر پھر بھی تمہیں یقین نہ آئے تو میرا کارڈ رکھو یہاں جا کر تصدیق کر لینا کہ میں یہاں ملازمت کر رہا ہوں یا کہ نہیں۔

جوہی کے چہرے پر پھیلی بے یقینی دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے اپنے آفس کا کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا اس نے خاموشی سے تھام کر دروازہ بند کر لیا اور وہیں کھڑی گہرے گہرے سانس لینے لگی جب اسے رومیہ

کی آواز نے چونکایا مما پاپا چلے گئے آپ نے کیوں انہیں گھر کے اندر نہیں بلایا۔

اپنی بیٹی کے لہجہ میں چھلکتے شکوے نے اسے پل بھر کو حیران سا کر دیا اسے نہ سہی رومیہ کو تو یقیناً باپ کی ضرورت تھی باپ جیسا بھی ہو اولاد اور وہ بھی بیٹی ہمیشہ اس سے محبت کرتی ہے یہ احساس اسکے قریب کھڑی اس کی چھ سات سالہ بیٹی نے اسے ایک ہی پل میں دے دیا تھا مگر پھر بھی اس کا دل یہ ماننے کو آمادہ نہ تھا کہ شرجیل اپنی سابقہ حرکات سے تائب ہو چکا ہے اور ابھی وہ خود میں اتنا حوصلہ نہ پاتی تھی کہ اسے معاف کر سکے مگر شاید آنے والے وقت میں یہ سب ممکن ہو سکے اس کا اسے بھی کچھ کچھ یقین ضرور تھا جو بھی تھا بچہ کے لیے باپ بھی اتنا ہی اہم تھا جتنی ماں اور یہ احساس اس سے زیادہ کسے ہو سکتا تھا کیونکہ ان لوگوں نے زندگی میں باپ کی کمی سے وہ سب کچھ دکھ اور تکلیفیں سہی تھیں شاید اس کی اولاد نہ سہہ سکے۔

☆.........☆.........☆

فرحین ایک ایکسیڈینٹ میں معذور ہو گئی اس کی ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ ایسا اپنی جگہ سے کھسکا کہ واپس ہی نہ آ سکے زیادہ وہ مستقل بستر پر لیٹی شور کرتی رہتی۔ فیہا نے اسے سنبھالنے کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ دی تھی غلام حسین صحت یابی کے بعد فیہا کے فلیٹ میں احسن کے ساتھ رہائش پذیر تھا سب کے سمجھانے بجھانے پر جو ہی شرجیل کے ساتھ واپس اپنے گھر جا چکی تھی شرجیل ایک اچھی ملازمت کر رہا تھا اس کے علاوہ جو ہی نے بھی گھر کے باہر والے کمرے میں اپنا پارلر کھول لیا تھا، حرم کے بعد نوفل بھی اس سے معافی مانگ چکا تھا، جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے معاف کر دیا تھا۔ وہ صمد سے شادی کے بعد بھی اپنی ماں کے ساتھ رہائش پذیر تھی کیونکہ وہ شادی سے پہلے ہی صمد سے وعدہ لے چکی تھی کہ جب تک اس کی ماں زندہ ہے صمد اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور نہ کرے گا فرحین کے بعد وہ اس گھر کو کسی ٹرسٹ کے حوالے کر کے خود صمد کے ہاں شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی حالانکہ وہ نہ جانتی تھی کہ فرحین کی یہ زندگی جانے کب تک کی تھی؟ پھر بھی وہ تا عمر اپنی ماں کو سنبھالنے کا عہد کیے ہوئے تھی اور اس سلسلے میں اپنے پروردگار کی مشکور تھی جس نے اسے اتنی ہمت اور حوصلہ عطا کیا کہ وہ بیماری میں چڑچڑی اور بدلحاظ فرحین کو بہ احسن سنبھال رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے احسن کا نکاح بھی اس کی پسند کی لڑکی سے کر دیا تھا۔ عنقریب اس کی رخصتی تھی مگر احسن کی بیوی نے فیہا کے خریدے ہوئے فلیٹ میں غلام حسین کے ساتھ ہی رہنا تھا یہ گھر تو ماریہ کے باس کا عطا کردہ تھا جسے آج تک کبھی واپس نہ مانگا اور اس میں فیہا بھی صرف اپنی ماں کی زندگی تک تھی۔ ان کی موت کے بعد اسے یہ گھر چھوڑ دینا تھا اس گھر سے فیہا کی بہت سی تلخ یادیں بھی وابستہ تھیں جس میں ایک ماریہ بھی تھی جو مرنے کے بعد آج تک ان سب کے دلوں کو تڑپاتی ہے۔ اس کی یاد کم از کم فیہا کے دل کا ایک ایسا ناسور ہے جسے عبدالصمد کی محبت اور غلام حسین کی شفقت نے کم ضرور کیا مگر یکسر ختم نہ کیا کاش کہ ہم انسان کوئی گناہ کرنے سے قبل اس کا انجام سوچ لیں مگر پھر انسان خطا کا پتلا کیسے کہلائے گا۔

(......☆ختم شد☆......)

افسانہ

زرافشاں فرحین

کانچ کی گڑیا

’’دیکھو بیٹا میرے حالات ایسے نہیں کہ تمہاری تعلیم پر خرچ کروں فاخر بھی کسی قابل نہیں۔ تمہاری رشتے کی خالہ صفیہ بہت دن سے خواہشمند ہیں کہ تمہیں اپنے بیٹے کے لیے اپنے گھر بیاہ کر لے جائیں کل پھر اُن کا فون آیا تھا اور میں...... میں انکار نہیں کر سکی۔ اگلے جمعے

’’بابا سنیں نا...... میری فیس بہت لیٹ ہو گئی ہے روزانہ ڈانٹ پڑ رہی ہے اسکول میں۔‘‘ مزنی برے برے منہ بنائی اپنے بابا کی جان کھا رہی تھی۔

’’ہاں بیٹا مجھے معلوم ہے بس کچھ دن اور انتظار کر لو۔ میں جلد ہی فیس جمع کروا دوں گا انشاءاللہ۔‘‘ شفیق باپ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی۔

’’میری سمجھ نہیں آتا آپ اپنی لاڈلی کے لیے اتنی فکر کیوں کرتے ہیں چھوڑیں اسے باقی دو بیٹے بھی ہیں ان کا بھی سوچ لیا کریں۔‘‘ مزنی کی ماں شبانہ زیبا اپنے شوہر کے التفات پر ہمیشہ کی طرح برہم ہوئی اور بیٹی کو گھور کر دیکھا جو باپ کے گلے میں بانہیں ڈالے اب مطمئن انداز میں مسکرا رہی تھی۔

’’ارے نیک بخت! کبھی میں نے اُن کی طرف سے لاپرواہی کی ہے اب بھی نہیں کروں گا مگر یہ تو میری بہت ہی لائق بیٹی ہے اُس کا حق بنتا ہے بھئی!‘‘ یاسر نے شفقت سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور وہ کھلکھلا اٹھی۔

’’آج دس دن زائد ہو گئے تھے فیس کی تاریخ گزر گئی تھی۔ آٹھویں کلاس کی ہونہار طالبہ مزنی روز ڈانٹ سنتی اور منہ لٹکائے گھر واپس آتی مگر یاسر اس کے باپ کی بھی مجبوری تھی۔ سفید پوش گھرانے میں 5 نفوس کرائے کا گھر 3 بچوں کی پرائیویٹ اسکول میں تعلیم کے اخراجات اور اس کی ایک دکان جو کبھی مال کی فروخت اچھی ہو جانے پر خوشحالی کی نوید دیتی اور کبھی تفکرات میں گھیر دیتی آئے دن کی ہڑتالیں مار دھاڑ شہر کی بدامنی نے بازاروں کی رونق ماند کر دی تھی۔ دکاندار صبح بڑے جذبے سے نکل کر آتے مگر اچانک آنے والی خبریں...... کبھی کسی پارٹی کا جلسہ کبھی کسی پارٹی کی ہڑتال سارے دکانداروں کے چہروں سے رونق چھین لیتی کیونکہ انہیں شٹر ڈاؤن کر کے طوعاً کرہاً گھر کی راہ لینی ہوتی۔ دکان کیا کھولتے انہیں تو اپنی جان بچانے کی فکر لگ جاتی۔

مزنی ایک ذہین طالبہ تھی۔ مگر متوسط طبقے کے ذہین بچے اپنی ذہانت کیش نہیں کروا پاتے قیمتی موتی ہونے کے باوجود معمولی کنکریوں کی طرح رُلتے

رہتے ہیں۔ مزنی بھی اک عام سے اسکول میں زیرِ تعلیم تھی۔ امتحانات میں نمایاں پوزیشن لیتی اپنے بھائیوں کے مقابلے میں اللہ نے اسے ذہانت و قابلیت زیادہ عطا کی تھی۔ کھیل کا میدان ہوتا یا تقریر ہر جگہ اول پوزیشن لیتی اسی لیے یاسر اپنی بیٹی کی کامیابیوں پر پھولے نہ سماتے البتہ اس کی بیوی ہر وقت بیٹوں کے مستقبل کے لیے فکرمند رہتی جو اب کالجز میں پہنچ چکے تھے۔

عامر جو FSC کے بعد اب رزلٹ کا منتظر تھا اور فاخر جو ابھی فرسٹ ایئر میں ہی تھا محنتی تو دونوں ہی تھے مگر ذہانت اللہ کی دین ہے جو اللہ رب العزت اپنی مرضی سے ہی عطا کرتے ہیں۔ عامر نے بہت محنت کی تھی اور خواہشمند تھا کہ اسے میڈیکل میں داخلہ مل جائے مگر جب کبھی وہ یاسر سے اس کا اظہار کرتا یاسر اپنے مالی حالات کو دیکھتے ہوئے چپ سا ہو جاتا۔

عامر آج کل فارغ تھا اس لیے اس کے ساتھ دکان پر بھی بیٹھنے لگا تھا مگر صرف اس امید پر کہ باپ خوش ہو کر شاید اس کے خواب کو حقیقت کا روپ دے دے۔

''میں آپ کو اسی لیے سمجھاتی ہوں کہ مزنی کے اخراجات روک لیں آخر اس نے پڑھ کر کیا کر لینا ہے۔ دوسرے گھر چلی جائے گی آپ کو سہارا دینے والے تو یہی بیٹے ہوں گے نا صرف اُن کا سوچا کریں۔'' رات کو جب وہ سونے لیٹنے لگے تو شازیہ نے دھیرے سے یاسر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

یاسر کو اس کی بات سخت ناگوار گزری۔ ماتھے پر بل صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

''تم یہ نہ کہا کرو بس دعا کیا کرو تینوں بچوں کے نصیب ہے ہمیں عطا کرے۔ مزنی کو ہم جو بھی تعلیم و تربیت دیں گے وہ ہمارے لیے بھی صدقۂ جاریہ ہوگی صرف اس دنیا کی نہ سوچا کرو کچھ اس دنیا کی بھی پروا کرلیا کرو۔'' وہ ذرا سخت لہجے میں بولے تو شازیہ اُس کا موڈ آف دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

مگر اس کا خیال یہی تھا کہ باپ نے مزنی کو بے جا سر چڑھایا ہوا ہے عام روایتی ماؤں کی طرح بیٹے اس کی جان تھے بیٹی سے اس کا تقاضا ہوتا کہ گھر کاموں میں اس کی مدد کرے فضول پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ اصل میں شازیہ خود بھی مڈل پاس تھی۔ غربت کے ماحول کی پروردہ تعلیم کو بس اتنا ہی ضروری سمجھتی کہ بندہ بل دیکھ لے یا نوٹ گن لے اور بس.....

انسان اپنے حساب کتاب کرتا ہے قدرت اپنے..... یاسر نے بہت سے حسابات دیکھے اور یہ دیکھ کر کیش میمو مطمئن انداز میں بند کردیا کہ آنے والی پیمنٹس خوش آئند ہیں اور جلد ہی وہ بچوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے معقول رقم کا انتظام کرسکتا ہے۔

وہ زور زور سے ٹہل ٹہل کر اپنا سبق یاد کررہی تھی جب فاخر نے اس کے سر پر چپت لگائی اور کتاب اس کے ہاتھ سے کھینچی۔

''اوئی.....'' وہ چیخی۔ مگر فاخر نے تنگ کرنے کے لیے ہاتھ اونچا کرلیا۔

''بھائی میری کتاب پلیز..... میری کتاب یاد کرنے دیں نا مجھے.....'' وہ جھلا اٹھی۔

''کیا کرو گی پڑھ پڑھ کر..... ہر وقت پڑھتی رہتی ہو چلو میرے ساتھ کیرم کھیلو۔'' فاخر بضد ہوا۔

''ارے نہیں بھئی میرے پیپرز ہونے والے ہیں آپ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلیں جا کر.....''

صاف انکار ہوا۔

''نہیں ہیں یار کوئی بھی اس وقت..... تم ہی آ جاؤ نا! پتہ نہیں کیوں اتنا پڑھتی ہو تمہاری وجہ سے بابا مجھے بھی سناتے ہیں کہ دیکھو بہن کتنی پڑھاکو ہے۔'' اس نے مزنی کو چڑایا تو صحیح ہے نا پڑھائی ضروری ہے بہت..... وہ مدبرانہ لہجے میں بولی۔

''آپ دیکھنا میں ایک دن پائلٹ بن کر دکھاؤں گی۔'' بڑے پُرعزم لہجے میں چمکتی آنکھیں جہاز اڑاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

''آہا..... بس رہنے دو جہاز اڑاؤ گی چھپکلی سے تو ڈرتی ہو اڑا لیا جہاز۔'' فاخر نے بھرپور مذاق اڑایا۔

''ارے تو جہاز میں چھپکلی کب ہوتی ہے۔'' وہ چڑ ہی تو گئی۔ فاخر کا قہقہہ بلند ہوا۔ یاسر نے اندر آتے ہوئے دیکھا بیٹی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ فوراً فاخر کی خبر لی۔ ''کیوں کررہے تنگ میری بیٹی کو بھئی!'' قریب آکر ایک بازو اس کے گرد حمائل کیا۔

''بابا..... یہ پائلٹ بنے گی..... ہاہاہا.....'' فاخر پھر ہنسا۔

''تو تم کیوں ہرٹ کررہے ہو بیٹا، بن بھی سکتی ہے۔ یہ ہے ہی اس لائق۔'' لہجے میں فخر تھا۔

''شازیہ نے احساسِ محرومی سے دیکھا اور آہ بھری باپ بیٹی کے خواب..... اپنے مالی حالات کی جیسے کچھ خبر نہیں۔'' صرف سوچ کر رہ گئیں۔

''بھئی انسان اللہ سے اچھی امید رکھے حوصلہ رکھے کوشش کرتا رہے آگے جو اس کا نصیب.....'' یاسر نے گویا ان کے خیالات پڑھ لیے۔ مزنی کو باپ کی باتوں نے خوب حوصلہ دیا۔

''بابا..... میں نے بل گیٹس کی اسٹوری پڑھی تھی کل میگزین میں وہ بھی اک عام سے گھر سے تعلق رکھنے والا عام سا نوجوان تھا۔ باپ اور استاد کی

جھڑکیاں کھاتے کھاتے اتنا حوصلہ مند ہوا کہ دنیا آج اسے مایہ ناز سوفٹ ویئر انجینئر کے نام سے ہی نہیں دنیا کے دولت مند ترین انسان کے نام سے جانتی ہے۔ مزنی کی معلومات لائق تحسین تھیں۔ یاسر مسکرا اٹھے۔

''ہاں بیٹا...... ٹھیک کہا...... مگر وہ مرد تھا بی بی...... مرد حوصلہ مند ہوتے ہیں سب کر سکتے ہیں۔'' فاخر نے پھر اسے چھیڑا۔

''تو کیا ہوا؟ عورت بھی سب کر سکتی ہے میں نے شہناز لغاری (پہلی با حجاب خاتون پائلٹ) کا انٹرویو بھی پڑھا ہے کوئی چیز اُن کے آگے رکاوٹ نہ بنی۔ مزنی کے پاس ہر اعتراض کا جواب تھا۔ وہ بڑے شوق سے ملکی و غیر ملکی کامیاب خواتین کے انٹرویوز پڑھتی تھی۔ اور ہر روز نئے خواب آنکھوں میں سجاتی۔

''میری جان...... تم فاخر کی باتوں سے نہ دل چھوٹا کرو میں ہوں نا...... جب تک زورِ بازو ہے اپنی بیٹی کی ہر خواہش پوری کروں گا انشاء اللہ...... باپ کا سہارا......!'' اور اُن کی حوصلہ افزائی اس کے جذبوں کو مہمیز کر گئیں اور یاسر نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے توجہ دلانا ضروری سمجھا۔

''بیٹا...... بہن کو دکھی نہ کیا کرو گلشن کی یہ کلی نازک سی میری بیٹی گھر کی رونق ہے خوشبو ہے۔ میرے بعد تمہیں ہی اس کا ہر خواب پورا کرنا ہے۔'' فاخر محض گردن ہلا کر رہ گیا۔ اس کا ذہن تو اب بھی بہن کو تنگ کرنے کے نئے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

شازیہ (ماں) نے موقع غنیمت جانا، فوراً مزنی کو پکارا۔

''اچھا بس اٹھو اور آٹا گوندھ لو، روٹی بنانا تو نہ جانے کب سیکھو گی۔'' مزنی کچن کی طرف بڑھی فاخر نے ہانک لگائی۔

''جہاز اڑانے سے پہلے روٹی بنانا سیکھ لینا۔'' سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''بھائی پلیز میری تقریر سن لیں مجھے اسکول میں کرنی ہے میں نے پریکٹس تو کر لی ہے آپ سن کر بتائیں ٹھیک ہے۔'' مزنی اپنے بھائی فاخر سے مخاطب تھی جو سستا سا موبائل ہاتھ میں لیے کانوں پر ہیڈ فون لگائے مصروف تھا۔ فاخر ذرا لاپرواہ اور موڈی تھا۔ مزنی کی مداخلت اسے پسند نہ آئی اور قدرے جھڑک کر بولا۔

''رہنے دو مجھے نہیں سننا میں مصروف ہوں۔'' مزنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''پلیز بھائی......!'' وہ ابھی کچھ کہتی کہ عامر باپ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ جو صبح سے دکان پر گئے ہوئے تھے۔

''ارے مزنی! گڑیا کیوں رو رہی ہو؟'' بھائی کی محبت نے جوش مارا عامر لپک کر قریب ہوا۔

''فاخر تم نے کچھ کہا ہے؟'' قدرے غصے سے پوچھا گیا۔

''ارے نہیں بھائی میں تو بس تقریر سنانا چاہ رہی ہوں فاخر بھائی نہیں سن رہے۔'' فوراً ہی مزنی نے اس کی طرفداری کی۔

''ارے تو کیا ہوا میں سن لیتا ہوں۔'' عامر نے بشاشت سے کہا۔

''مگر میری بہن پہلے مجھے اچھی سی چائے پلائے گی۔'' مزنی فوراً تیار ہو گئی اور کچن کی طرف بھاگی۔

''ابھی لائی بھیا......'' چائے بنانے میں کون سا وقت لگنا تھا منٹوں میں تیار...... وہ باپ اور بھائی کے لیے بڑے اہتمام سے ٹرے سجا کر لائی مگر کارپٹ کے کنارے سے ٹکرا کر اس کا پاؤں اُلجھا اور ٹرے کے ساتھ لڑکھڑائی۔ چائے کے کپ ٹرے سے نکل

زمین پر آ گرے۔ ... نگل جائے گا۔

"آہ......!" وہ گرم چائے کے پیر پر گر جانے سے کراہ اٹھی مگر تیزی سے جھک کر ٹرے زمین پر رکھی اور ٹوٹے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا مزنی...... اتنی بڑی ہوگئی ہو پتہ نہیں کب سیکھو گی۔" شازیہ کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں۔ مگر مزنی کی طرف دوڑ کر جاتے ہوئے بھائی عامر نے تیزی سے اس کے ہاتھ پکڑے۔

"نہیں نہیں تم رہنے دو تمہارا پاؤں زیادہ تو نہیں جلا؟" وہ بے تابی سے پوچھ رہا تھا اور بہن بھائی کی اس بے ساختہ محبت پر اظہارِ تشکر کے آنسو بہا رہی تھی۔ شازیہ کی ڈانٹ ڈپٹ کی کیسے پروا تھی۔

"ارے گڑیا تم اٹھو بیڈ پر بیٹھو میں کانچ سمیٹتا ہوں۔" عامر نے اسے پیار سے اٹھایا وہ جان سے جی اٹھی گویا۔ بھائی کا سہارا اس کے پیار بھرے جملے، تکلیف کا احساس کب تھا بھلا...... چند جملے محبت کی پھوار بن کر جو حوصلہ دیتے ہیں وہ فولادی دیواریں بھی نہیں دے پاتیں۔ محبت جس رنگ میں ہو اپنا اثر گہرا چھوڑتی ہے۔

مزنی کی شخصیت میں بھرپور اعتماد عود کر آیا جس کا اثر اس کے اگلے دن اسکول میں ہونے والے مقابلے میں نظر آرہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح اول انعام کی مستحق ٹھہری، بڑے خوشگوار موڈ میں بڑی سی شیلڈ لیے وہ گھر کی جانب رواں تھی۔ بھائیوں اور بابا کے پیار بھرے جملے سا کے کانوں میں گونج رہے تھے ایسے موقعوں پر شازیہ بھی بڑھ کر اسے چوم لیتیں وہ تصور میں فرحاں تھی۔ اس بات سے غافل کہ قدرت کے فیصلوں میں اس کے لیے اک سخت آزمائش...... اک جان لیوا فیصلہ آسمانوں پر لکھا جا چکا اور درد و کرب کا یہ سفر اس کی ساری خوشیوں کو

☆......☆......☆

شہر میں ہنگامے، ہڑتالیں روز کا معمول بن گئی ہیں۔ لوگ سب سن کر بھی اپنے کاروبار روز شروع کرتے ہیں۔ امید کے چراغ گھروں سے لے کر نکلتے ہیں کبھی آنکھوں میں جگنو جگمگاتے ہیں اور کبھی یہ چراغ...... اپنی روشنی کا آخری تارا بن کر ظلمت کدے میں کھو جاتے ہیں۔ عامر اور یاسر بھی اس روز حسبِ معمول بازار اپنی دکان پر گئے تھے۔ اس بات سے غافل کہ یہ آخری قدم ہیں جو زندگی کے ساتھ گھر سے نکلے ہیں۔

شہر کے بڑے ہول سیل بازار کی دکانیں نہ جانے کتنے گھر کے چراغ آج بجھتے ہوئے دیکھیں گی کون واقف تھا۔ تیزی سے بھڑک جانے والی آگ اس قدر سرعت کے ساتھ پھیلتی گئی کہ بھری ہوئی دکانیں اپنے مالکان کے ساتھ اس آگ کا حصہ بن گئیں۔ یہ خبر بھی شہر میں بہت جلد پھیلی...... میڈیا پر شور اٹھا کتنے ہی ہاتھ کفِ افسوس ملتے رہے اور جو کرب کا سمندر ان مرحومین کے لواحقین کے حصے میں آیا اسے کوئی لفظوں میں کیسے بیان کرے۔ یہ تو اسے ہی خبر ہوتی ہے جو درد و کرب سے گزر رہا ہو۔ شازیہ کی بے نور آنکھیں بیوگی کی چادر اوڑھے کبھی یاسر کو پکارتیں کبھی عامر کو دو جوان لاشے...... اک قیامت کا منظر تھا۔ اور مزنی حیرت و تعجب سے آنکھیں پھاڑے اپنے سہاروں کو اپنے پیاروں کو خود سے جدا ہو کر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"بابا...... آپ کی گڑیا...... بھیا...... آپ کی گڑیا...... تنہا رہ گئی۔ زندگی کے خاروں کو چننے کے لیے کوئی سہارا ہے بھلا؟" آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ فاخر ماں کو سنبھالتا کبھی بہن کو اور کبھی خود کو...... گرتے قدموں پر کھڑا ہونا کوئی آسان نہیں ہوتا یہ آج اس

نے جانا۔

وقت ہر زخم کا علاج ہے۔ گزرا ہے اور ہر واقعے پر گرد ڈال دیتا ہے۔ سننے والوں کی حسِ سماعت نئے ہنگامے نئے واقعات نئے کرب و اذیت کے باب کھلنے پر پچھلے درد کو فراموش کردیتی ہیں۔ مزنی اور شازیہ کی زندگی بھی اک نئے ڈھب پر چل نکلی۔ شازیہ نے اسے اسکول سے رُکنے کا نہ کہا مگر وہ خود اس کی مجبوری جان کر گھر بیٹھ گئی فاخر اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی سعی کرنے لگا۔ مزنی حسرت سے اپنی کتابوں کو دیکھتی اور اکثر چپکے چپکے روتی شازیہ نے دیکھا تو اسے پرائیویٹ میٹرک کرنے کی ترغیب دی۔

وہ نئے حوصلے کے ساتھ جی اٹھی۔ میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ٹیوشنز پڑھانا شروع کیں گھر بھرا رہتا بچوں سے اور رات کی تاریکی میں وہ چپکے چپکے کبھی بھائی کو یاد کرتی کبھی باپ کو اور کبھی اپنی کتابوں کو آنکھوں سے لگاتی۔

سفر ختم ہوا مگر زحمتِ سفر ابھی باقی ہے

عامر کے بعد فاخر نے گو کہ کوشش کی تھی کہ گھر کو سنبھال لے مگر ابھی تعلیمی میدان میں بھی کوئی خاص ڈگری نہ تھی۔ کاروبار ختم ہو چکا تھا وہ بیچارا چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا کبھی کچھ پیسے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا زیادہ تر دوستوں کی بیٹھک میں وقت گزارنے لگا۔ گورنمنٹ کی طرف سے بڑی شدومد کے بعد کچھ رقم لی تھی شازیہ نے فوراً اک فیصلہ کرلیا۔ ابھی مزنی نے انٹر ہی کیا تھا مگر......

''دیکھو بیٹا میرے حالات ایسے نہیں کہ تمہاری تعلیم پر خرچ کروں فاخر بھی کسی قابل نہیں۔ تمہاری رشتے کی خالہ صفیہ بہت دن سے خواہشمند ہیں کہ تمہیں اپنے بیٹے کے لیے اپنے گھر بیاہ کر لے جائیں کل پھر اُن کا فون آیا تھا اور میں...... میں انکار نہیں کر سکی۔ اگلے جمعے کو تمہارا نکاح ہے مزنی......

شازیہ کے لہجے میں اذیت چیخ رہی تھی۔ مگر اس نے مزنی کو بازوؤں میں تھام لیا گویا یہ عندیہ تھا انکار تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بس تیاری کرلو۔

اس رات وہ اپنی کتابوں کو بازوؤں میں بھر کر خوب روئی تھی۔ سسکیاں اس کے وجود کی دیواروں میں دراڑیں ڈال رہی تھیں مگر ماں کے فیصلے کے آگے مجال نہ تھی کہ اُف کرے۔

نکاح سادگی سے ہوا شازیہ نے ضرورت بھر سامان جہیز کے نام پر ساتھ کیا اور دعاؤں کے سائے میں رخصت ہو کر وہ شہزاد کے گھر کے آنگن میں دلہن بن کر اتری۔

ہر دلہن کی طرح آنکھوں میں سہانے خواب...... مگر خوف سے دل دامن گیر لیے۔ اجنبی شخص، اجنبی ماحول، صفیہ ماں کی دور پرے کی رشتے دار تھیں شہر بھی اجنبی کہ وہ حیدرآباد میں مقیم تھے کافی سالوں سے ملاقات بھی نہ تھی۔ شہزاد قطعی اجنبی تھے مزنی کے لیے، کچی عمر اور ماحول کی تبدیلی اسے ہولائے دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

ہم...... گھونگھٹ اٹھایا گیا اور ہنکارا بھرا۔ شہزاد نے اس کے معصوم اور صبیح چہرے کی طرف دیکھا۔

''خوبصورت ہو...... سنا ہے بہت قابل بھی......'' نہ جانے تعریف تھی یا طنز۔

''سنا ہے پڑھائی کا بہت شوق ہے تمہیں؟'' سوال کیا گیا۔ انداز بہت چبھتا ہوا تھا۔ جواب نہ پا کر خود ہی جواب دیا۔

''کیا فائدہ اس تعلیم کا جب ہانڈی روٹی ہی کرنی ہے۔ عورت تو گھر میں چکی چولہا جلانے میں ہی اچھی لگتی ہے یہ تعلیم وکیم کوئی ضروری نہیں۔'' نہ

جانے پہلے ہی دن پہلی ہی رات تعلیم کے خلاف گفتگو اُس کا احساسِ محرومی تھا یا مزنی کی کامیابیوں کے قصے اتنے اس کے گوش گزار کیئے گئے تھے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں باور کروا رہا تھا کہ 'اپنی اوقات میں رہنا' مجھے زیادہ بولنے والی عورتیں پسند نہیں۔ بحث تو بالکل نہ کرنا۔ میں اپنے فیصلوں میں کسی کو شامل نہیں کرتا۔ بہت نخوت سے فرمان جاری ہوا۔

اور ہاں نصیحت سے مجھے چڑ ہے۔ امید ہے تمہیں سمجھ آ گئی ہوگی۔'' مزنی کو لگا اس کی سمجھ دانی تو بہت ہی چھوٹی ہے اس کی باتیں اسے بالکل سمجھ نہیں آئیں مگر پہلے ہی دن اس نے گردن جھکا دی اتنا سخت لہجہ اور اتنی سخت باتیں کب زندگی میں سنی تھیں۔

سر تو جھکانا ہی تھا نا۔

شہزاد مڈل پاس شخص تھا مگر خاصا خوبرو۔ پراپرٹی ایجنٹ کے طور پر کام شروع کیا تو اللہ نے گویا ہاتھ پکڑ لیا ہر بار کی کامیاب ڈیل نے اسے جلد ہی مالی طور پر مستحکم کر دیا۔ صرف ماں ہی گھر میں تھیں اکلوتا ہونے کی وجہ سے لاڈلہ بھی تھا اور خودسر بھی......

چرب زبانی اک اضافی صلاحیت تھی کسی کی سننا یا کسی کی بات ماننا شان کے خلاف محسوس ہوتا۔ مزنی کی معصومیت دل کو بھائی تھی مگر قبولیت کا اظہار مردانگی کیخلاف لگا سو پہلے ہی دن کھری کھری سنا دیں۔

پیسے کی کمی نہ تھی دوستوں کے ساتھ نے کئی خراب عادتیں اُس کی ذات میں شامل کر دی تھیں۔ جن کی خبر ماں کو بھی نہ تھی۔ پینا پلانا شوقیہ تھا۔

شب بسری کے لیے دل لگی کی بھی عادت تھی۔ مزنی پر ان ساری خرابیوں کا ادارک جلد ہی ہو گیا۔ اس رات وہ بہت مضطرب تھی تین ماہ ہو گئے اپنی ماں اور بھائی سے ملے ہوئے دل تو اداس تھا مگر شہزاد کو اتنی دیر ہو گئی تھی مگر گھر نہیں لوٹا تھا ماں کچھ کہتی نہ تھیں اکثر جلد سو جاتیں، مزنی تنہا ہولاتی رہتی۔

آج بھی عشاء کی نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو دل بھر بھر آیا کافی دیر سکون سے نماز پڑھتی رہی مگر رات بھیگتی جا رہی تھی۔ شاید دو بج گئے تھے مزنی نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا کہ شہزاد کب آئے اور وہ نماز میں نہ ہو۔ وہ بری طرح دروازہ پیٹ ڈالتا جس سے ماں کی نیند خراب ہوتی۔ وہ نماز میں مگن تھی۔ شہزاد جھومتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں آدھی بوتل بھی تھی۔ مزنی کے پاکیزہ صبیح چہرے کو دیکھا جو قیام میں اپنے رب کے ساتھ سرگوشیاں کرتی ہر طرف سے بے نیاز تھی۔ شیطان کو حسد و رقابت نے جلا ڈالا، غصے اور طیش کی حالت میں شہزاد کے قدم اس کی طرف بڑھے اس کا دل اس ننھی پاکیزہ جان کو پُرسکون دیکھ کر گویا تپ اٹھا تھا ہاتھ میں پکڑی شراب کی بوتل پوری کی پوری مزنی پر الٹ دی۔

وہ بھیگ جاتی کافی تھا مگر انتہائی مکروہ ناپاک بو کا احساس اُس کی ساری حسیات کو جھنجوڑ گیا بدقت تمام سلام پھیرا...... شہزاد بوتل ہاتھ میں لیے قہقہے لگا رہا تھا۔

''مزا آیا... بہت مزا آیا...... تم کیا سمجھتی ہو تم بڑی پاکباز نیک ہو۔ آج تمہیں بھی اس ناپاکی کا مزا چکھا دیا۔ مزا آیا۔'' مزنی اس کی گھٹیا اور پست ذہنیت پر آنسو پی کر رہ گئی۔

اسے کیا بتاتی وہ ریت کے ڈھیر کی طرح بکھر گئی ہے آخر خاک کی پتلی یہ مٹی کی عورت کب تک اپنے قدموں پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ تند و تیز ہواؤں کے تلخ تھپیڑے اس کی ذات کو ذرہ ذرہ بنا کر بکھیرتے جا رہے ہیں۔ کاش وہ فرار ہو پاتی۔

اس نے بے ساختہ روتے ہوئے دروازے کی سمت قدم اٹھائے شہزاد نے اس کا ارادہ جان کر بوتل کھینچ کر اس کے سر کی طرف ماری۔ شدید تکلیف کا احساس اس کے رگ و پے میں جاگا اور وہ کچھ ہی دیر

میں اندھیروں میں ڈوب گئی۔

شازیہ بیٹی کو بیاہ کر اداس تھیں گھر کی رونق اسی کے دم سے تھی۔ چلتی پھرتی ماں کے ساتھ باتیں کرتی گویا شوہر اور بیٹے کے چلے جانے کے بعد وہ ہی اُن کا سہارا تھی۔ مگر انہوں نے یوں اچانک اسے خود سے جدا کر دیا۔ دل بہت ملول تھا فاخر جیسے ہی آیا وہ اس کے سر ہو گئیں۔

''بیٹا خدا کے لیے مجھے مزنیٰ سے ملوانے لے چلو میرا دل بہت اُداس ہے اس کے بغیر۔'' فاخر نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا جہاں درد کروٹ لیتا نظر آیا اس کا دل پسیج گیا۔

''ٹھیک ہے صبح چلتے ہیں اس کے گھر......''

مزنی کے لیے صبح بڑی رحمت ثابت ہوئی وہ ہوش میں آئی تو شہزاد بے سدھ اوندھا پڑا تھا۔ مزنی نے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا خون بہہ کر اب جم گیا تھا۔ اس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے ساری دنیا جل تھل کر دے نہ جانے کتنی دیر وہ روتی رہی۔ کمزوری و نقاہت سے اٹھنا بھی محال لگ رہا تھا جب وہ کسی طور کمرے سے باہر آئی تو صفیہ اسے دیکھ کر چونکی۔ بڑھ کر تھاما شہزاد کو آواز دی مگر بے کار ثابت ہوئی۔ مزنی ایک بار پھر اُن کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

دوسری بار اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنی ماں کو روتے ہوئے اپنے پاس پایا ایک ہاتھ بھائی فاخر کے ہاتھ میں تھا۔ اسے لگا زندگی دوبارہ مل گئی ہو۔ وہ تیزی سے اُٹھنے لگی۔ فاخر اس کے اور قریب ہوا۔

''نہیں گڑیا...... نہ اٹھو۔'' بھائی کی محبت بھری آواز نے اس کے درد پھر جگا دیے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ فاخر اور اس کی ماں نے اس کے گرد بازوؤں کا سہارا کیا۔

''مزنی میری گڑیا...... تم نے یہ کیا حالت بنالی، ہمیں بتایا بھی نہیں تم پر یہ سب گزر گیا۔'' فاخر بہن کے کرب کو محسوس کر کے گویا آج باپ اور چلے جانے والے بھائی کی کمی پوری کر رہا تھا۔ مٹی کی بکھرتی عورت...... کانچ کی عورت سنبھلنے لگی۔

مزنی نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا اس وقت باپ کی یاد شدت سے آئی۔

بابا آپ کی کانچ کی گڑیا
ضرب لگی تو آہنی نکلی

کبھی کا پڑھا شعر اس کے ذہن میں گونجا۔

''نہیں اب نہیں رونا۔ تم تنہا نہیں ہو میری جان تمہارا بھائی تمہارے پاس ہے تمہارا سہارا ابھی باقی ہے فاخر کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں۔ شازیہ تو روئے ہی جاتی تھیں۔ صفیہ شرمندگی سے نظر اٹھانے کے قابل نہ تھیں۔ بیٹے کی بے جا ناز برداریوں کا انجام کی معصوم جان پہ یوں عذاب بن کر ٹوٹے گا انہیں اندازہ نہ تھا کاش انہوں نے یہ بات پہلے سمجھ لی ہوتی۔

فاخر نے بہن کو بڑھ کر تھاما اور کہا۔

''مزنی اب یہاں نہیں رہے گی۔ اگر شہزاد اپنی قبیح عادتیں چھوڑ دے تو ٹھیک ورنہ مزنی اس شخص کے ساتھ ہرگز نہیں رہے گی جو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے شرعاً بھی اور قانوناً بھی وہ سزا کا مستحق ہے۔''

مزنی نے بھائی کا ہاتھ تھاما اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔

اور اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ اک کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہی نہیں ہوتا اک مٹی کی عورت کے پیچھے بھی مرد کا ہاتھ اور سہارا ہونا ضروری ہے چاہے وہ باپ کی صورت ہو...... بھائی کی یا شوہر کی...... بات ذرا سی ہے مگر سمجھ میں آجائے تو مرد اپنا فرض جان لے سمجھ لے ادا کرے تو کوئی بہن، بیوی بیٹی تنہا اور بے سہارا نہ رہے۔ مزنی نے مطمئن ہو کر بھائی کی طرف دیکھا اور مضبوطی سے قدم اٹھا لیے۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

اُمِ مریم

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

''اگر تم ایسا سوچتی ہو قدرا تو پھر لازم ہے یہ بھی سوچو کہ یہ فرض صرف میرا نہیں تمہارا بھی ہے۔ یہ بھی سوچو کہ تم نے مجھے خوش رکھنے کی کتنی کوشش کی۔ میری خوشی کا کتنا خیال رکھا۔ جہاں تک میری بات ہے تو میں شادی کے بعد اس معاملے میں اپنے دل پر کوئی بوجھ نہیں پاتا۔ زندگی میں صرف ایک معاملہ نہیں ہے۔ ازدواجیات کا معاملہ، اس میں باقی......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا ستائیسواں حصہ

''یو نو واٹ...... ؟ حضرت یوسفؑ کو اللہ تعالیٰ نے ان کے والد حضرت یعقوبؑ سے جدا کر دیا تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے حضرت جبرئیلؑ سے اس کی وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ...... آپ کے دل میں آپ کے بیٹے کی محبت اللہ کی محبت سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس لیے اللہ نے آپ کو ان سے جدا کر دیا۔ بیس سال بعد ملنے کی اجازت ملی۔ جب ملے تو باپ بیٹا گلے لگ کر اتنا روئے کہ بے ہوش ہو گئے۔ پھر اٹھے۔ پھر اتنا روئے کہ پھر بے ہوش ہو گئے۔

حضرت جبرئیلؑ نے رشک سے پوچھا۔

''یا اللہ! اتنی محبت بھی کوئی کسی سے کرتا ہے؟'' اللہ نے ارشاد فرمایا۔

''جبرئیلؑ میں امتِ محمدﷺ کے ہر فرد سے اس سے ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہوں۔ تو کیا اُسی محبت کرنے والے رب کا یہ حق نہیں کہ ہم بھی اپنے مال و زر اولاد سے زیادہ اُس کو محبت کریں۔

یہ بالکل اُس کا حق ہے۔'' وہ مسکرا رہے تھے۔ جیسے سرشار تھے خود بھی اسی محبت میں، ارسل گنگ بیٹھا تھا۔ اس نے کہاں سنی تھیں ایسی باتیں۔

''میں بھی اللہ سے ایسی محبت کرنا چاہوں تو......'' اُس کی زبان سے پھسل گیا۔ سوال ایسا تھا کہ عبدالہادی کی مسکان گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

''تو کر لو...... یہ کوئی مشکل کام تھوڑی ہے۔ تم ایک قدم بڑھاؤ۔ وہ خود ستر قدم آئے گا۔ تم پھر دوسرا قدم بڑھانا...... وہ پھر ستر قدم تمہاری جانب کا راستہ اختیار کرے گا۔'' ارسل کی آنکھیں ساکن ہونے لگیں۔ ہونٹ نیم وا، اس کے لب کانپنے لگے۔

''مم...... مگر کیسے......؟''

''سو کمپل بیٹے! تم اللہ کے راستے پر چلو۔ ہر نیکی خالصتاً اُس کے لیے کرو۔ نماز اس طرح اس احساس کے ساتھ پڑھو کہ تم اُس سے باتیں

کررہے ہو۔ اس کے ہر حکم کی فرمانبرداری کرو۔ اُس کا شکر بجالاؤ۔ وہ تمہیں محبت کی توفیق بھی بخش دے گا۔ اللہ کی مخلوق کے لیے نرم ہو جاؤ ان کی ہر زیادتی کا جواب احسان سے دو۔ معاف کرنے میں اعلیٰ ظرف بن جاؤ۔ کوئی تمہیں دکھ دے۔ اس کے بدلے سکھ پہنچاؤ۔ معاف کردو اللہ کے بندوں کو پانی پلانا خود پر فرض کرلو۔ سب سے بڑا صدقہ ہے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ افضل نیکی ہے۔''

ارسل احمد ایسا نہیں ہے۔ مگر ارسل احمد ایسا بن سکتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ کوشش کرے گا۔ اس لیے کہ وہ اللہ سے دعا مانگے گا۔ اس سے توفیق مانگے گا۔'' اس کی خاموشی اور چہرے سے ٹپکتی بے مائیگی کے احساس کو پاکر ہی عبدالہادی نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ وہ جھینپا تھا اور انکساری سے مسکرانے لگا۔

☆......☆......☆

صبح تک اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ عبدالعلی بے حد خاموش تھا۔ وہ اسی قدر خفا نظر آتی تھی۔ ساری رات جاگ کر گزاری تھی۔ ساری رات ہی جیسے برباد ہوگئی تھی۔ عبدالعلی کو لگتا تھا اس پہ کسی ایک بات کا بھی اثر نہیں تھا جیسے۔ ہر بات کا الٹ جواب ہر نصیحت کا غلط اثر۔

یہ قدر عبدالعلی کا دماغ کھولا۔ اسے خود پر جبر کرنا پڑا۔ مگر وہ کوشش کرنا چاہتا تھا۔

''تھوڑی سی گنجائش نکالو قدر! دل بڑا کرو۔ یہ ہرگز اتنا مشکل کام نہیں۔'' وہ اس پر جھکا اور محبت کے سچے احساس سے لبریز بوسہ اس کی پیشانی پر ثبت کیا تھا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں قدر! تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تمہارے احساسات کی پروا ہے مجھے جبھی منا رہا ہوں۔ اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔ میری خاطر مسکراؤ پلیز۔''

وہ جیسے منت کررہا تھا۔ قدر کے چہرے پر موجود رہی سہی نرمی بھی غائب ہونے لگی۔ وہ سمجھتی تھی۔ اگر وہ یہاں ڈھیلی پڑگئی۔ عبدالعلی من مانی کرے گا۔ وہ اسے من مانی کرنے دینے کی ہی روادار نہ تھی۔

عبدالعلی کا چہرہ بجھنے لگا۔ آنکھوں کی آس مرنے لگی۔ مگر ہمت پھر بھی نہیں ہاری۔

''مسکراہٹ ایک انمول تحفہ ہے۔ جو غریب سے غریب آدمی بھی کسی کو پیش کرسکتا ہے۔ پھر تمہاری مسکراہٹ پر تو سب سے بڑا حق بھی میرا ہے۔ یہ بخل کیوں قدر......! جبکہ تم میرا دل بھی رکھ سکتی ہو۔'' قدر نے روٹھے پن سے اسے دیکھا پھر کچھ اور بھی تلخی سے گویا ہوئی تھی۔

''آپ لفظوں کے جادوگر ہیں۔ میں بہت پہلے تسلیم کرچکی۔ مگر عبدالعلی صاحب! آپ اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ نہ صرف ظالم ہیں بلکہ مغرور بھی ہیں۔''

عبدالعلی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ قدر نے ہاتھ اُٹھا کر اسے ٹوک دیا۔ گویا کہہ رہی ہو بس مجھے سنو۔ اب میری باری ہی ہے بولنے کی۔ عبدالعلی خاموش ہوگیا۔ وہ بھی اسے بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا جیسے۔

''آپ کو میری بات سے لاکھ اختلاف ہو مگر میں تسلیم نہیں کروں گی۔ یہ حقیقت ہے تکبر کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ آپ میں بھی جو تکبر ہے۔ آپ کا نفس آپ کو اس کا پتا نہیں لگنے دے دیا۔

اس کا انداز ترش تھا۔ تیکھا اور سرد بھی۔ عبدالعلی اس عجیب بات جس کا جانے کوئی واقعی سر پیر نہیں تھا۔ یا اسے محسوس نہ ہوا عجیب سی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جھنجلاہٹ نے آن لیا۔

”کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں نے تمہارے حقوق ادا نہیں کیے قدر!“ وہ یکدم بے تحاشا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ قدر نے پروا نہیں کی۔

”ہاں کیے، مگر ٹھیک طرح سے نہیں۔ مجھے خوش رکھنا۔ میری خوشی کا خیال رکھنا بھی آپ کا فرض ہے۔“ وہ جیسے جتلا رہی تھی۔ عبدالعلی نے اس کا سر اپنے کاندھے سے ہٹایا۔ ہاتھ سے اسے خود سے الگ کیا اور فاصلے پر ہوتا بستر سے اتر گیا۔

”اگر تم ایسا سوچتی ہو قدر! تو پھر لازم ہے یہ بھی سوچو کہ یہ فرض صرف میرا نہیں تمہارا بھی ہے۔ یہ بھی سوچو کہ تم نے مجھے خوش رکھنے کی کتنی کوشش کی۔ میری خوشی کا کتنا خیال رکھا۔ جہاں تک میری بات ہے تو میں شادی کے بعد اس معاملے میں اپنے دل پر کوئی بوجھ نہیں پاتا۔ زندگی میں صرف ایک معاملہ نہیں ہے۔ ازدواجیات کا معاملہ، اس میں باقی کے معاملات بھی ہیں۔ اور بھی حقوق و فرائض ہیں۔ جن میں کسبِ حلال خلق خدا کی خدمت بھی ہے۔ ڈیوٹی بھی ہے۔ اور ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔

”قدر......! انفرادیت کے جنون نے انسان کو اندر سے کھوکھلا اور اندھا ہی نہیں اندر سے تنہا بھی کر دیا ہے۔ وہ بے تحاشا تھکا ہوا نظر آنے لگا۔ بے حد دکھی اور افسردہ۔

زندگی سکون آسودگی محبت آسائشوں کا نام نہیں ہے۔ اس کے کچھ فرائض بھی ہیں۔ جنہیں بہر طور ادا کرنا ہے۔ اور میں ان سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ میں جانتا ہوں یہاں تمہیں ہرٹ کر رہا ہوں مگر معاف کر دینا ہو سکے تو...... اور سوچنا ضرور ان باتوں پر جو میں نے کہی ہیں تم سے۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ...... سوچنے والوں کی دنیا، دنیا والوں کی سوچ سے الگ ہوتی ہے۔ بس...... فی الحال مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ کمرے سے نکل گیا۔

فجر کی اذان کی مقدس پکار فضا میں ابھر رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ تلاوتِ کلام پاک میں مصروف ہوا تھا۔ مسجد سے لوٹا تو اتنا ٹائم بھی نہیں تھا کہ ناشتہ کر سکتا۔ لاریب اور عمیر کے ساتھ عبدالغنی بھی منتظر تھے۔

”اتنی دیر کیوں کر دی بیٹے!“ لاریب جیسے شاکی تھیں۔ اس نے اپنے بازو ان کے گلے میں حمائل کر دیے۔

”معاف کر دیں اماں! پتا ہی نہیں چل سکا ٹائم کا۔“

”قدر کو نہیں منا سکے تم......؟“ عمیر کے سوال پر وہ گہرا سانس بھرتا ہونٹ بھینچ گیا۔

”کچھ کام ہمارے بس کے نہیں ہوتے۔ انہیں وقت صحیح طور پر انجام دیتا ہے۔ میں یہ معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر چکا۔“

”بیٹے روٹھی ہوئی بیوی کو منانا ہرگز مشکل کام نہیں ہے۔“

ہارون جو اسی وقت آئے تھے۔ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔ عبدالغنی کے ساتھ باقی سب بھی مسکرائے۔

”بوجانی جیسی صابر و شاکر نہیں ہوتی ہیں ساری بیویاں، کیوں بابا جان......! آپ کو بھی اماں کی ضدوں سے پالا تو پڑتا رہا ہے۔ محترمہ بھی ایسا ہی مزاج رکھتی ہیں۔“ عبدالعلی بظاہر ہنس رہا تھا۔ عبدالغنی کے ساتھ لاریب بھی جھینپ گئی۔

”بہت بدتمیز ہو۔ وہ ماضی بعید کا قصہ ہے۔ بعد میں کبھی ان حضرت کی مرضی کے خلاف نہیں

چلی۔ لاریب نے گویا اپنی پوزیشن کلیئر کرنی چاہی۔ ساتھ ہی وہ عبدالعلی کے منہ میں خود نوالے ڈال رہی تھیں۔

''پھر تو بابا جان نے غلطی کی۔ انہیں اک اور شادی کرنی چاہیے تھی۔ کیوں امی حضور......؟'' وہ عبیر کی طرف جھکا۔ وہ مسکرا کر اس کے بال سنوارنے لگیں۔

''قدر کو بلاؤ ذرا...... ناشتا تو ساتھ کرلے۔'' لاریب نے عبدالاحد کو مخاطب کیا تو عبدالعلی نے ٹوکا تھا۔

''رہنے دو ورنہ وہ اس بات پر بھی جل جائے گی کہ اس کے حصے کا کام اماں نے کیوں کر دیا۔'' اس کا اشارہ ان نوالوں کی طرف تھا۔ جو ابھی بھی لاریب اس کے منہ میں ڈال رہی تھیں۔ جبھی خاصا بُرا منایا تھا انہوں نے اور اسے ایک جھانپڑ لگا دی۔

''اتنا بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میری بیٹی ہے۔'' انہوں نے بے دریغ گھورا۔ عبدالعلی سر کھجانے لگا۔

''بابا جان قسم سے کبھی کبھار تو دل کرتا ہے میں بھی دوسری شادی کرلوں۔ امی جان جیسی صابر و شاکر لڑکی سے...... جو میری آبرو جنبش پر قربان ہونے والی ہو۔ راضی بارضا، نہ شکوہ نہ شکایت......''

وہ کھل کر ہنس رہا تھا جب قدر نے وہاں قدم رکھا۔ چونکہ بات سن چکی تھی۔ جبھی تیوری چڑھ گئی۔ البتہ کچھ بولنے سے گریز ہی برتا تھا۔ آخر ناراضگی بھی تو ظاہر کرنی تھی۔

''عبدالعلی تنگ نہیں کرو قدر کو پلیز......'' عبیر نے ہی ٹوکا تھا۔ وہ گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ پھر کرسی دھکیل کر اٹھا اور کمرے میں آ کر اپنا بیگ کاندھے پر ڈال لیا۔ سیل فون جینز کی پاکٹ میں اڑسا۔ تب ہی قدر بھی اس کے پیچھے اندر گئی تھی۔ جیسے آنسوؤں کے سامنے بے بس لاچار۔ خود سراپا آنسو بنی ہوئی۔ عبدالعلی اسے دیکھتا رہا۔ پھر چند قدم چل کر اس کے مقابل آنے کے بعد دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔

وہ خاموش ہوا تھا۔ جبکہ وہ تڑپ گئی تھی جیسے تھرا گئی تھی۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا تو ہاتھ لرزتے تھے۔ آنکھیں طوفان کی زد پر آئے سمندر کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔ وہ پھر بے تحاشا رو پڑی۔

''بہت ظالم ہیں آپ۔'' عبدالعلی نے اسے بازوؤں میں بھرلیا۔ ہونٹ اس کے مہکتے بالوں سے ٹکا دیے۔

''بس اتنی سی بات تھی۔ تھوڑا سا خود کو آزاد خیال بنالیتے۔'' وہ سسک سسک کر کہہ رہی تھی۔

''آزادی ہرگز اس کا نام نہیں ہونا چاہیے کہ اخلاق کی مذہب کی پابندی نہ کی جائے۔'' عبدالعلی نے اصلاح کی تھی۔ وہ پھر بھی روئے گئی۔ عبدالعلی مزید گویا ہوا۔

''حقیقی روشنی وہ ہے جو انسان کے باطن سے پھوٹ کر اس کے نفس کی تاریکیاں اس پر واضح کرے۔ قدر! اللہ نے اس روشنی سے نوازا ہے تو ہمارا فرض اولین ہے یہ کہ اس روشنی سے دوسروں کو بھی منور کرنے کی کوشش کریں کہ سوچ یہ ہونی چاہیے کہ مرجانا ہے اس لیے عمل ضروری ہے۔ نہ کہ اگر مر ہی جانا ہے تو عمل کی کیا ضرورت...... مثبت سوچ بھی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

''بس ایک گزارش ہے قدر! مجھ سے خفا نہ رہنا۔ مجھ سے بدگمان نہ ہونا۔ میں فرض کی ادائیگی

پر مامور ہوں۔ دعا کرنا، کامیاب ٹھہروں، تمہیں فون کروں گا۔ ملنے بھی آؤں گا۔ بس گھبرانا نہیں۔'' عبدالعلی نے پھر اسے لپٹایا۔ پھر اس کی پیشانی چومی اور خود سے آہستگی سے الگ کر دیا۔ قدرو ہیں کھڑی اس کو خود سے دور ہوتا خود سے فاصلے پر جاتا دیکھتی اور اپنا دل خون ہوتا محسوس کرتی رہی۔ وہ نہیں کہہ سکی، کاش اس دوران تمہارے پیار کی نشانی میرے پاس رہی ہوتی۔ کاش ایسا کوئی انتظام ہوا ہوتا۔ وہ جتنی بھی بولڈ تھی۔ وہ جتنی بھی پُر اعتماد تھی۔ بہر حال یہ خواہش اس کے سامنے ظاہر نہ کر سکتی تھی، نہ کر سکی تھی۔ بے بسی آنسوؤں کی صورت اس کی آنکھوں سے بہتی رہی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ وہ اس کا محبوب تھا۔ وہ اس کے بچے کی ماں بننے کی خواہش کتنی شدت سے اپنے اندر پاتی تھی۔ یہ صرف وہ جانتی تھی۔ عبدالعلی نے تو اس اہم معاملے پر شاید دھیان بھی نہیں دیا تھا۔

☆......☆......☆

''ہائے گائز! گڈ ایوننگ!'' وہ اندر آیا تھا۔ بیگ صوفے پر اچھالتے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا اس کے برابر ہی کاؤچ پر ڈھیر ہو گیا۔ اتباع جو عبدالاحد کے ہمراہ بیٹھی کسی اہم بات پر ڈسکس کرنے میں مصروف تھی۔ خفیف سی ہوئی نہ صرف تیزی سے فاصلے پر ہوئی بلکہ اٹھ ہی گئی تھی۔

''السلام علیکم بھائی!'' عبدالاحد بھی خفت زدہ بولا تھا۔ دراصل ان کا یہ ماحول نہیں تھا۔ عبداللہ کھلے دل و دماغ کا انسان تھا۔ ان باتوں کو کبھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

''وسلام! کیسے ہو......؟ عبدالعلی چلا گیا......؟'' عبداللہ نے ٹائی گلے سے کھینچ کر فاصلے پر اچھالی اور خود جھک کر جوتے اتارنے لگا۔

''جی بھائی جان کل چلے گئے تھے۔ آپ نہیں آئے انہیں ملنے کو۔'' عبدالاحد کا انداز ہلکا سا شکوہ کناں ہوا۔

''ہاں یار! آفیشل ٹور پر میں آؤٹ آف سٹی تھا۔ اتباع یار پانی تو پلا دو۔'' عبدالاحد کو وضاحت کرتے اس نے اتباع کو ہانک لگائی۔ جو باہر جا چکی تھی۔ اس پر دھیان دیے بغیر کہ عبدالاحد ایک بار پھر خجل ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا ہے۔

''جی وہ تو اتباع بتا چکی ہے مجھے۔'' وہ یہی کہہ سکا۔ ساتھ ہی اُٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔

''چلتا ہوں، اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ گھڑی دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھو یار! چائے تو پی لو۔'' عبداللہ کے ٹوکنے پر وہ مسکرایا تھا۔

''میں پی چکا ہوں۔ دو گھنٹے ہو گئے آئے ہوئے۔ اتباع کی بکس دینے آیا تھا، کچھ نوٹس بھی تھے۔ بوجان کا انتظار کر رہا۔ وہ آئی نہیں بازار سے......میرا سلام کہہ دیجیے گا۔''

اس سے مصافحہ کرتا وہ پلٹ کر چلا گیا۔ اتباع چائے اور پانی سمیت لوٹی تو عبداللہ اس کا منتظر تھا۔

''عبدالاحد......!'' وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''چلا گیا۔'' عبداللہ نے اس سے پانی کا گلاس تھاما۔

''ماما اکیلی گئی ہیں مارکیٹ......؟''

''نہیں ماموں جان ساتھ ہیں۔'' وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

''کس سلسلے میں شاپنگ کرنے گئے ہیں؟

مجھے بھی لے کر جانا تھا تمہیں باہر...... اسی لیے تو جلدی آیا تھا۔'' عبداللہ نے بے زاری سے کہہ کر اسے دیکھا۔

''امن کے لیے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ آ تے ہوں گے وہ لوگ۔'' عبداللہ نے گلاس رکھ کر چائے کا مگ اٹھالیا۔

''تم ذرا اچھا سا تیار تو ہو جاؤ جانِ من!''

اتباع کے چہرے پر خفیف سی سرخی چھا گئی۔ پلکیں حیابار انداز میں جھکیں۔

''کہاں جائیں گے؟''

''کھانا باہر کھائیں گے۔ اک سرپرائز بھی ہے تمہارے لیے۔'' عبداللہ کا موڈ ضرورت سے زیادہ بشاش تھا۔

''عبداللہ باہر جانے کے لیے تیار ہونا ضروری تو نہیں ہوتا۔'' اتباع جز بز تھی۔ عبداللہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ تو پردہ کرتی تھی۔ پھر اس تیاری کی ضرورت بھی کیا تھی۔ عبداللہ گہرا متاسفانہ سانس بھر کے سیدھا ہو بیٹھا۔

''یہ بات تو بھول ہی جاتا ہوں میں، خیر ہم فیملی کیبن میں ہوں گے۔ سو تم تیار تو ہو ہی جاؤ۔''

عبداللہ کی وضاحت پر وہ قدرے ریلیکس ہوتی اٹھی تھی۔ اپنے لیے اس نے پنک کلر کا لباس منتخب کیا تھا۔ ساتھ میں پرل کی جیولری...... نیچرل پنک لپ اسٹک اور لپ گلوس نے اسے ایک دم سے بے تحاشا حسین روپ دے دیا تھا۔ عبداللہ اپنے دھیان میں اندر آیا تھا۔ مگر اس پر نگاہ ڈالتے ہی جیسے مبہوت ہو کر رہ گیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔'' اتباع کی نظر اٹھی اس کے انداز پر بے تحاشا سرخ پڑنے لگی۔

کری دھنی نے ہی لبوں پر لرزش اترنے لگی تھی۔

بے اختیاری کی جس کیفیت میں اس کے نزدیک آیا تھا۔ اسی بے اختیاری میں گنگنایا۔

اتباع کا دل بے تحاشا دھڑک اٹھا۔ گال اس کی قربت میں دہکنے لگے۔

''سرپرائز کیا ہے؟'' وہ اس کی توجہ بٹانا چاہتی تھی۔ مگر اب ایسا ممکن نہیں تھا۔

''تم کتنی حسین ہو۔ تمہارے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں، ہونٹ آنکھیں......''

''عبداللہ......! بو جانی آ گئی ہوں گی۔''

عبداللہ اس کے گریز اور حیا کو سمجھتا تھا اس لیے ہنسنے لگا۔

اتباع آہستگی سے مسکرا دی۔ پھر بال سمیٹ کر کیچر میں قید کیے اور خود اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''نماز پڑھی تھی آپ نے؟'' اس نے جیسے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ عبداللہ نے محض سر ہلا دیا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ نماز پڑھ نہیں سکا تھا۔ مگر سچ بول کر اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتباع نے اُٹھ کر وارڈ روب کھولی اور عبایا نکال کر پہننے لگی۔

''یہ ایئر سٹڈ اُتار دو اتباع......!'' عبداللہ نے ہاتھ سے اس کے کان کی لو کو چھوا۔ اتباع حیران رہ گئی۔

''کیوں...... اچھے نہیں لگ رہے؟'' اس کا انداز معصومیت بھرا تھا۔ عبداللہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''نہیں...... اچھی تو بہت لگ رہی ہیں۔ بلکہ زیادہ ہی پیاری لگ رہی ہیں جبھی......'' اتباع کی آنکھوں سے اُلجھن ہنوز نمایاں تھی۔ وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتا گنگنایا۔

گال کی جانب جھکتی ہے
شرماتی ہے ہٹ جاتی ہے

آج ارادہ ٹھیک نہیں ہے

جاں تیری بالی کا

اس کا انداز جتنا شوخ و شنگ تھا۔ اتباع اسی حد تک خفت سے سرخ پڑ گئی۔

''آپ بھی نا......'' وہ حجاب آمیز کوفت سے اسے گھورنے لگی۔ عبداللہ نے محظوظ ہوتے اسے بازوؤں میں بھر کے اسے بالیاں کھولنے سے روکا۔

''چلو جانے دیتے ہیں۔ کیا یاد کرے گی تمہاری بالی بھی، آج تھوڑا سا فراخ دل ہو جاؤں گا میں۔'' اتباع کی لانبی پلکیں اس کے صبیح گالوں محشر سا برپا کرنے لگیں۔ اس پر عیاں تھا۔ وہ عبداللہ کی پسند بلکہ محبت ہے۔ مگر یہ محبت ایسا جنون ہے یہ نہیں معلوم تھا۔ خلوت کے لمحات میں اپنی بانہوں میں بھر کے جب جب بھی وہ اسے اپنی محبت کے قصے سناتا۔ وارفتگیاں ظاہر کرتا تو اتباع کو تمام تر شرم و حیا کے پہلو بچانا مشکل ہو جایا کرتا۔ وہ مرد تھا۔ اظہار میں بے شرم اور وہ عورت تھی لاج کی ماری ہوئی...... عبداللہ کی محبت کی بارشوں نے اسے ہرا بھرا کر دیا تھا۔ مگر وہ فطرتاً شرمیلی تھی۔ اسے خود تو کیا اظہار کرنا تھا۔ وہ تو اس کی بے تابیوں سے بھی گھبرا گھبرا جاتی۔ دامن بچاتی۔ جبکہ عبداللہ اسے مسلسل اکساتا تھا کہ وہ بھی اظہار کرے۔ اس کی یہ خواہش اصرار میں پھر شدید اصرار میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ مگر وہ ایسا حوصلہ کہاں سے لاتی۔ زبان کھلتی ہی نہ تھی مارے حجاب کے، نہیں جانتی تھی یہ بھی اس کی غلطی ہے۔ عبداللہ کی خواہش حسرت میں بدلی تو کبھی بیگانگی یا اضطراب میں بھی ڈھل سکتی ہے۔ یا وہ اس نے اظہار سننے کو ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں بھی کر سکتا تھا۔ جیسے اس وقت ہوٹل میں وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی توجہ حاصل کر کے بھی کسی دوسری لڑکی کو اگر بار بار دیکھ رہا تھا تو اس کے پیچھے بھی یہی خواہش ہمک رہی تھی کہ وہ اسے روکے، یا اس پر واضح کرے کہ اسے اس کا کسی کو دیکھنا پسند نہیں ہے۔

مرد جتنا بھی میچور ہو جائے۔ اس کے اندر اک چھوٹا بچہ کہیں چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ جو توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ جو پیار کا متقاضی ہوتا ہے۔ جو مان دیتا ہے تو پانا بھی چاہتا ہے۔ عبداللہ کی اگر یہ خواہش تھی اگر یہ چاہت تھی تو کچھ ایسی غلط نہیں تھی۔ مگر قسمت کہ اس کے نصیب میں اک یکسر عام لڑکی نہیں آئی تھی۔ وہ انوکھی تھی۔ اس کی سوچیں بھی انوکھی تھیں۔ اس نے عبداللہ کو ٹوکا تھا۔ مگر ٹوکنے کا یہ انداز ویسا نہیں تھا۔ جیسا کہ عبداللہ خواہش رکھتا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' وہ مسکراہٹ دبا رہا تھا۔ جبکہ اتباع سنگین و فطین سنجیدگی کے حصار میں تھی۔

''برا لگا تمہیں میرا اس لڑکی کو دیکھنا......؟'' وہ اب کھل کر مسکرا رہا تھا۔

''میرے برا لگنے کی آپ کو پروا نہیں ہونا چاہیے عبداللہ! اللہ کو برا لگا یہ پروا کر لیں کافی ہے۔ پہلی نگاہ معاف ہے۔ دوسری نگاہ...... اور غیر محرم کو دیکھنا خواہش سے دیکھنا آنکھ کا زنا ہے۔''

عبداللہ کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔ رنگ بدل گیا۔ وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔ مگر کچھ مذاق سنگین ہوتے ہیں۔ اس کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ ہم اس لاپرواہی اور ازلی کوتاہی کے سبب ان گنت گناہوں سے جھولی بھرتے رہتے ہیں۔ عقل سلیم رکھنے کے باوجود افسوس صد افسوس......

''اتباع......!''

''عبداللہ! نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے۔ جو شخص باوجود دل کے تقاضوں کے نظر پھیرے تو اس کے بدلے میں اس کو ایسا پختہ ایمان ملے گا۔ جس کی لذت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو حضرت علیؓ کا قول سنایا کہ...... ''پہلی نگاہ معاف ہے۔ دوسری گناہ' اصل زنا جس کو کہتے ہیں سب کو ہی معلوم ہے۔ لیکن زنا کے اسباب کو بھی زنا کہا گیا ہے۔ آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے۔ اور کانوں کا زنا سننا ہے۔ اور زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے۔''

وہ ہنوز بول رہی تھی۔ عبداللہ کے ذہن پر دھند سی چھانے لگی۔ اسے ایک بار پھر صاف محسوس ہوا اتباع خود کو اس سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ہاتھ سے چمچ چھوڑ دیا۔ اس کا دل اتنا خراب تھا وہ اس درجہ ہرٹ تھا کہ اس پل اتباع کو وضاحت بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہرگز سنجیدہ نہیں تھا۔ محض مذاق کر رہا تھا۔ جبکہ وہ جیسے ایسی کیفیت کے زیر اثر گویا اپنے تئیں اسے سمجھا رہی تھی۔

''کسی مرد عورت میں جب ناجائز تعلقات ہوتے ہیں تو یکلخت نہیں ہو جاتے...... بلکہ پہلے سے ایسے کام کیے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے قریب سے قریب تر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے شریعت مقدسہ نے ان محرکات و اسباب کو بھی زنا قرار دیا ہے۔''

وہ بات غلط نہیں کر رہی تھی۔ وہ بالکل درست اور جائز بات کر رہی تھی۔ لیکن واعظ کرنے والے کو اگر انسانی نفسیات پہ بھی کچھ سوجھ بوجھ ہو تو احساسات و جذبات کے تحت اگر نصیحت کی جائے تب وہ اثر پذیر اور فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ عبداللہ جتنا ہرٹ ہوا تھا۔ یہ ہی سوچ رہا تھا۔ والٹ سے نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھتے وہ خود کرسی دھکیل کر کھڑا ہوا، تب اتباع کو اس کے موڈ کی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ جبھی پہلے حیران پھر مضطرب ہونے لگی۔

''عبداللہ...... کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ لمبے ڈگ بھرتا کیبن سے نکل آیا۔ اتباع کو اس کا ساتھ دینے کو باقاعدہ بھاگنا پڑ رہا تھا۔

''پھر کھانا کیوں نہیں کھایا؟'' وہ ششدر ہونے لگی۔

''بھوک نہیں تھی۔'' عبداللہ کا انداز ہنوز تھا۔ وہ خفا ضرور تھا۔ مگر خفگی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

''آپ کسی سرپرائز کا کہہ رہے تھے؟'' اتباع نے اس کا چہرہ جانچنا چاہا۔

''ایسے ہی کہہ رہا تھا۔''

اتباع خاموش ہو گئی۔ وہ اپنی فطرت سے زیادہ کرید کر چکی تھی۔ مزید کی تاب نہ رکھتی تھی۔ باہر رات مکمل طور پر چھا چکی تھی۔ اسٹریٹس لائٹس روشن تھیں۔ ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ یعنی موسم خوشگوار تھا۔ وہ منہ سے دھواں اڑاتا ایک ہاتھ میں سگریٹ دبائے دوسرا پینٹ کی جیب میں گھسائے پارکنگ کی جانب آیا تھا۔ اور گاڑی کے دروازے ان لاکڈ کرتا خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

اتباع نے اس کے برابر جگہ سنبھالی اور دروازہ بند کر دیا۔ عبداللہ منہ میں سگریٹ دبائے اسی گھمبیر سنجیدگی کی لپیٹ میں گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اس کے

لبوں سے کھینچ لی۔

''آپ نے کہا تھا بلکہ وعدہ کیا تھا اسموکنگ نہ کرنے کا مجھ سے۔'' وہ خفا نظر آ رہی تھی۔ عبداللہ خاموش رہا۔ اتباع کی ناراضگی کا گراف بڑھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم اس موضوع پر نہ ہی بات کریں تو اچھا ہے۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر سامنے دیکھنے لگا۔ گاڑی کا انجن غرایا اور ایک خفیف سے جھٹکے سے کار آگے بڑھی۔ اتباع تو ششدر ہو کر رہ گئی تھی۔

''کیا مطلب ہے اس بات سے؟'' وہ ناگواری نہیں دبا سکی۔

''پھر کیا کہوں اور...... ظاہر ہے۔ میں کچھ بھی کرلوں۔ تم جیسا حقیقی پرہیز گار نہیں بن سکتا۔'' عبداللہ کا انداز زہر سے بھرا ہوا تھا۔ اتباع کو شاک لگا تھا۔ اس نے غیر یقین نظروں سے اسے دیکھا۔ گویا یقین نہ آ رہا ہو جو کچھ اس نے کہا یا سنا ہے وہ ہی مطلب تھا۔

''آپ نے ایسا کیوں کہا......؟ میرا مطلب تو ہرگز ایسا نہیں تھا۔'' وہ جیسے روہانسی ہوئی۔ عبداللہ کے وجیہہ دلکش چہرے پر اکتاہٹ کے تاثرات ابھرے۔

''خاموش رہو اتباع! میں بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ اتباع کے حواس سلب ہو کر رہ گئے۔ ہونٹ بھینچے ہوئے وہ بے اختیار چہرے کا رخ پھیر گئی تو مقصد ان آنسوؤں کو چھپانا تھا۔ جو اس بے اعتنائی کے نتیجے میں آنکھوں سے برسنے کو بے قرار ہوتے پلکوں کی دہلیز پھلانگنا ہی چاہتے تھے۔

سرِ لامکاں سے طلب ہوئی
سوئے منتہیٰ وہ چلے نبی ﷺ
کوئی حد ہے اُن کے عروج کی

ارسل نے کتاب بند کر دی۔ لاؤڈ اسپیکر آن کیے پانچ سات سال کا بچہ بہت خوشی خوشی نعت پڑھ رہا تھا۔ پاس اس کا باپ موجود تھا۔ آنکھوں میں محبت لیے۔ اسپیکر آن کرنے سے قبل بچے کے باپ نے عبدالغنی سے اجازت طلب کی تھی کہ اس کا بچہ نعت گوئی کا شوق رکھتا ہے مگر آج مسجد کے اسپیکر میں پڑھنے پر بضد ہے۔ اور عبدالغنی منع نہیں کرتے تھے۔ بچے کی زبان تو تلی نہیں تھی۔ ہاں البتہ کسی حد تک اعتماد سے عاری تھی۔ اس کے باوجود وہ تلفظ بالکل صحیح ادا کر رہا تھا۔ ارسل احمد کے ہونٹوں پر مسکان اترنے لگی۔

وہ اک وجد کی کیفیت میں آ کر جھومنے لگا۔ اسے عبدالہادی کی بات یاد آ گئی۔ جو ایسے ہی کسی موقع پر انہوں نے کہی تھی۔

''اللہ کی وحدت کا انکار کرنے والے، اللہ کو تسلیم نہ کرنے والوں کے لیے اس سے بڑھ کر کیا مقام شرم ہو سکتا ہے کہ وہ بے سمجھ بچوں سے جنہیں اور کوئی بات نہیں کرنی آتی۔ ان کی زبان پر کلمہ جاری کرا دیتا ہے۔ ایک سال کا بچہ کلمہ پڑھتا ہے۔ رب کی وحدت کا اقرار کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا یہ کرشمہ عبدالغنی......!''

اور عبدالغنی بے ساختہ مسکرانے لگے تھے۔ وہ ایک بار کے نہیں متعدد بار کے گواہ تھے۔ عبدالعلی 'عبدالاحد' اتباع' عبداللہ! یہ سب بچے ان کی نظروں کے سامنے پلے بڑھے تھے۔ یہ نظارہ ان کی نگاہوں کے سامنے بارہا مرتبہ آ چکا تھا۔

''انکل......!'' اسپیکر بند ہوا۔ بچہ باپ کے ہمراہ رخصت ہو گیا۔ عبدالغنی بھی شاید اُٹھ جاتے اگر جو ارسل انہیں نہ پکار لیتا۔ انہوں نے نظروں کا زاویہ بدل کر مشفق انداز میں انہیں دیکھا۔

''مجھے کچھ اشعار کا مطلب پوچھنا تھا۔'' اس نے ہاتھ میں موجود کتاب ان کی طرف بڑھا دی، جو کھی ہوئی تھی۔ اور اشعار کو باقاعدہ انڈر لائن کیا ہوا تھا۔

''میں کل سے اُلجھ رہا ہوں۔ مگر کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ اک خیال یہ بھی آیا۔ خدانخواستہ شاعر نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا۔

عبدالغنی کی نظریں اس کی بات سنتے ہی کتاب پر پھسل رہی تھیں۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا
میں وہ صبرِ رحیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پر لیا تھا
تو نے کیوں ...... میرا ہاتھ نہ پکڑا
جب میں رستے سے بھٹکا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں تیرے درشن کا پیاسا تھا

انہوں نے زیرِلب اشعار پڑھے تھے پھر کتاب بند کر دی۔ پھر سر کو نفی میں ہلانے لگے۔

''نہیں بیٹے! اس میں کچھ بھی شاعر نے غلط نہیں کہا۔ ٹھہرو میں اس کی وضاحت سمجھاتا ہوں آپ کو۔ انسان اگر بے صبرا ہے تو صابر بھی کمال درجے کا ہے۔ مثالیں بہت عظیم ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی ..... ایوب علیہ السلام کے صبر کی ......

یہ سفر تکلیف اور آزمائشوں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اور درجات کی بلندی پہ جا پہنچتا ہے۔ شاعر نے اسی لیے کہا۔

''آپ کو پتا ہے ارسل احمد وہ امانت کیا تھی؟'' انہوں نے کچھ توقف کیا پھر اس کی نظروں سے چھلکتی لاعلمی کو پا کر مزید گویا ہوئے۔

''وہ امانت اللہ کی تمام صفات کا پرتو تھا۔ ہلکا سا عکس ...... اللہ نے اپنی تمام صفات انسان کو سونپ دیں۔

رحم ......
کرم ......
قہر ......
جبر ......

ننانوے صفات اور اپنا اسمِ ذات نور سے لکھ کر پہلے ہی اُس کی پیشانی میں رکھ دیا تھا۔ اللہ نے اسی لیے جن و ملک کو آدمؑ کو سجدے کا حکم دیا تھا۔ تو اس میں شرک نعوذ باللہ نہیں تھا۔ یعنی وہ سجدہ آدمؑ کے لیے نہیں تھا۔ وہ تو ان کی پیشانی میں محفوظ اسمِ ذات کے لیے تھا۔ اللہ کے لیے ہی تھا۔ اسی بات کو ملحوظ رکھ کر شاعر نے کہا ہے۔

میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا

پھر اپنی ننانوے صفات کا عکس انسان پر ڈالا تو اُس نے بتا دیا کہ انسان اُن کا خلیفہ ہے۔ اس میں اتنا صبر بھی ہے کہ یہ بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ تو جبھی انسان میں رحیمی بھی ہے۔

جباری بھی
قہاری بھی

اب انسان کا سب سے اہم فریضہ ان صفات میں توازن قائم رکھنا ہے۔ رحمتوں کی صفات کا یہ توازن صرف ایک انسان نے قائم کر کے دکھایا۔ میرے آقا و مالا رحمت العالمین ﷺ نے ......

یوں امانت کا حق ادا ہوا اور انسانیت سرخرو ہوئی۔

ارسل احمد گنگ بیٹھا تھا۔ اس کی سے ہی نہیں نقش کے ہر تاثر سے، عبدالغنی کے وسیع مطالعہ اور علم کی فراوانی پر ستائش چھلک رہی تھی۔ عبدالغنی

نے محسوس کیا تو بے اختیار نظریں جھک گئیں۔

''الحمدللہ رب العالمین!'' ان کے لہجے میں محبت تھی۔ تعریف تھی تو رب کائنات کے لیے۔''

''جزاک اللہ! آپ نے صحیح معنوں میں میرا دل متاثر کیا۔ جیت لیا آج جیسے مجھے۔'' ارسل احمد کی آواز میں مغلوبیت تھی۔ عجیب سی مدح سرائی تھی۔ عبدالغنی کا خوبرو باوقار چہرہ متغیر ہونے لگا۔

''اللہ کی تعریف ہے بیٹے! میرا کوئی کمال نہیں۔ اللہ کے لیے ہیں تمام تعریفیں جس نے مجھ جیسے عاجز گناہگار کو یہ عنایت عطا فرمائی۔'' وہ سرتاپا عاجز و مشکور اور انکساری کا مرقع تھے۔ ارسل نے اب کی بار کچھ نہیں کہا۔ محض تائیدی انداز میں سر کو جنبش دیتے آنکھیں موندلیں۔

☆......☆......☆

وہ جیسے آدھی مرگئی تھی۔ عبدالعلی میں اس کی آدھی جان تھی۔ اس کے جانے پر وہ نیم جان ہورہی تھی۔ لاریب اور عبیر کی کوششیں رائیگاں جارہی تھیں اس کو بہلانے کی، اس کی آنکھ خشک نہیں ہوتی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ کے کنول نہیں کھل سکے۔ لاریب کی تشویش تو دیکھنے لائق تھی۔

''اسے ہو کیا گیا ہے آخر؟'' لاریب کی گھبراہٹ بتدریج بڑھ رہی تھی۔

''مجھے تو معاملہ ہی دوسرا لگتا ہے۔ ذرا چیک اپ تو کرائیں لاریب! خوشخبری ہی ملے گی انشاء اللہ!'' عبیر نے سرگوشی میں کہا۔ جواتنی مدھم بھی نہ تھی کہ کچھ فاصلے پر آنکھوں پر بازو دھرے لیٹی قدر نہ سنتی۔ مگر وہ تو جیسے وہاں ہو کر بھی نہیں تھی۔ کہیں اور ہی پہنچی ہوئی تھی۔ لاریب نے چونک کر پہلے عبیر پھر قدر کو دیکھا۔ ان کی پریشانی کی جگہ ہلکا ہلکا جوش لینے لگا۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

''ارے...... اس جانب تو میرا دھیان ہی نہ گیا۔ کچھ دیر قبل بھی عبدالعلی کو ڈانٹتی ڈپٹتی آئی ہوں فون پر کہ ذرا سا ٹائم نکال کر بات بھی نہیں کرسکتا۔ کہہ رہا تھا۔ ابھی محاذ پر نہیں روانہ ہوا۔ لیکن فلائٹ جانے کو ہی ہے۔ اللہ اپنی پناہوں میں رکھے آمین۔ چلو ٹھیک ہے۔ یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ لمبے عرصے کو گیا ہے عبدالعلی! ہماری بچی کو اچھی مصروفیات مل جائے گی۔''

یکا یک ہی امیدیں ان کے دل میں جگمگانے لگی۔ عبدالاحد کو گاڑی نکالنے کا کہنے باہر آئیں تو پہلا سامنا ہی اتباع اور عبداللہ سے ہو گیا تھا۔ جو لیک کر ان سے چپکی تھی۔

''السلام علیکم! اماں کیسی ہیں؟'' اتباع انہیں بہت زیادہ پیاری اور شرمائی لجائی لگی۔ ایسا روپ انہوں نے اس کا شادی کی اگلی صبح ہی پایا تھا۔ تب بھی بہت اچھا لگا تھا۔ انہیں اب بھی اس پر پیار آیا۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو میرے بچو! ہمیشہ خوش آباد رہو۔'' انہوں نے اتباع کے ساتھ ساتھ عبداللہ کو بھی ساتھ لگا کر باری باری دونوں کی پیشانی چومی اور وہیں لاؤنج میں ان کے ہمراہ بیٹھ گئیں۔

''باقی سب کہاں ہیں......؟ بابا جان تو باہر ہی ہوں گے؟'' اتباع نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

''ہاں وہ تو باہر ہی ہیں۔ عبدالاحد اپنے کمرے میں ہوگا۔ قدر کے ساتھ ہیں تمہاری امی جان، آجاتی ہیں ابھی......''

انہوں نے اُٹھ کر انٹر کام پر عبیر کو اتباع کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ پھر ان کی جانب متوجہ

ہوئیں۔

''یہ مٹھائی.....'' ان کی نظر مٹھائی کے ڈبے پر گئی تو قدرے چونکیں تھیں۔ عبداللہ ہنسنے لگا جبکہ اتباع کی گلابی رنگت بہت تیزی سے سرخ پڑی تھی۔ پلکیں حجاب آمیز انداز میں لرز کر جھک گئیں۔

''یقیناً خوشی کی خبر ہے؟ اللہ مبارک کرے۔'' عبداللہ کی شریر نظروں کا رخ اتباع کی جانب مڑ گیا۔ شوخ تھا یہ دیکھنے کا انداز۔

''جی بالکل بو جانی! آپ نے ٹھیک کہا مگر خوشی کی خبر ہے کیا یہ اتباع بتائے گی۔'' وہ بے حد پرشوق گہری نظروں سے اتباع کو دیکھتا گویا اسے تنگ کرنا چاہتا تھا۔ انداز بے حد معنی خیز تھا۔ اتباع ٹپٹائی اور قدرے حجاب آمیز خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ لاریب خاموش تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔

''بتاؤ نا اتباع! بو جان منتظر ہیں۔'' عبداللہ نے گویا پھر اکسایا اسے، اتباع جانے کس احساس سے بے تحاشا سرخ پڑنے لگی۔ عبداللہ اس کی کیفیت پر بے تحاشا ہنسے جا رہا تھا۔ انگ انگ سے چھلکتی سرشاری اس کی بھرپور خوشی مکمل آسودگی کی غماز تھی۔ لاریب انہیں محبت بھری نظروں سے تکتیں ہنوز چپ تھیں۔

''یہ پھر انگلینڈ جا رہے ہیں اماں! کسی کورس کے سلسلے میں کچھ ماہ کے لیے۔'' اب کی بار اتباع نے بھی اسے چڑایا تھا۔ اور مزا لیتے ہوئے ہنسنے لگی کہ عبداللہ کا چہرہ ہی ایسے لٹک گیا تھا۔

''اس مٹھائی کی وجہ یہ خبر نہیں ہے۔ چیٹنگ نہیں چلے گی۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑتے ہوئے مصنوعی غصے سے بولا۔ اتباع کی ہنسی اور بھی جلترنگ بجانے لگی۔

''تو پھر آپ بتا دیں۔'' وہ یونہی ہنستے ہوئے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال چکی تھی۔ عبداللہ نے جیسے ہار تسلیم کر کے ہی گہرا سانس بھرا تھا۔

''مجھے لگتا ہے تم مجھے میرے نانو بننے کی خبر سنانے آئے ہو..... ہے ناں؟'' لاریب نے خود ہی ان کا جھگڑا ختم کر دیا۔ دونوں ہی ایکدم ان کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔ اتباع کے چہرے پر حجاب سا پھیلنے لگا۔ عبداللہ ضرور حیران ہوا تھا۔

''آپ کو ماما نے بتایا ہوگا یقیناً؟''

''نہیں بھئی..... میں نے گیس کیا ہے۔'' لاریب ہنسنے لگیں۔ پھر اٹھ کر اتباع کو پیار کیا تھا۔

''اللہ مبارک کرے، خیر کا وقت آئے۔ آمین۔ اولاد کی خوشی نصیب ہو۔''

عبیر کے ہمراہ اندر داخل ہوتی قدر نے بھی سنا تھا۔ سمجھا تھا اور چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ایک رنگ ان میں محرومی کا بھی تھا۔

''مبارک ہو، خوش بخت ہو بہت۔'' اتباع کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ خود اس کے پاس آ کر گلے لگی تھی۔ قدر بولی تو اس کی آواز گھٹی تھی۔ اتباع اس کی کیفیت کو صحیح نہیں پرکھ سکی۔

''اللہ نے چاہا تو تمہیں بھی یہ گڈ نیوز جلد مل جائے گی۔'' اتباع نے اس کا گال ہلایا تھا۔ قدر سرد آہ بھرتی فاصلے پر ہو گئی۔

''اس مبارک باد پر صرف ہماری زوجہ کا ہی تو حق نہیں تھا۔'' عبداللہ کے شاکی انداز پر جہاں اتباع جھینپی وہاں قدر بھی خفیف سی ہو گئی تھی۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگی۔

''شکریہ، جزاک اللہ! آپ کس خوشی میں اتنی ویک ہو رہی ہیں؟'' عبداللہ حیران نظر آنے لگا۔ قدر بے اختیار نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

''عبدالعلی کو مس کرتی ہو؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔

قدر کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

''قدر مجھے نڈھال لگ رہی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جا رہے تھے ہم۔'' لاریب کی بات پر اتباع جو عبیر سے مل کر ان کے ہمراہ ہی بیٹھ رہی تھی۔ متوجہ ہوگئی۔

''مجھے بھی ٹھیک نہیں لگ رہے یہ۔ بھائی جان کی وجہ سے تو اُداسی ہے طبیعت خراب نہیں ہوسکتی۔ اچھا ہے۔ آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ ممکن ہے اِدھر سے بھی ہمیں گڈ نیوز مل جائے۔''

اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ قدر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نہیں اتر سکی۔ تو اتباع کو قدرے عجیب لگا تھا۔

''بھو جانی! اک اور بات کرنی ہے آپ سے، اتباع کو سمجھائیں بلکہ قائل کریں آپ۔'' عبداللہ کا لہجہ و انداز کسی حد تک بے بسی لیے عاجزانہ قسم کا تھا۔ لاریب کے ساتھ عبیر اور قدر بھی متوجہ ہوئیں۔ جبکہ اتباع کو جیسے خفقان سا ہونے لگا۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں عبداللہ کو کچھ اشارہ بھی کیا تھا۔ جسے وہ صاف نظر انداز کر گیا۔

''چار ماہ کا کورس ہے بھو جانی! میرا جانا ضروری ہے۔ مگر اتباع کے بغیر نہیں جانا چاہتا۔ خود سوچیں...... اتنا طویل عرصہ کیسے تنہا رہوں گا بھلا......؟'' اس کا انداز قائل کرتا ہوا حمایت حاصل کرنے والا تھا۔ لاریب مسکرا دیں۔

''ویسے ہی...... جیسے اتنے سال پہلے رہ چکے ہیں۔'' اس سے قبل کہ عبیر یا پھر لاریب عبداللہ کی حامی ہوتیں وہ چلبلا کر بول پڑی تھی۔ تینوں خواتین نے چونک کر حیرانی سے اس کی ناگواری کو دیکھا تھا۔

''پہلے میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی تمہارا عادی تھا۔'' عبداللہ نے جیسے اسے ڈانٹا۔ وہ اسی قدر تلملائی۔

''مجھے نہیں پتا...... میں بھی اس ماحول کی عادی نہیں ہوں۔ نہ رہ سکتی ہوں سب سے الگ...... اتنی دور......'' اس نے بے اعتنائی کسی قدر غصے میں بے مروتی کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ عبداللہ نے شکایتی نظروں سے لاریب کو دیکھنا شروع کیا۔ انہیں اس کی حمایت کرنی پڑی۔

''بیٹے کیا حرج ہے؟''

''حرج ہے اماں! میری اسٹڈی ڈسٹرب ہوگی۔ پہلے ہی بہت حرج ہو چکا۔ پھر میں وہاں اکیلی......''

''اکیلی کہاں ہوگی بے وقوف...... میں ہوں گا تو......'' عبداللہ نے صاف برا مانا۔

''صرف آپ...... ہوں گے۔ وہ بھی اپنے کاموں میں مصروف...... میں اکیلی گھر میں باؤلی ہوتی پھروں گی۔ مجھے معاف ہی رکھیں۔'' وہ بدمزگی سے کہہ گئی تھی۔ قدر تحیر و استعجاب اور غیر یقینی میں مبتلا منہ کھولے اس ناشکری لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس کے مزاج نہیں ملتے تھے۔ اس کے خیال میں تو وہ محبتوں اور نعمتوں کو ٹھوکروں سے اڑا رہی تھی۔ اک وہ تھی کہ انہی کو ترس رہی تھی تڑپ رہی تھی۔ اسے عجیب سی بے مائیگی نے آن لیا۔ عبداللہ کتنا دیوانہ تھا اس کا اور وہ اسی قدر بے نیاز لاتعلق...... کول...... اپنے بھائی جیسی، دل کی جگہ پتھر رکھنے والی۔ اس کا ناچاہتے ہوئے بھی دھیان اتباع کی باتوں پر آ گیا۔

''میں تنہائی کی عادی نہیں ہوں۔ سب کو پتا ہے۔ پاگل ہو جاؤں گی، سو نہیں جاسکتی۔''

''میں ٹائم دوں گا تمہیں، حد ہوگئی، باہر بھی

گھماؤں گا۔ لڑکیاں تو خواب دیکھتی ہیں ایسی زندگی کے پاگل......" عبداللہ دعدے کرتے ہوئے گویا وہائیاں بھی دے رہا تھا۔ اور وہ بدک جاتی تھی۔

"جو خواب دیکھتی تھیں۔ انہی سے کر لینی تھی شادی کسی نے...... میرا تو ایسا کوئی فضول خواب نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی بس، یہاں سب کے ساتھ رہوں گی۔ آپ کا جانا ضروری تھوڑی ہے، نہ جائیں۔" وہ بے نیاز تھی۔ عبداللہ جھلایا۔

"جانا ضروری ہے۔ تم جانتی ہو، اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا میں تم یہ بھی جانتی ہو اتباع!"

عبداللہ اپنے بال نوچ لینے والا ہو رہا تھا۔ قدر کو اس پر رحم آیا۔ اسے اتباع پر رشک بھی آیا غصہ بھی، اسے خود پر بھی رحم آ رہا تھا۔ اسے اپنی قسمت پر رونا بھی آ رہا تھا۔ اسے عبدالعلی کی بے حسی پر تاؤ بھی آ رہا تھا۔ آنسو بے اختیار ہوئے تھے۔ وہ سب سے چھپانے کو ہی وہاں سے اٹھی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ پتا نہیں کتنی دیر لڑتے رہے ہوں گے۔ قدر کمرے میں آ کر خود کو سنبھالتی رہی۔ اسے معلوم تھا لاریب اس کے کہے بنا اس کا ہر دکھ جانتی ہیں۔ وہ بے چین ہوں گی۔ جبھی اس نے خود کو کمپوز کیا۔ کچھ دیر منہ پر پانی کے چھینٹے مارتی رہی پھر کچن میں آ گئی۔ عبیر وہیں موجود تھیں۔ چائے بھی تیار کر چکی تھی۔

"میں بنا لیتی ہوں ممانی جان!" وہ شرمندہ ہونے لگی۔ جس انداز میں اتباع نے گھر سنبھالا ہوا تھا۔ وہ نہیں سنبھال پا رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹے! آپ لے چلو ٹرے!" انہوں نے اسے اسنیکس سے بھری ٹرے تھمائی اور خود چائے کے مگوں والی اٹھائی۔ قدر ان کے ہمراہ اندر آئی تو خود کو نارمل ظاہر کرنے میں جان لڑا دی تھی۔ اس نے لاریب کے چہرے پر اطمینان پھیلتا بھی دیکھا تھا۔

"سیدھی طرح مان جاؤ، ورنہ میں تمہاری شکایت عبدالعلی سے کردوں گا۔ اس کی بات نہیں ٹال سکتیں میں جانتا ہوں۔" عبداللہ دھمکی دے رہا تھا۔ اتباع ہنسنے لگی۔ گویا پھر اسے چڑایا۔

"غلط بندے سے وکالت کی بات کر رہے ہیں آپ عبداللہ بھائی! وہ آپ کی فیلنگز کو کہاں سمجھیں گے۔ ان کا تو اپنا بڑا شاندار تجربہ ہے تنہا رہنے کا۔ ہاں آپ ان سے یہ ٹپ لے لیجیے گا کہ اتنی سرد اور روکھی زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے۔ یقیناً بہت مدد کر سکیں گے اس معاملے پہ۔" اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔ ماحول پر یکلخت گہرا سناٹا چھا گیا۔ ہر فرد نے اس کے صرف دکھ کو ہی محسوس نہیں کیا۔ گویا اپنی غلطی کو بھی جانا تھا عبداللہ و اتباع نے کہ بہرحال اس کے سامنے یہ نازک موضوع چھیڑ کر اس کے جذبات مجروح کیا تھا۔

وہ سخت بے زار اور اکتائی ہوئی پھر رہی تھی۔ پوری کوشش کر لی گئی تھی۔ مگر عبدالعلی سے رابطہ ممکن نہ ہو سکا تھا۔ وہ برف زاروں کا قیدی ہو گیا تھا۔ وہاں جانے والے اپنوں سے زندگی سے ایسے ہی کٹ جایا کرتے ہیں۔ عبیر کا قیاس غلط نہیں تھا۔ اس کی پریگنینسی رپورٹ پازیٹو تھی۔ خبر ایسی تھی کہ وہی نہیں باقی سب بھی عبدالعلی کو سنانے کو بے چین تھے۔ مگر......

وہ کتنی بار ہی چھپ چھپ کر روئی تھی۔ وہ شروع سے اپنا موازنہ اتباع سے کرتی آئی تھی۔ اس کی قسمت کا مقابلہ ابھی بھی اتباع سے جاری

تھا۔ وہ حسن میں حیثیت میں ہر لحاظ سے اتباع سے آگے تھی۔ مگر اس کی قسمت نے ہر جگہ ہی اسے اتباع کے سامنے پچھاڑ کر رکھا تھا۔ اتباع کے چہرے کا رنگ اس کی دلکشی سب کچھ ہی قابلِ رشک تھا۔ جبکہ وہ بجھتی جارہی تھی۔ اس نے ہونٹ کچلے اور ریموٹ کنٹرول اُٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ مقصد دھیان بٹانا ہی ہوسکتا تھا۔

''اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو شامل کرو جو کبھی آئینہ تو کبھی سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہیں۔ کیونکہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور سایہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔'' زبیدہ آپا جیسی خاتون ٹوٹکوں کی بجائے اقوالِ زریں سنا رہی تھیں۔ قدر نے چینل تبدیل کردیا۔ آج کل اسے نصیحتوں سے ہی چڑ تھی۔ عبدالعلی کو بھی تو کوئی کام نہ آتا تھا سوائے نصیحتیں کرنے کے۔

''کوئی ایسا لمحہ بھی آتا ہے انسان کی زندگی میں جب وہ بغیر کسی شدومد اور بغیر کسی اہتمام کے اپنے معبود کے قریب تر آجاتا ہے۔ سخی سے جو مانگتا ہے پالیتا ہے۔ جس شے کے لیے جھولی پھیلاتا ہے۔ اس کی جھولی بھر دی جاتی ہے۔ لیکن اس شخص میں سیر دگی کا حوصلہ ہونا چاہیے۔'' قدر کچھ ثانیوں کو ساکن رہ گئی۔ الفاظ کی تاثیر ہی ایسی تھی۔ دل ٹھہر جانے پر آمادہ تھا۔

ایسا اسم عظیم تو اسے بھی درکار تھا۔ جیسے پڑھے...... ورد میں لائے اور سب اس کے حسبِ منشا ہوجائے۔ مگر یہ سوالات و جوابات کا پروگرام تھا۔ گفتگو اب کسی اور رخ کی جانب ہوچکی تھی۔ اس نے گہرا سانس بھرتے بے دلی سے چینل بدل ڈالا۔ یہ کوئی ٹاک شو تھا۔

ایک حضرت بہت جوش وخروش سے محوِ کلام تھے۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ انہیں سننے میں مصروف ہوئی۔

''مجھے بھارت کے ہندو بڑے اچھے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے دھرم پر پورا پورا عمل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں لڑکی کو آج بھی زندہ درگور کیا جاتا ہے اور چودہ سو سال پہلے بھی کیا جاتا تھا۔ ناچ گانا ان کے مذہب کا حصہ ہے جبھی سب لوگ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کے مذہب میں لڑکیوں کو دیکھنا گناہ نہیں۔ اس لیے ہر کوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ ماڈلز بھی کم سے کم کپڑے پہنتی ہیں۔ کیونکہ ان کے دھرم نے ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ ناپاک رہتے ہیں۔ ذہن بھی گندہ......''

بتوں کو پوجتے ہیں۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ سادھوں اور بھکشوؤں کا احترام کرتے ہیں۔ انگریزوں کے دن بھی مناتے ہیں۔ اپنے دن بھی مناتے ہیں۔ سود کھاتے ہیں، سور کھاتے ہیں۔ کبھی دل کیا تو بت کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ شراب بھی پی لی، اتنی اچھی قوم ہے۔ پرواہ ہی نہیں جنت میں جانا ہے یا دوزخ میں جانا ہے۔ بس یہ یقین پختہ ہے کہ مرنے کے بعد دوسرا جنم ہوگا۔ پھر تیسرا ہوگا۔''

قدر کا منہ کھل گیا تھا۔ آنکھیں پوری وا تھیں۔ اسے حیرت و تاسف نے آن لیا۔ شکل سے تو مسلمان ہی لگتا تھا۔ مگر متاثر کس سے تھا۔

''کافر کہیں کا......'' اسے سخت غصے نے آن لیا۔ ارادہ بھلا کر ٹی وی بند کرنے کا تھا کہ جوشِ خطاب نے روک دیا۔ آخر وہ سنے تو...... کہنا کیا چاہ رہا تھا۔ یا مقصد کیا تھا؟''

''سو میڈیا کی آزادی بھی نزاو بال بن رہی تھی۔ اسے احساس ہوا۔''

''ایک بیچارے پاکستان کے مسلمان ہیں۔

ان کا مذہب ہے اسلام۔

جس میں عورت کو عزت دی گئی۔

پردہ کا حکم دیا گیا۔

بیٹی کو رحمت قرار دیا گیا۔ لیکن یہ بہن بیٹیاں......

نہ ان کے سروں پر دوپٹا ہوتا ہے نہ یہ پردہ کرتی ہیں۔ جسم کی نمائش کا بھی بے انتہا شوق ہے۔ یہاں کے لوگ بیٹی کو زحمت سمجھتے ہیں۔ اس قوم کو معلوم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے سود کا استعمال...... اس کے باوجود دھڑا دھڑ دجالی فوج تیار کی جارہی ہے۔ شراب بھی پیتے ہیں، عورت کو پیروں کی جوتی سمجھا جاتا ہے اور خود عورت کو بھی پروں کی جوتی بننے کا شوق ہو گیا ہے۔ نوجوان داڑھی کا ہنس ہنس کر مذاق اڑاتے ہیں۔ دین کا پتا نہیں لیکن مولوی کی ایک منٹ میں ایسی تیسی کر دیتے ہیں۔ نماز پڑھتے نہیں، اللہ کا ذکر کرتے نہیں گانے گاتے ہیں، سنتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں مست نظر آتے ہیں۔

اتنی اچھی قوم ہے۔ حرام کام کر کے اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔ اللہ کا بڑا شکر ہے۔ پاکستان آئیڈیل جیت گئی۔

''اللہ کا شکر ہے میری فلم سپرہٹ ہوگئی۔''

''اللہ کا شکر و احسان ہے اس وقت میں انڈسٹری کا سب سے معروف ایکٹر ہوں۔''

مذہب اسلام نے جس، جس کام سے منع کیا۔ اس قوم نے قسم کھائی ہے کہ بس وہ کام ہی کرلیں گے اور جو کام اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو پسند ہیں۔ وہ تو بالکل نہیں کرنے۔ عورتوں نے شلوار ٹخنوں سے اونچی کرلی ہے۔ جبکہ مردوں نے نیچی کرلی ہے۔ پھر کہتے ہیں اللہ نہیں سنتا۔ معاً اس کا سیل فون گنگنانے لگا۔ قدر کی محویت ٹوٹ گئی۔

اس نے چونک کر ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر بستر پر کچھ فاصلے پر دھرا اپنا سیل فون دیکھا۔ جس کی اسکرین بار بار بلنک کرتی تھی۔ گہرا سانس بھرتے اس نے ایک ہاتھ سے فون اٹھایا دوسرے سے ٹی وی کا والیوم گھٹایا۔

''السلام علیکم ماما!'' اس کی آواز مدھم اور یاس زدہ تھی۔ دوسری جانب علیزے نے پوری شدت سے اس کی اُداسی کو محسوس کیا تھا۔ سلام کا جواب دعاؤں سے نوازنے کے بعد دیگر افراد کی خیریت دریافت کرتی رہیں۔

''اپنا خیال رکھا کرو بیٹے! بھابی آپ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ بتا رہی تھیں کھاتی پیتی بالکل نہیں ہو تم۔''

''عبدالعلی! جب سے گئے ہیں ماما ایک بار بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ آپ نے کیسے شخص کے حوالے کر دیا مجھے۔ جسے پرواہ تک نہیں ہے۔'' اسے تو گویا رونے کا بہانہ چاہیے تھا۔ علیزے کے پاس اس بات کا کیا جواب ہوسکتا تھا۔

''تم ایسا کرو۔ کچھ دنوں کو یہاں آجاؤ۔ تمہارے بابا جان بھی بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔'' انہوں نے پھر اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

''جگہ کی تبدیلی سے کیا فرق پڑتا ہے ماما! وہ کمی تو پوری نہیں ہوسکتی۔'' اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''خود کو سنبھالو قدر! اتنا دل چھوٹا نہ کرو بیٹے! کچھ انوکھا تو نہیں ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ شادی کے فوری بعد تمہارے بابا جان اپنے تبلیغی کاموں میں اتنا مصروف ہوا کرتے تھے کہ میرے لیے بھی ٹائم نہیں ہوتا تھا۔ میں انڈر اسٹینڈ کرتی تھی۔ بھائی جان کا بھی یہی حال تھا۔ کام تو سب مردوں کو کرنے ہوتے ہیں ناں۔'' علیزے کو اب اس کی

پچکانہ ضد پر کسی قدر غصہ آنے لگا تھا۔ مگر لہجہ سخت ہونے دیا نہ تلخ، ان کا انداز ناصحانہ بھی تھا اور نرم بھی۔

"مگر وہ اتباع ہے ناں..... اتنی ناشکری ہے، اسے عبداللہ کی چاہتوں کی ذرا قدر نہیں۔ مگر....."

"ایسا تمہیں لگتا ہے کہ اسے قدر نہیں۔ بیٹے ویسے بھی ہر کسی کا نصیب الگ ہوتا ہے۔ اور کسی پر رشک تو کرنا چاہیے حسد نہیں۔ حسد اور رشک میں یوں بھی بہت معمولی سا فرق ہے۔ یہ فرق کب ختم ہو جاتا ہے۔ معلوم بھی نہیں ہوتا کب اشک حسد میں بدل گیا۔ میں تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو رہتی ہوں۔ تمہارے پاپا جان بھی تمہیں ہر دعا میں یاد رکھتے ہیں۔ آپ بھی کوشش کرو۔ اپنا وقت عبادت میں صرف کرو۔ بے سکونی کی بہت اہم وجہ رب سے دوری بھی ہوتی ہے۔ انسان جب اللہ سے دور ہوتا ہے تو سکون بھی انسان سے دور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ اندیشے اور خوف مسلط کر دیے جاتے ہیں۔ زندگی کو دریا کہا گیا ہے۔ جو موت کے سمندر میں ڈوبتا ہے۔ ہر دریا کو آخر کار تاریک سمندر میں جا گرنا ہے۔ اور لوگ تنکوں کی طرح اس میں بہے چلے جاتے ہیں۔ کشتی ہچکولے کھا رہی ہو تو رب کو پکارا جاتا ہے۔ اور رب کو ہی پکارا جانا چاہیے۔ ورنہ غرقابی مقدر ٹھہر جاتی ہے۔ ہر روز دو رکعت نماز حاجت پڑھا کرو۔ اپنی خواہشات رب سے کہنا شروع کرو۔ دکھ بھی اُس کو بتاؤ۔ مسائل کے حل کے ساتھ دلوں کا سکون اور صبر کی دولت سے مالا مال کر دی جاؤ گی۔ مصائب اور آزمائشیں مسلط ہی اس لیے کی جاتی ہیں کہ رب چاہتا ہے اس کا بندہ اس کی جانب متوجہ ہو جائے۔"

انہوں نے نرمی و جذب سے کہتے کچھ توقف کیا۔ قدر خاموش تھی۔ خاموش رہی۔ علیزے کو باقاعدہ اسے پکارنا پڑا۔

"جی .....؟" اس کے انداز میں گہرا دکھ پوشیدہ تھا۔ یاسیت تھی، بے دلی تھی۔ علیزے مسکرا دیں۔

"اللہ نے اتنی بڑی خوشی دی ہے۔ آس جگائی ہے۔ دعا مانگتی ہو ابھی سے اپنے آنے والے بچے کے لیے....." ان کا انداز محبت سے لبریز تھا۔ قدر پہلی بار جھینپی۔

"نام سوچا کرتی ہوں۔ عبدالعلی سے کبھی اس موضوع پر بات ہی نہ ہو سکی تھی۔ پتا نہیں بیٹا ہو گا کہ بیٹی....."

"تم کیا چاہتی ہو.....؟ یعنی کیا خواہش رکھتی ہو؟" علیزے نے محبت سے اسے ٹٹولا۔ وہ پھر لجا گئی۔

"میرا دل کرتا ہے بیٹا ہو۔ عبدالعلی کا پرتو..... اتنا ہی پیارا..... اسی قدر خوبصورت....." وہ جیسے کہیں کھونے لگی تھی۔ علیزے مسکرا دیں۔

سورۃ یوسف پڑھا کرو روز، اللہ نے چاہا تو بیٹا ہی ہو گا اور بہت خوبصورت بھی ہو گا۔ اس کے علاوہ کوشش کرو ہر روز ایک پارہ پڑھو۔ بیٹے نو مہینوں میں نو قرآن پاک مکمل ہوں گے۔ اللہ آنے والے مشکل لمحات کو آسان کر دے گا۔ اتباع کو بھی یہی نصیحت کی ہے میں نے۔"

"اسے کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ وہ خود ہی بہت عبادت گزار ہے۔ دین کے متعلق معلومات بھی بہت رکھتی ہے۔" اب کے قدر ہنس دی تھی۔ اس کے انداز میں اتباع کے لیے محبت بھی تھی مان اور فخر بھی، علیزے نے نیکی میں اضافے و برکت کی دعا سے نوازا تھا اسے بھی۔

"امن سے بات نہیں ہوئی کبھی اب تمہاری......؟ بچی تو سب سے کٹ گئی ہے جیسے۔" وہ ملول ہونے لگیں۔ قدر نے سر کو نفی میں ہلایا تھا۔ امن کے حوالے سے جو معلومات تھیں۔ وہ واقعی تکلیف دہ تھیں۔ وہ اگر اس سے اپنا موازنہ کرتی تو بہت بہتر حالوں میں تھی وہ۔ یہ بھی مقام شکر تھا۔ اور اسے شکر ادا کرنے کا خیال پہلی بار آیا تھا۔

☆......☆......☆

"السلام علیکم! ماشاءاللہ! یہاں تو بہت بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔" عبدالغنی اندر آئے تو بریرہ کے ساتھ علیزے کو بھی پا کر ایک دم موڈ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ باری باری دونوں بہنوں کی پیشانی چومی، سر پر ہاتھ پھیرا۔ عبدالہادی اور ہارون سے گلے ملنے لگے۔

"کوئی آئے یا جائے، آپ کو کیا پرواہ...... آپ بس اپنے کاموں میں مصروف رہیں۔ ذمہ داریاں نبھائے جائیں، بہت ہیں۔"

لاریب نے جل کر کہا تھا۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ مسلسل ان سے رابطے میں مصروف تھیں۔ فون پر بیل ہوئی تھی مگر کال ریسو نہ کی گئی۔ ان کا غصے سے برا حال تھا۔ اتفاق ایسا تھا کہ عبدالاحد بھی کالج کے ٹرپ کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ کل واپسی تھی۔ مہمان بن آ چکے تھے۔ اس پر مزید ستم گھر میں ایسا کچھ خاص سامان نہیں تھا گروسری کا کہ مہمان کی ضیافت کا انتظام کیا جا سکتا۔ تب لاریب کو ان کی جانب سے مایوس ہو کر ہمسایوں کے لڑکے سے مدد لینا پڑی تھی۔ موڈ جبھی سوا نیزے پر تھا۔ عبدالغنی کو کہاں توقع تھی مہمانوں کے سامنے لاریب سے ایسے شکوے کی...... عرصہ بیتا وہ تو بالکل ہی ان سے خفا ہونا چھوڑ چکی تھیں۔ وہ مزاج جو کبھی بہت نازک تھا اور عبدالغنی کی ذرا سی معمولی سی توجہ میں کمی برداشت نہ کرتا تھا۔ عمیر سے شادی پھر اس کے سمجھوتے کے بعد وہ بہت تبدیل ہو گئی تھیں۔

مگر آج یہ پرانا انداز پھر سے عود کر آیا تھا۔ تو عبدالغنی کو بجائے برا لگنے کے بہت بھایا تھا۔ بہت پیارا لگا۔ بجائے کچھ کہنے کے وہ متبسم نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ انداز میں اپنائیت و محبت بھی تھی۔ دلربائی و محبوبیت بھی، جبکہ علیزے لاریب کے اس انداز پر بے ساختہ ہنسنے لگی تھی۔

"لگتا ہے لڑائی ہو گئی ہے بھائی جان سے۔" اس نے باری باری عبدالغنی اور لاریب کو دیکھا۔ جواب میں لاریب کا منہ کچھ اور بھی پھول گیا تھا۔

"لڑائی تو انسان اس سے کرے، جو دو گھڑی کو دستیاب بھی ہو۔ یہاں تو ہفتہ ہفتہ بھر ان کی شکل نظر نہیں آتی۔" وہ سخت شاکی ہو کر کہہ رہی تھیں۔ عبدالغنی محض مسکرائے گئے۔

"بیویوں کو اگر ناشکری قوم کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ ہے نا عبدالغنی......!" ہارون اسرار نے لاریب کے ساتھ ساتھ گویا بریرہ کو بھی چھیڑا۔

"اور شوہروں کو بھی طعنے دینے کا موقع چاہیے۔" بریرہ کی بجائے پھر لاریب نے ہی تلملا کر کہا تھا۔ سب ہی زور سے ہنس پڑے۔ عبدالغنی نے مسکراہٹ دبا کر غور سے لاریب کا ہر لمحہ سرخ پڑتا چہرہ دیکھا پھر کس قدر شرارت سے گویا ہوئے تھے۔

"آپ کی والدہ ماجدہ کا موڈ برہم لگتا ہے آج...... کیوں قدر بیٹے...... کچھ معلومات ہیں؟" انہوں نے قدر کی جانب نگاہوں کا زاویہ کرتے کسی قدر رازداری سے دریافت کیا۔ وہ ہلکے سے ہنس دی تھی۔ پھر اسی رازداری سے ان کی جانب

جھکی۔

''ماموں جان راشن ختم ہو رہا تھا۔ پاپا جان اور ماما کے ساتھ دیگر مہمانِ گرامی بھی تشریف لائے تو ممانی آپ کو کال کرتی رہیں۔ مگر آپ نے کال ہی ریسو نہیں کی۔''

اس اہم اطلاع پر عبدالغنی نے بے اختیار کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا فون نکالا۔ لاریب کی واقعی دس کے نزدیک مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گہرا سانس بھرلیا۔

''سوری زوجہ! میرا فون سائلنٹ پر تھا۔'' وہ واقعی شرمندہ نظر آئے۔ لاریب نے جواباً زخمی نظروں سے انہیں دیکھا تھا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ گئیں۔ عبدالغنی جز بز سے ان کے پیچھے کچن میں آئے۔

''یہ فون سائلنٹ پر ہی ہوگا اور آپ اتنے ہی مصروف...... یہاں میں مر بھی جاؤں گی آپ کو بہت دنوں بعد خبر ملے گی۔'' اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتے لاریب نے روٹھے پن سے کہہ دیا۔ عبدالغنی نے بے اختیار انہیں شانوں سے تھاما۔

''لاریب...... کیا ہوا ہے؟'' وہ ان کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ گویا اصل بات اصل دکھ کا بھید پالینے کے متمنی ہوں۔ لاریب نے نظریں جھکالیں۔ کچھ دیر ہونٹ کچلتی رہیں۔ گویا آنسوؤں پر قابو پانا چاہتی ہوں۔ عبدالغنی منتظر تھے وہ کچھ کہیں۔

''عبدالعلی کی خیریت معلوم کریں...... کسی بھی طریقے سے...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

عبدالغنی جیسے کسی اُلجھن و پریشانی سے نجات پا کر گہرا سانس بھرتے خود کو آرام دہ پوزیشن میں لے آئے۔

''اللہ کی امانت ہے اللہ کے حوالے...... فکر کی بجائے دعا کو معمول بنائیں لاریب!'' لاریب نے جواباً شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''دعا تو کرتی ہوں۔''

''یقین بھی کرنا سیکھیں۔'' انہوں نے مسکرا کر گویا تصیح کی۔ لاریب سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

''آپ ماں کے دل کو نہیں سمجھ سکتے۔'' ان کی آنکھوں کی سطح پھر نم ہونے لگی۔

''اچھا بھئی! میں ہیڈ آفس کال کروں گا کمانڈر صاحب کو...... عبدالعلی سے بات کرا دیں گے کسی بھی طریقے سے وہ۔'' ان کی تسلی کی خاطر انہوں نے نرمی سے کہا۔ لاریب کو واقعی سکون ہوا تھا۔

اسی پل اتباع انہیں پکارتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ چہرے پر تمتماہٹ سی بکھری ہوئی تھی۔

''بھائی جان کا فون ہے اماں! آ کے آپ بھی بات کرلیں۔'' عبدالغنی اور لاریب کی نظریں بے ساختہ ملی تھیں۔ لاریب انتہائی خوش جبکہ عبدالغنی مطمئن نظر آتے تھے۔ لاریب کی جانب انہوں نے بڑی والہانہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''جایئے کرلیں بات...... آپ کے بیٹے کو بھی آپ کے دل سے راہ ہے۔'' لاریب بے اختیار ہنس دیں۔

''قدر کی بات کراتی ہوں پہلے، بہت اپ سیٹ ہے بچی! آپ بھی آجائیں ناں۔''

عبدالغنی نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ اور ان کے پیچھے ہو لیے۔ فون قدر کے ہی ہاتھ میں تھا۔ سب کے درمیان بھلا اس سے بات بھی کیا ہونی تھی۔ وہ کسی حد تک تمتمایا ہوا چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ لاریب کو دیکھتے ہی موبائل اس کی جانب بڑھا دیا۔

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ جولائی میں ملاحظہ فرمایئے)

افسانہ

آبِ عائشہ

''تم کیا میری اولاد کا نام رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا؟'' وہ یکدم چونکا۔ اس کی اُلجھن کا ادراک ہوا تو خود پر افسوس ہوا کہ وہ کیسے بھول گیا یہ سب کہ وہ کب سے بچے کا نام سوچے بیٹھی ہے، ہر کوئی سوچتا ہے۔ اس نے پھر کیا گناہ کیا بھلا۔ ''تمہیں نام پسند نہیں آیا؟'' ''بات نام کی نہیں

کیا بچے کیا بڑے سبھی اس ننھی پری کو اٹھائے، چومتے اور خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ وہ مسکراتی روشن آنکھوں سے اپنی نومولود بچی اور ان سب کے کھلتے چہرے باری باری تکتی تو نقاہت کا احساس بھی جاتا رہتا۔

''نانو! اس کا نام کیا رکھیں گے؟'' وہ عمیر تھا۔ اس کی بڑی نند رابعہ آپا کا بیٹا..... نانا نانی کی آنکھ کا تارا..... خالاؤں ماموں کا چہیتا۔

''تم بتاؤ نا کیا رکھیں..... جو تم کہو گے وہی رکھیں گے۔'' اس کی اہمیت تھی اور وہ اس اہمیت کو پا کر ہمیشہ راجا اندر بن کر بیٹھ جاتا۔

''جو میں کہوں گا.....؟'' حیرت اس کی آنکھوں میں لپکی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں..... تمہاری چھوٹی بہنا ہے یہ۔''

''اچھا تو پھر اس کا نام 'آب' رکھیں۔ میری کلاس فیلو ہے..... اتنا یونیک نام ہے نا اس کا۔'' اس نے چٹکی بجاتے نام پیش کر دیا۔

''ارے واہ..... کتنا زبردست نام بتایا ہے نا ہمارے عمیر نے آیا..... اس قدر یونیک.....'' اس کی چھوٹی نند نے داد کے ساتھ بھانجے کے پھولے پھولے سے گال بھی کھینچ ڈالے تو جواباً اس نے برا سا منہ بنایا۔

''بس تو پھر فیصلہ ہو گیا ہے..... یہ ہماری ننھی سی آب ہے۔'' اس کی ساس نے فیصلہ سنایا اور وہ ہل کر رہ گئی۔

کسی نے اسے مخاطب کیا اور نہ رائے مانگی..... ایسی بے وقعتی، اس نے آنکھیں کرب سے موند لیں۔

☆.....☆.....☆

ایک کارواں تھا..... ریگستان میں عازمِ سفر..... اور وہ اس کی ہمنوا..... کارواں آگے بڑھا تو اس نے تپتی ریت پر چند نقوش ابھرتے دیکھے..... جو دیکھتے ہی دیکھتے دوڑنے لگے۔ وہ ماضی کے نقوش اب اسے رلانے چلے آئے تھے۔

''امی جی باجی کے بیٹے کا نام میں رکھ لوں؟''

اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا...... سوہا خود اس کا نام رکھے گی۔''

امی نے گود میں اٹھائے تو اسے کو چومتے ہوئے اس کی گود میں منتقل کیا۔

''کیوں میں نہیں رکھ سکتی کیا...... میں ماسی ہوں۔'' اسے برا لگا تھا۔ امی اسے یوں نہیں روکتی تھیں کسی بھی کام سے......

''سوہا ماں ہے اس کی...... پہلا حق ماں کا' دوسرا حق بھی ماں کا اور تیسرا بھی...... پھر چوتھا حق باپ کا۔''

''اچھا اور ماسی کا کوئی حق نہیں؟'' وہ روٹھے پن سے بولی۔

''ماسی کا حق ماں کے بعد آتا ہے...... ماں کتنی تکلیف برداشت کر کے اولاد کو جنم دیتی ہے سو اسے یہ حق بھی ملتا ہے کہ بچے کا نام وہ تجویز کرے۔ یوں بھی ماں نجانے کب سے اپنی اولاد کے بارے میں سوچتی ہے اور سوہا نے بھی کوئی نہ کوئی نام تو سوچا ہوگا...... اسے وہی رکھنا چاہیے۔ کیوں سوہا؟''

امی نے روحا کو نرمی سے سمجھاتے، سوہا کی جانب دیکھا جو کب سے ان کی باتوں پر بس خاموشی سے مسکرائے چلے جا رہی تھی۔

''ٹھیک کہا امی جی...... میں نے اور سہیل نے مل کر اس کا نام مستقیم سوچا ہے۔ ہمیں منفرد نام پسند ہے۔''

''ماشاءاللہ بڑا ہی پیارا نام ہے۔''

''روحا تم بتاؤ اچھا نہیں ہے کیا؟'' اس نے چھوٹی بہن کو پیار بھری نظروں سے دیکھا جس کا مزاج بحال ہو گیا تھا اور یہی اس کی اچھی عادت تھی کہ وہ فوراً سے مان جاتی۔

''اچھا ہے مگر مجھے اسلامی نام پسند ہیں۔''

''ہاں تو اپنی اولاد کے رکھنا نا......'' اور وہ سوہا کی بات پر جھینپ سی گئی۔

☆......☆......☆

صحرا پر ابھرتا وہ منظر اب دھندلا گیا تھا۔ کارواں آگے بڑھ رہا تھا اور تپتی ریت دور تک دکھتی تھی۔ ایسے میں دوسرا منظر اڑتی گرد کے ساتھ اڑتا دکھائی دیا جہاں اسپتال کے ایک کمرے میں وہ اپنے بھتیجے کے ہاتھ تھامے۔ نرمی سے انہیں چوم رہی تھی۔

''کیا نام سوچا ہے اس کا بھابھی؟'' وہ گلابی سا منا بہت ہی پیارا تھا اور اس کے ہاتھ تو بہت ہی پیارے......

''تم بتاؤ......'' بھابی کی نقاہت زدہ آواز نے اسے حیران کر دیا۔ وہ امید نہیں کیے ہوئے تھی کہ بھابی اس سے رائے مانگیں گی۔

''ارے میں...... نہیں نہیں۔ یہ حق صرف ماں کو ہونا چاہیے۔ سب سے زیادہ حق آپ کا بنتا ہے بھابی۔'' امی اس کی اس بات پر مسکرانے لگیں اور بھابی بھی۔''

''قاسم سوچا ہے میں نے...... سکندر کہہ رہے تھے ہمیں رکھیں گے۔''

''آپ کا انتخاب بہترین ہے۔ اللہ اسے مبارک کرے یہ نام۔'' اس نے ننھے سے ہاتھوں کو چوما اور اسے گود میں بھر لیا۔

کارواں رُک گیا تھا۔ پیاسے ریگستان میں اس کے اشک پھوار کی مانند برس رہے تھے۔ سفر تمام ہوا...... مناظر چھٹ گئے...... سب سمٹ گیا اور وہ پھر کیسے سب کے درمیان پہنچ گئی۔ جہاں کی ہنسی اور قہقہے اسے کاٹ کھا رہے تھے۔ یہ ہنسی اور قہقہے اس کے جذبات کی موت پر جنم لے رہے تھے۔

☆......☆......☆

''تم خوش نہیں ہو روحا؟'' زرات ہی ثمر نے اکیلے میں اس سے پوچھا۔ وہ صبح سے اسے اُداس دیکھ رہا تھا مگر سب کی موجودگی کے سبب پوچھ نہیں پایا۔

''کوئی اُلجھن ہے کیا؟'' وہ شوہر کو متذبذب سی تکتی رہی......

''بتاؤں یا نہیں......'' اس وقت تو بس یہی ایک اُلجھن تھی۔

''ثمر کیا میری اولاد کا نام رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا؟'' وہ یکدم چونکا۔ اس کی اُلجھن کا اور اک ہوا تو خود پر افسوس ہوا کہ وہ کیسے بھول گیا یہ سب کہ وہ کب سے بچے کا نام سوچے بیٹھی ہے...... ہر کوئی سوچتا ہے۔ اس نے پھر کیا گناہ کیا بھلا۔

''تمہیں نام پسند نہیں آیا؟''

''بات نام کی نہیں ہے۔ ان جذبات کی ہے جو نجانے کب سے میرے اندر پنپ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں مجھے ہمیشہ سے اسلامی نام پسند ہیں...... امی کہتی تھیں کہ دوسروں کی اولاد کا نام

رکھنے کا تمہیں کوئی حق نہیں...... یہ حق انہیں ہی ملنا چاہیے جو اسے پیدا کرتے ہیں۔ مگر آج مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو اپنے بچے کا نام رکھنے کا بھی حق نہیں ہے۔'' آخری جملے کی ادائیگی تک اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''او کم آن روحا...... اتنی سی بات پر یوں رو رہی ہو۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ میں نے سات ماہ اسے عائشہ کہہ کر بلایا ہے۔ اب یہ 'آب' ہوگئی۔ میرے جذبات کی کوئی قدر نہیں، اتنی بے وقعتی......''

''او کے یار...... رونا تو بند کرو۔ اس کا نام اب سے 'آب عائشہ' ہے۔ بس خوش......؟''

اس نے حیرت سے شوہر کو دیکھا...... اتنی جلدی، ایسا فیصلہ......

''ارے بھئی، مجھے اپنے گھر والوں کو بھی خوش کرنا ہے اور تمہیں بھی...... سو یہ گھر والوں کی آب ہے اور ہماری عائشہ۔'' وہ اتنی سہولت سے کہہ کر اب بیٹی کو اٹھائے پیار کررہا تھا۔

اور وہ حیرت سے شوہر کی صورت تکتی رہی جس نے اس کے جذبات کا مان رکھ لیا تھا اور وہ بھی کتنی آسانی سے۔

☆☆......☆☆

وہ صبح ہی اسپتال سے گھر لوٹی تھی اور شام میں عقیقے کی تقریب منعقد ہونا تھی۔

''روحا تم عائشہ کو تیار کر کے خود بھی تیار ہو جانا مہمانوں کے آنے سے پہلے۔'' وہ سرعت سے کمرے میں داخل ہوا تھا اس لیے ماں اور آپا کو نہ دیکھ سکا تھا۔

اس کے جملے سے دونوں کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

''عائشہ...... ہائے اللہ...... یہاں تو راتوں

ذات نام ہی تبدیل ہوگیا...... ہماری آب تو عائشہ بن گئی ہے۔'' ساس نے پہلے تو اسے گھورا پھر بیٹے کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ کیا ہے ثمر...... کتنے پیارے سے عمیر نے اس کا نام رکھا تھا اور تم نے بدل بھی دیا۔''

اور ثمر جانتا تھا کہ اسے یہ مقدمہ کیسے لڑنا ہے...... ہر اچھا شوہر جو اچھا بیٹا بھی ہو اسے اس سب کے ساتھ اچھا وکیل بھی ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے دلائل سے دونوں طرف کو قائل کرسکے۔

''آپا ایسا کچھ نہیں ہے...... اور امی ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ سب کا منتخب نام میں بدل دوں...... اس کا پورا نام ہم نے آب عائشہ رکھا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ آب کے ساتھ کوئی بابرکت نام لگا دو سو اس لیے میں نے آب ثمر کی بجائے آب عائشہ رکھ دیا۔''

اور اس کی بات کے اختتام تک امی جھاگ کی طرح بیٹھ چکی تھیں۔

''بالکل صحیح کیا ہے...... اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔'' دعاؤں کے ساتھ وہ باہر نکلیں اور آپا ان کے پیچھے۔

اس نے شرارت سے روحا کو آنکھ ماری۔

''وہ جھوٹ جس سے فساد ختم جائے اس سچ سے بہتر ہی ہے جو فساد کو جنم دے۔'' ہلکی سی سرگوشی کرتا وہ باہر نکل گیا۔

اور وہ تشکر سے اپنے شوہر کو دیکھتی سوچتی رہی کہ ایسے مسئلے کا کتنا آسان حل...... دونوں فریقین کو مطمئن کر کے وہ شخص اچھا بیٹا اور اچھا شوہر دونوں ثابت ہوگیا تھا۔

وہ خوشی خوشی اپنی عائشہ کو تیار کرنے لگی...... جو اس کی عائشہ اور سب کی 'آب' تھی۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

صدف آصف

طواف آرزو

ایک خوشگوار سا احساس من میں جاگا۔ وہاں اک نئی دنیا آباد تھی۔ ثمن دلچسپی سے مڑ مڑ کر ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگی۔ جہاں ہر کوئی خود میں مگن ایک دوسرے سے بے نیاز اور لاتعلق پُراعتماد خواتین اپنی پسند کی مہنگی سے مہنگی اشیاء کی خریداری بڑے ذوق وشوق سے کرتی دکھائی دیں۔ ثمن کے دل کو۔

دن کا آغاز کچھ اچھا نہیں ہوا، ناشتے کی میز پر ہی ان دونوں میں جھڑپ شروع ہوگئی، ثمن اب ونڈو شاپنگ کا کھیل جاری رکھنے پر آمادہ نہیں تھی، وہ اپنی وقتی تسکین کی خاطر راحیل کو مزید پریشان نہیں کرسکتی تھی، پر اس کی محبت میں وہ، ہر طرح کی تکلیف سہنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اس لیے اپنے موقف پر اڑا رہا۔ جب کافی دیر سے جاری بحث ومباحثہ کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا تو راحیل نے جھلا کر کرسی کھسکائی اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی اپنے ہمسفر کا جائزہ لیتے ہوئے مقابل آگئی، سپید فراخ پیشانی، شرارتی کھوئی کھوئی سی آنکھیں، لمبا قد اور، سڈول جسم، وہ واقعی قابل تھا کہ اسے چاہا جائے، بے انتہا، بے تحاشہ۔

''تمہیں کتنا سمجھایا تھا...... کہ...... مت تھامو میرا ہاتھ، مگر تمہاری ایک ہی منہ۔'' راحیل نے میز پر ہاتھ ٹکا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''جانتا تھا کہ راستہ بہت ناہموار ہوگا اور تمہارے پیر اتنے ہی نازک...'' معنی خیز انداز میں یاد دلایا گیا۔

''اِس......'' ایک شرارت بھری مسکراہٹ لبوں تک آئی اور بے ساختہ جھک کر اپنے نرم وگداز سنہری پاؤں دیکھنے لگی۔

''ڈرایا تھا، کہ نہیں؟'' راحیل نے اس کی مکمل توجہ حاصل کرنے کے لیے موم سے بنی انگلیوں کو چھوا۔

'راستہ ناہموار ہی سہی، مگر، تمہارا ساتھ منزل کا نشاں دیتا ہے۔'' ثمن کی آنکھوں سے محبت ابل پڑی۔

''پتا نہیں منزل کبھی مل بھی پائے گی یا نہیں؟'' اداسی سے سوچتے ہوئے اپنے، ماتھے پر انگلی پھیری۔

''کس الجھن میں ہیں جناب؟'' ثمن نے استفسار کرتے ہوئے، کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ثمی کبھی کبھی میں بہت ڈر جاتا ہوں۔'' اس نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے

کہنا چاہا۔

''کس بات سے؟'' ثمن کی بے قرار نگاہیں محبوب کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

''کہیں میری محبت تمہارے لیے ایک دائمی بوجھ نہ بن جائے، اور تم نڈھال ہوکر راستہ بدلنے کے بارے میں سوچنے لگو۔'' راحیل کی آنکھوں میں شرارت کی جگہ اداسی کی رمق جاگی۔

''جب ''اوکھلی میں سر دے دیا پھر دھمکوں کا کیا ڈر؟ اب تو جو ہوگا' سو ہوگا۔'' وہ ماحول بدلنے کی خاطر، کھنکتے لہجے میں اترائی۔

''اے تم میری چاہت کو'' دھمک'' کہتی ہو؟'' ثمن کا شرارتی موڈ پاکر، اس نے بھنویں اچکائیں اور تیکھے انداز میں سوال کیا۔

''نہیں، وہ تو میرے لیے خوشیوں کی چمک ہے۔'' اس نے راحیل کے مضبوط بازوؤں پر اپنی انگلیوں کا گھیرا تنگ کیا۔

''سچ پوچھو تو تمہاری مخمور آنکھیں، سرخ لب، نزاکتوں سے سجا شفاف چہرہ اور بے ریا محبت' میری سب سے بڑی طاقت ہیں، میں کبھی ان سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' ثمن کے لمس میں کیسا جادو تھا، وہ ہر بار اسے مایوسیوں کے اندھیروں سے نکال کر جینے پر مجبور کردیتی۔

''یہ راحیل مجھے کتنی چاہت سے سراہتے ہے۔'' مسکراتی سوچ سے سبز آنکھوں کے ہیرے جگمگا اٹھے۔

''کیوں؟'' ثمن نے ناز سے سر اٹھا کر پوچھا۔ راحیل نے، اس کا ایک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑا۔

''کیوں کیا تم میری پہلی اور آخری محبت جو ہو۔'' راحیل نے نرمی سے دوسرا ہاتھ تھام کر بات مکمل کی۔

ہمیشہ کی طرح ثمن اپنے محبوب شوہر کے آگے ہار گئی۔ اس کی سرشاری، احساسات کی بلندیوں تک جا پہنچی، شرم وحیا نے ایسا جکڑا، کہ نگاہیں ملانا مشکل ہوگیا۔ راحیل کا وجود محبت کی روشنی میں گھلنے لگا، اس نے آہستہ سے بڑھ کر ثمن کی چمکتی ہوئی پیشانی چوم لی۔

☆......☆......☆

چلچلاتی دھوپ، گرمی اور حبس سے ماحول کی حدت نا قابل برداشت حد تک بڑھتی چلی گئی، ثمن نے گھبرا کر ادھر ادھر جائے پناہ ڈھونڈنے کے لیے اپنی ہنس سی گردن کو نزاکت سے گھمایا۔ دور دور تک کہیں سایہ دکھائی نہ دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ سیاہ تارکول کی سیدھی سڑک سے متصل فٹ پاتھ چڑھ کر تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی، راحیل کے برابر جا پہنچی۔ ہمیشہ ثمن کو اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا مشکل لگتا تھا۔

''سورج سوا نیزے پر آنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔'' وہ لحہ بھر کو رکی اور سر اٹھایا۔

وہ دونوں کافی دیر پہلے گھر سے نکلے تھے اور اب پیدل چلتے ہوئے، گھر کے نزدیک واقع مشہور شاپنگ مال کے قریب پہنچ گئے، دوپٹے کی چپل میں سجے سنہری نرم پاؤں نم ہورہے تھے، ایڑی سے چوٹی تک بہنے والا، پسینہ اس کی بے بسی کی کہانی سنانے لگا۔ راحیل نے بیوی کو مشورہ بھی دیا تھا کہ رکشہ کرلیتے ہیں مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایک ایک روپیہ دانتوں سے پکڑنے کے بعد ہی تو وہ لوگ اس تفریح سے بھرپور انداز میں لطف اٹھاتے۔

''میرے اللہ۔'' گرمی سے بے حال، ثمن نے دوپٹے کے پلو سے چہرا تھپتھپایا۔

''تھوڑی دیر سائے میں کھڑی ہو جاؤ۔'' راحیل نے دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے بناء بحث کیے سر ہلادیا اور سبز شیڈ کے نیچے ستانے کو رک گئی۔

''کون کہتا ہے کہ اس ملک میں غربت ہے۔'' ثمن نے سگنل بند ہونے کے بعد گاڑیوں کی لمبی قطار کو دیکھتے ہوئے دکھی ہو کر سوچا۔

ایک بار پھر مگن انداز میں ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نگاہ اچانک دائیں جانب بڑی سی کار پر جم گئی، اگلے لمحے چہرے کا رنگ گلابی سے زردی مائل ہو گیا۔ نیو برانڈ کی چمک دار بلیو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اور نہیں ثناء ناز بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے سگنل کھلنے کی منتظر تھی۔

''نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتی۔'' اس نے خود کو یقین دلایا۔

تجسس سے مجبور ہو کر تھوڑی دیر بعد جھک کر دیکھا۔ وہ ثناء کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، جو اب سیل فون کانوں سے لگائے، کسی سے باتوں میں محو تھی۔ اسی لیے شاید برابر میں کھڑی ثمن کو نہیں دیکھ سکی۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی' براؤن سن گلاسز گولڈن ہائی لائٹ بالوں پر ٹکائے، ہلکے پھلکے میک اپ میں مہنگا لباس زیب تن کیے فریش سی ثناء کی نازک انگلیوں میں قیمتی جڑاؤ انگوٹھیاں، دور سے ہی لشکارے مار رہی تھیں۔

''یہ کتنی بدل گئی ہے بالکل بیگم صاحبہ لگ رہی ہے۔'' ثمن کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''چلو نا کہاں گم ہو؟'' راحیل نے پکارا اور وہ چونک کر شوہر کے قدم سے قدم ملا کر چل دی۔

شاہراہ کے اختتام پر ثمن نے لاشعوری طور پر مڑ کر دیکھا۔ گرین سگنل کے ساتھ ہی، ثناء کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک جھرجھری لے کر وہ ثناء کے خیال سے باہر نکل آئی، اور اپنے وقت کو رنگین بنانے کے بارے میں سوچتے ہوئے دلکشی سے مسکرا دی۔

☆......☆......☆

ان دونوں نے مال کے باہر کھڑے ہو کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا، حلیوں پر غور کیا اور مطمئن انداز میں۔ گلاس وال سے متصل جگمگاتے ڈور کو دھکیلا۔ ایک سرد ساوجود میں پھیلتا گیا۔ اندر کا خنک ماحول باہر کی گرمی' تپش اور آلودگی سے یکسر پاک، راحیل نے ثمن کا ہاتھ گرفت میں لیا اس کی ہتھیلی ہی نہیں پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ محبت سے گھوری اور اپنے جیون ساتھی پر چمکتی سبز نگاہیں جمادیں، راحیل کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ آنکھوں سے ایک حوصلہ افزا کیفیت کا اخراج ہوا۔ ثمن نے بھی اسے جوابی مسکراہٹ سے نوازا۔

''آؤ اندر چلتے ہیں۔'' راحیل نے ہمیشہ کی طرح پیار بھری سرگوشی کی اور اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

ہاں چلو۔'' ثمن نے لو دیتی نگاہوں سے جواب دیا اور تقلید میں پیچھے قدم بڑھا دیے۔

ایک خوشگوار سا احساس من میں جاگا۔ وہاں اِک نئی دنیا آباد تھی۔ ثمن دلچسپی سے مڑ مڑ

کر ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگی۔ جہاں ہر کوئی خود میں مگن، ایک دوسرے سے بے نیاز اور لاتعلق پر اعتماد خواتین اپنی پسند کی مہنگی سے مہنگی اشیاء کی خریداری بڑے ذوق و شوق سے کرتی دکھائی دیں۔ ثمن کے دل کو کچھ ہوا، وہ جب بھی اس طرف آتی تو شاپنگ مال کے نزدیک واقع غریبوں کی بستی سے نگاہیں چرا جاتی جہاں، پریشان، عدم اعتماد کا شکار، خستہ حال لوگ رہتے ہیں، جن کے یہاں دن میں صرف ایک بار چولہا جلتا تھا۔

☆......☆......☆

ثمن عابد شروع سے پڑھائی کی بے حد شوقین تھی، اس کا تعلق ایک متوسط اور شریف گھرانے سے تھا۔ یونیورسٹی جوائن کرنے کے بعد کبھی بھی ادھر ادھر کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا، اس کے لیے ماضی کے تجربے بہت تھے، اب نیا دوستانہ قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ سال بھر مکمل توجہ کتابوں پر مرکوز رکھی اور پھر پریویس میں ڈیپارٹمنٹ میں ٹاپ کرنے کے بعد سب کی نگاہوں میں چھا گئی۔

ایک دن راحیل شیخ کی نگاہ چاند جیسی چمکتی ہوئی ثمن پر پڑ گئی۔ زندگی گزارنے کے لیے جس طرح کی لڑکی کا تصور اس کے ذہن میں تھا۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی، متناسب قد، نازک اندام مخمور سبز نین، تیکھے نقش اور، سریلی آواز میں دھیرے سے باتیں کرتی ہوئی ثمن عابد اس کے دل میں سماتی چلی گئی۔ راحیل اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ لڑکے تو لڑکے ثمن لڑکیوں سے بھی فاصلہ رکھ کر بات کرتی۔ پوری یونیورسٹی میں کوئی ایک بھی اس کا قریبی دوست نہیں کہلاتا تھا۔

وہ اب ہر دوسرے دن بہانے سے اس کے ڈیپارٹمنٹ جانے لگا، پہلے تو ثمن اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریزاں رہی، مگر رفتہ رفتہ راحیل کی خاموش محبت اور شرافت سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ اب اس کی آنکھیں بھی راحیل کی متلاشی ہوتیں اور جہاں وہ دکھائی دے جاتا، شناسائی کی لو جاگ اٹھتی۔

راحیل کا تعلق غریب طبقے سے تھا، والدین کے نہ ہونے کی وجہ سے، اپنے کنوارے ماموں ظہور احمد کے ساتھ کرائے کے چھوٹے سے فلیٹ میں رہائش پزیر تھا جنھوں نے بھانجے کی پرورش اور دیکھ بھال کی۔ ان کی زندگی کے سنہرے ماہ و سال اسی میں کٹ گئے اور شادی نہیں کی۔

راحیل کی جس بات نے ثمن کو سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ غریب، بے گھر اور ہاتھ پیروں سے معذور بچوں کی فلاح کے لیے بے لوث ہوکر کام کر رہا تھا، جن کے والدین انہیں اسکول بھیجنے کے قابل نہیں تھے۔

اس نے دو سال قبل ''اعتماد'' نامی تنظیم کی بنیاد ڈالی اور اب اس کی صدارت کے عہدے پر فائز تھا، راحیل کے بہت سارے مخیّر دوست ''اعتماد'' کے ممبرز بننے کے بعد نہ صرف فارغ اوقات میں ایسے بچوں کو تعلیم دینے کا کام انجام دیتے، بلکہ ان کی کتابوں کا خرچہ بھی اٹھاتے۔ ایک دن اس نے ثمن کو بھی اپنے نیک کاز میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ پہلے تو وہ ان کے پروجیکٹ کا خاموشی سے مشاہدہ کرتی رہی اور پھر مطمئن ہونے کے بعد شامل ہوگئی۔ یونیورسٹی کے بعد بھی ان دونوں کی کبھی کبھار ملاقات ہونے لگی۔ بہت جلد ثمن نے اس حقیقت کو مان

لیا کہ شرارتی آنکھوں اور چاکلیٹی بالوں والا لمبا چوڑا ہیرو ٹائپ راحیل کے بغیر جینا مشکل ہو جائے گا۔

☆......☆......☆

''چلو آؤ میں تمہیں یہاں کا شیک پلاتا ہوں۔'' راحیل نے بیوی کا ہاتھ پکڑا تو یادوں کی مالا ٹوٹ گئی۔

''آں..... ابھی نہیں۔'' ثمن نے خود کو سنبھالتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔

''ثمی کچھ نہیں ہوتا ویسے بھی تمہیں پیاس لگ رہی تھی۔'' راحیل نے چہکتے ہوئے جوس کارنر کی جانب اشارہ کیا۔

''اوں نہ۔'' ثمن نے ہمیشہ کی طرح پہلے چارٹ پر نگاہ ڈالی جس پر قیمتیں درج تھیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''صرف ایک بار پی کر تو دیکھو۔ سنا ہے یہاں کا کاک ٹیل شیک پورے شہر میں بہت مشہور ہے۔'' راحیل نے پیار سے بیوی کو اکسانا چاہا۔

''ہاں..... ہوگا مگر آج نہیں پھر کبھی سہی۔'' ثمن نے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھلا کر کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' راحیل نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک ان دیکھا بوجھ ثمن کے سر سے اتر گیا اور خیالوں کا تانا بانا وہیں سے جڑ گیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

☆......☆......☆

ثمن کے بھولے پن، اچھائیوں اور سادہ دلی نے راحیل کو جیسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ جیسے ہی تعلیم مکمل ہوئی، اس نے ثمن کو پرپوز کرنے کا سوچا۔

''کیا میں، اپنے ماموں کو تمہارے بابا سے ملوا سکتا ہوں۔'' اس نے جوش و خروش سے پوچھا۔

''شیور.....'' اس کی آنکھوں سے جھانکتے جذبوں کو پرکھنے کے بعد ثمن نے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔

راحیل کی ایماء پر ظہور احمد باقاعدہ طور پر اپنے بھانجے کا رشتہ مانگنے ثمن کے گھر پہنچے تو عابد علی برہم ہو گئے۔ انہیں بیٹی کے لیے ایسے لڑکے کا ساتھ منظور نہ تھا جس کے پیروں تلے پکی زمین بھی موجود نہ ہو۔ ویسے بھی ثمن اپنے گھر میں تین بہنوں میں سب سے بڑی لڑکی تھی۔ بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے عابد علی کی اس سے بہت ساری توقعات وابستہ تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کسی اچھی جاب پر لگ جائے تاکہ ان کا سہارا بن سکے۔

راحیل کے ماموں نے عابد علی کو سمجھانا چاہا کہ جب بچوں کی خوشی اسی میں ہے تو ہم بڑوں کو ان کی بات مان لینی چاہیے۔ مگر انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا اور راحیل کو اپنی بیٹی کی زندگی سے چلے جانے کا پیغام بھجوا دیا۔

راحیل کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون تھا۔ ثمن کو بے انتہا چاہنے کے باوجود اسے بغاوت پر نہ اکسایا اور خاموشی سے دل پر پتھر رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔

ثمن ایک دم گھبرا گئی، بڑی مشکل سے تو وہ ماضی بھلا کر کسی پر اعتبار کرنے کے قابل ہوئی تھی۔ احساس کمتری سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے راحیل کی مضبوط بانہوں کی پناہ درکار تھی، اسی لیے ضد پر اڑ گئی، کھانا پینا، بات کرنا

کہیں آنا جانا سب کچھ چھوڑ دیا۔ عابد علی کے لیے یہ بڑا صدمہ تھا، جس بیٹی کو وہ اپنا بیٹا مانتے آئے ،اسی نے ان کا مان توڑ دیا۔ بیوی کے سمجھانے پر انہوں نے ایک فیصلہ کیا ،فوری طور پر راحیل اور منظور احمد کو بلا کر تمام معاملات طے کیے اور چار لوگوں کی موجودگی میں بیٹی کو سادگی سے بیاہ دیا اور ثمن پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیئے۔ وہ روتی دھوتی راحیل کے دو کمروں کے تنگ و تاریک فلیٹ میں اجالا بکھیرنے آ گئی۔ زندگی کو آسان بنانے والی آسائشات ،ان سے دور ہی ،مگر زندگی جیسے دسترس میں آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

ریک میں سجے قیمتی کلچ پرس اور بیگز دیکھے تو نگاہ ہٹنا مشکل ہو گئی۔ وہ تیزی سے گلاس ڈال سے ناک ٹکا کر اندر جھانکنے لگی۔

''ایک منٹ یہیں رکو میں ذرا نئے بیگز دیکھ کر آتی ہوں۔'' ثمن نے شوہر کو رکنے کا اشارہ کیا اور شاپ میں داخل ہو گئی۔

''یہ، تو بالکل ویسا ہی بیگ ہے۔ جو ثناء نے خراب کر دیا تھا۔'' اس نے شاپ میں لٹکتے ہوئے لیدر کے بیگ کو چھوا اور سوچنے لگی۔

اسے پھر یادوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، ایک دفعہ عید پر بڑی پھوپھو نے اسے بالکل ایسا ہی لیدر کا بیگ تحفے میں دیا تھا، جسے ثناء نے دیکھتے ہی مانگ لیا۔ ثمن نے ماں کے ڈر سے منع کر دیا۔ اس وقت تو ثناء خاموش ہو گئی ۔اس کے بعد دو دن کے لیے بات چیت بند کر دی۔ ثمن اسے منانے بھی گئی مگر دروازے سے ہی ٹال دیا گیا۔ ایک شام ثناء عجلت میں آئی اور ایک پارٹی میں جانے کے لیے وہ بیگ

تھوڑی دیر کے لیے ادھار مانگا۔ اس نے ماں سے چھپا کر سہیلی کو اس یقین دہانی کے ساتھ بیگ دے دیا کہ وہ جلدی ہی واپس کر دے گی۔ مگر ایک ہفتہ گزر گیا۔ وعدہ وفا نہ ہوا۔

''وہ، میرا...... بیگ؟''۔ ثمن نے خود ہی ایک دن اس کے گھر جا کر واپسی کا مطالبہ کر ڈالا ۔

''یہ...... رہا...... تمہارا بیگ۔'' ثناء اٹھ کر اندر گئی اور بیگ لا کر اسکی گود میں ڈال دیا۔

''یہ...... کیسے ہوا..؟ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ بیگ جگہ جگہ سے کٹا پھٹا تھا۔

''شاید کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔'' ثناء نے مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کہا، حالانکہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔

شاید وہ سہیلی کے پاس کوئی اچھی چیز برداشت نہیں کر پاتی تھی۔

''ایسے کیسے کاٹا؟'' ثمن کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ پہلی بار ثناء سے خفا ہوتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔

''میں تمہیں...... اس سے بھی اچھا بیگ خرید کر دے دوں گی۔'' ثناء نے اس کا بازو پیچھے سے تھام لیا۔

''مجھے نہیں چاہیے۔ پتا ہے امی ابو کی یہ حالت دیکھ کر مجھ پر کتنا غصہ ہوں گی؟'' ثمن کی آنکھیں بھر آئیں۔

پلیز...... میں نے جان کر ایسا نہیں کیا۔ پھر بھی یہ دیکھو، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔'' ثناء نے اسے منا کر ہی دم لیا۔

''میں کتنی پاگل تھی جو اس کی ہر بات پر اندھا دھند بھروسہ کرتی رہی۔'' بیگ کی شاپ سے باہر نکلتے ہوئے اسے اچانک ادراک ہوا۔

''کیا مصیبت ہے، آج ساری بھولی بسری

باتیں یاد آ رہی ہیں۔'' سر ڈیش بورڈ پر ہاتھ رکھتے ہوئے خود کو سرزنش کی اور شاپ سے باہر نکل آئی۔

☆......☆......☆

ونڈو شاپنگ کے دوران، آرٹیفشل جیولری شاپ کے سامنے، کاؤنٹر پر سجی نگوں والی چوڑیاں، جڑاؤ بندے، بالیاں اور انگوٹھیوں نے ثمن کے قدموں کو جیسے زمین سے جکڑ دیا، وہ بے اختیار اندر گھستی چلی گئی، ایک انگوٹھی اٹھا کر اپنی موٹی انگلیوں میں پہن کر دیکھنے لگی۔

''میم...... اگر آپ کو یہ رنگ اچھی لگ رہی ہیں تو پیک کر دوں؟'' سیلز مین نے مستعدی دکھائی۔

''کچھ خاص اچھی نہیں لگ رہی۔'' انگلی سے رنگ اتار کر، واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''اوکے۔'' سیلز مین منہ بناتا ہوا اپنی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

ثمن کے ذہن پر تو ثناء کی انگلیوں میں موجود قیمتی جڑاؤ انگوٹھیاں سوار تھیں۔ یہ نقلی چیزیں کیوں پسند آتیں۔ ایک دم ہر چیز سے جی اچاٹ ہونے لگا۔

''ثناء کی قسمت کتنی اچھی نکلی۔ وہ ایسی چیزیں خریدنے کی استطاعت رکھتی ہے، اور میں اب بھی ونڈو شاپنگ کا کھیل کھیلتی ہوں۔'' اس کا دل اداس ہو گیا۔

شادی شدہ زندگی میں پہلی بار پچھتاووں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔

وہ ماضی میں کھو گئی، جب ثناء اسے زبردستی گھسیٹ کر ونڈو شاپنگ کے لیے لے جاتی تھی۔ دونوں ایسی قیمتی چیزیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں جو مہنگی ہونے کی وجہ سے ان کی استطاعت سے باہر تھیں۔ ثناء ان کو ہاتھ میں لے کر دیکھتی، پہنتی پھر منہ بنا کر مسترد کر دیتی۔ جانے ایسا کرنے سے اس کے دل کے کون سے کونے کو قرار ملتا تھا۔ خاص طور پر، سیلز مین جب بڑی تہذیب سے اس کو ایک ایک چیز پسند کرواتے اور وہ مسترد کر کے اٹھ جاتیں تو چہرے سے خوشی جھلکتی۔

پہلے ثمن کو اپنی سہیلی کی اس اوٹ پٹانگ سی حرکت پر شرمندگی ہوتی، مگر چند دنوں میں وہ بھی اس کھیل کی عادی ہو گئی، ثناء کے ذہن میں شاید کوئی نفسیاتی گرہ بندھ گئی تھی جو وہ اسے ساتھ لیے اس طرح سے بڑے بڑے شاپنگ مالز کا رخ کر کے جذباتی تسکین حاصل کرتی اور بڑے اعتماد سے جی بھر کے دکانوں کا دورہ کرتیں۔ من پسند چیزوں کو قریب سے دیکھ کر، انہیں چھو کر دل خوش ہوتا۔ یہ ثناء کی ہی مہربانی تھی، جو وہ ابھی اسی لت میں مبتلا ہو گئی، شادی کے بعد تنگ دستی کی وجہ سے ایسی آسائشات اس کے مقدر میں تو نہ تھیں، مگر انہیں چھونا، دیکھنا ثمن کو بہت اچھا لگتا۔

''ثمی......'' راحیل نے پیچھے سے آ کر کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا، اس نے چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آتے ہوئے شوہر کو دیکھا۔

''یہ میرا...... وہم ہے یا آج تمہیں...... واقعی...... لطف نہیں آ رہا؟'' راحیل نے اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ تلاش کرنا چاہی، جو اسے دیوانہ بناتی تھی۔

''ہوں......'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتا، ثمن کی کھوئی کھوئی آنکھوں سے

آنسو ٹپکا۔

''کیا ہوا؟'' راحیل نے بے چین ہوکراس کے آنسو اپنی ہتھیلی میں جذب کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''کچھ نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔'' ثمن نے اسے ہاتھ اٹھا کر روکا اور بیزار شکل بناتی جیولری شاپ سے باہر نکل گئی۔ وہ حیران سارہ گیا۔

☆......☆......☆

کپڑوں کی ایک بہت بڑی شاپ میں قدم رکھتے ہوئے، اس نے راحیل کی خاطر موڈ ٹھیک کیا۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ نت نئے لان کے پرنٹ اپنے اندر بہار کی رنگینی سمیٹے شاپ پر سجے دکھائی دیے۔ وہ مسحور سی شوکیس کے سامنے کھڑی رہی۔

''زبردست ہے۔'' کپڑوں کے دلکش ڈیزائن، آنکھوں کو جلا بخش رہے تھے، ثمن نے کاؤنٹر پر پھیلے ایک کپڑے کو مٹھی میں لیا۔

''ثمی...... رمضان شروع ہونے والے ہیں، ایک نیا سوٹ خرید لو نا۔'' راحیل نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اصرار کیا۔

''ہوں...... دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے مسرور انداز میں سر ہلایا۔

''کوئی پسند آیا؟'' راحیل نے تھوڑی دیر بعد بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''آں...... ہاں ابھی نہیں۔'' وہ سوٹ کے انتخاب کے دوران تھوڑا کنفیوز نظر آئی۔

اچھا...... یہ سرخ سوٹ مجھ پر کیسا لگے گا؟'' اس نے بدستور شوکیس میں جھانکتے ہوئے ایک جانب اشارے سے پوچھا۔

''کون سا، وہ ریڈ اینڈ بلیک؟'' راحیل نے تصدیق چاہی اور، انگلی کا رخ ڈمی کی طرف کیا۔

''ارے نہیں وہ نہیں۔'' ثمن نے نفی میں سر ہلا یا اس کی آنکھیں، لان کے حسین پرنٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

''اچھا پھر کون سا؟'' وہ بڑی نرمی سے پوچھنے لگا۔

''وہ ریڈ اور وائن کلر والا۔'' اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی گئی۔

''ہونہہ ٹھیک ہے کیا نکلواؤں؟'' راحیل نے بیوی سے پوچھا۔

''ایک منٹ ٹھہرنا۔'' وہ شش و پنج میں مبتلا دکھائی دی۔

''راحیل مجھے خیال آرہا ہے کہ اس رنگ کا سوٹ تو تم نے مجھے پچھلی عید پر دلوایا تھا۔'' اس نے جیسے کچھ یاد آنے پر بتایا۔

''تو کیا ہوا ایک کلر کے دو سوٹ ہو سکتے ہیں۔'' راحیل نے نرمی اور سبھاؤ سے سمجھایا۔

''نہیں یہ رہنے دو۔'' ثمن کا انداز تھکا تھکا سا تھا۔

''چلو کوئی نہیں کچھ اور پسند کرلو۔'' وہ مزید قریب آکر اسے حوصلہ دینے لگا۔

''تم بتاؤ مجھ پر کون سا کلر اچھا لگے گا۔'' ثمن نے ترچھی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور بڑے ناز سے پوچھا۔

''تم جس رنگ کا کپڑا پہنو وہ موسم کا رنگ۔'' راحیل نے اس کے کان میں محبت کا رس گھولا۔

''ہٹو جی تم بھی بڑے وہ ہو۔'' ثمن نے بظاہر منہ بنایا جب کہ ایسی باتیں ہمیشہ مسرت سے دوچار کرتی تھیں۔

''ہاہا...... تم اس وقت بالکل پرانے زمانے کی بیویوں کے انداز میں بول رہی ہو۔'' وہ

خوش دلی سے ہنس دیا۔

''اچھا اب ایسا بھی نہیں۔'' وہ ترچھی نگاہوں سے دیکھنے لگی تو راحیل نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تم میرے لیے ایک سوٹ کا انتخاب کرلو۔'' ثمن نے بڑے مان سے شوہر سے فرمائش کی۔

''چلو یہ مشکل کام میں ہی سر انجام دیتا ہوں۔'' وہ زیرلب بولا اور چاروں طرف نگاہ گھمائی۔

''دیکھو وہ سبز لان کا سوٹ، کتنا کول لگ رہا ہے نا۔'' کچھ دیر بعد راحیل نے ایک ڈمی کی طرف اشارہ کیا۔

''کچھ خاص نہیں لگ رہا۔'' وہ منہ بگاڑ کر بولی۔

''اچھا وہ یلو گرین۔'' راحیل نے ہمت نہ ہاری ایک اور سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''اوں نہیں رہنے دو پھر کبھی سہی۔'' ثمن نے بے پرواہی سے انکار میں سر ہلایا۔

دونوں دکان کے پاس سے ہٹ گئے، وہ آگے بڑھنے لگی اور راحیل مایوس سا بیوی کے پیچھے چل دیا۔

☆......☆......☆

ثناء علی اس کے گھر کی پچھلی سائیڈ تنگ گلی میں واقع ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ پڑوسی ہونے کے ساتھ دونوں بچپن کی سہیلیاں بھی تھیں۔ اسکول سے لے کر کالج تک ایک ساتھ ایک ہی کلاس میں پڑھنے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب رہیں۔ بچپن گزرا اور دونوں ہنستی کھیلتی جوانی کی دہلیز تک جا پہنچی۔ ثناء کے گھر میں ٹی وی کی سہولت نہیں تھی، اسی لیے وہ اکثر شام کو ثمن کے گھر جا کر اپنی پسند کے پروگرام دیکھتی۔ دونوں سہیلیاں اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرلیتیں۔ تعلیمی میدان میں بھی وہ دونوں خوب محنت کرتیں۔ کلاس میں ہمیشہ ٹیچرز کی چاپلوسی کرکے ثناء آگے رہتی۔ مگر جب بھی فائنل امتحان کا نتیجہ آتا تو ثمن کے مارکس سب سے زیادہ ہوتے۔ وہ وقت ان دونوں کی دوستی پر بہت بھاری پڑ جاتا۔ ثناء اس کے بعد ثمن سے بالکل بات نہیں کرتی اور گھر جا کر اوڑھ لپیٹ کر پلنگ پر جا کر پڑ جاتی۔

ایسے میں وہ کوفت کا شکار ہونے لگتی اور غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی جا کر اسے مناتی۔ وہ اپنی سہیلی کے مزاج کو کبھی بھی سمجھ نہیں پائی۔ بڑی مشکل سے ناراضی ختم ہوتی اور اس کے بعد سے دونوں پھر سے شیر وشکر ہوجاتیں۔ ثناء بہت موڈی تھی، کبھی بھی چھوٹی سی بات کو لے کر طوفان کھڑا کردیتی۔ دوستی ختم کرنے کی دھمکیاں دیتی اور ثمن اس کے پیچھے پاگل بنی پھرتی۔ چند دن گزرنے کے بعد ثناء خود ہی آجاتی۔ کوئی نہ کوئی ضرورت اسے یہاں کھینچ لاتی۔

راشدہ بھی بیٹی کے سیدھے پن پر ناراض ہوتیں۔ ثناء کے لیے ان کی ناپسندیدگی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ وہ ایسی دوستی کو خودغرضی سے تشبیہ دیتیں اور بیٹی کو بہت سمجھاتی کہ ثناء پر اتنا بھروسہ نہ کیا کرے۔ اس کے اندر حسد و جلن کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مگر بالی عمر کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔ وہ جب تک سہیلی کو دن بھر کی روداد نہ سنا دیتی۔ اسے مزہ نہیں آتا۔ ماں کی نصیحتوں اور روک ٹوک کے باوجود ان دونوں

کی دوستی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ مگر ایک دن ثناء نے ایسا منہ پھیرا، کہ پھر پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔

☆......☆......☆

جگمگاتے گلاس ڈور سے نکل کر سنگ مرمر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے انہوں نے ڈھلتے سورج کی جانب دیکھا۔

''بہت تھک گیا ہوں یار۔'' راحیل کا لہجہ تکان زدہ تھا۔

''یہ بات تو ہے؟'' ثمن نے آنکھیں موند کر سستی سے جمائی روکی۔

''ویسے آج کچھ زیادہ لطف نہیں آیا۔'' راحیل نے سرسری انداز میں کہا۔

''مجھے تو بہت مزہ آیا۔'' اس نے دل رکھنے کو غلط بیانی کی۔

''پتا نہیں سارے وقت تو تمہارا دھیان کہیں اور لگا رہا۔'' راحیل نے بیوی کے حسین چہرہ پر پھیلے اجنبی تاثرات کا جائزہ لیا۔

''گرمی بہت تھی نا اس لیے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔'' وہ ثناء کے بارے میں شوہر سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے بہانہ بنایا۔

''کمال ہے اندر تو ائر کنڈیشن کی اچھی خاصی کولنگ تھی۔'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''تم تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔'' ثمن نے چڑ کر بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔

''خیر چھوڑو چل کر کچھ کھا پی لیتے ہیں۔'' راحیل نے پیار سے اسے دیکھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً مان گئی۔

''ایک منٹ۔'' راحیل نے جیب تھپتھپا کر پانچ سو کے آخری نوٹ کی موجودگی کا یقین کیا اور سکون بھرا سانس لیا۔

''چلو بھی صبح سے تمہیں ایک بار پھر تلاش معاش میں لگ جانا ہے۔'' ثمن نے ساتھ چلتے ہوئے، اذیت سے کہا۔

ایک بار پھر راحیل کی جاب ختم ہوگئی تھی، شاید یہ اس مہینے کی آخری تفریح ثابت ہوتی۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو دعا کرنا اس بار قسمت ساتھ دے جائے۔'' راحیل نے سر ہلایا، پھیکی سی مسکراہٹ اسکے لبوں تلے آ گئی۔

ان دونوں نے عارضی سے اسٹال میں بیٹھ کر پہلے مزیدار سی چکن بریانی کھائی، اس کے بعد ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنک کا لطف اٹھایا۔ راحیل نے بیوی کی فرمائش پر بھنی سونف کا میٹھا پان خریدا، جسے دونوں نے آدھا آدھا کھایا، اور پھر ہاتھ ڈالے ہنستے مسکراتے ہوئے اپنے گھر روانہ ہوگئے۔ شوہر کی اتنی توجہ پا کر ثمن کا ذہن وقتی طور پر ماضی کے عذاب سے آزاد ہوگیا۔

☆......☆......☆

رات گزر رہی تھی، مگر ثمن کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ راحیل کب کا سو چکا تھا۔ تھک ہار کر اس نے دھیرے سے خود کو سنبھالا اور بیڈ سے نیچے قدم اتارے۔ اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کرتی ہوئی وہ بالکنی کی طرف نکل آئی۔ خاموشی کا دور دورہ تھا، اس نے دیوار سے لگ کر باہر جھانکا تو رات کا اندھیرا وجود میں بکھرتا چلا گیا، گرل کے بڑے بڑے دائروں پر انگلیاں جمائیں اور سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

شادی کے اتنے سال گزر جانے کے بعد وہ ان سب باتوں کو بھلا چکی تھی، مگر اچانک ثناء کو

دیکھتے ہی، دماغ کی اسکرین پر ماضی کے منظر تازہ ہو گئے۔ سارے ورد جاگ اٹھے وہ ثناء کی دوستی میں کتنی جنونی ہوا کرتی تھی، یہاں تک کہ اس کے معاملے میں ماں کی بھی نہیں سنتی تھی۔

''اور اس نے کیا کیا؟'' من سے امڈتی غم کی تند لہر نے آنکھوں کو گیلا کر دیا۔

''تم تو میری سب سے اچھی سہیلی تھی۔'' ثمن نے ایک گہری سانس لی چہرے پر کرب کے اشتعال آمیز تاثرات اُبھرے۔

''کبھی نہ کبھی تو سچائی میرے سامنے آئے گی۔'' اس وقت خود کو بڑے ضبط سے گزرتا ہوا محسوس کیا۔

☆......☆......☆

ثمن کالج گیٹ سے اندر داخل ہوئی، نرم لبوں کے بیچ میں بال پین دبائے، مصروف انداز میں بیگ کی زپ کھول کر نوٹس نکالنے کی کوشش کرنے لگی جو کتابوں کے بیچ میں کہیں جا چھپے تھے، چلتے چلتے بے دھیانی میں ایک لڑکی سے جا ٹکرائی۔

''او...... سوری۔'' ثمن نے سر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور معذرت کرتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

''کتنی پیاری ہے۔'' دردانہ نے مسکرا کر خود میں مگن اس پیاری سی لڑکی کو جاتا دیکھا، جس کی سنہری لٹ گالوں کو چوم رہی تھی۔

''کلاس شروع ہونے والی ہے۔'' ثمن نے بلیک رسٹ واچ میں جھانکا، جو اس کی سنہری کلائی پر بہت جچ رہی تھی۔

''میڈم کا کہیں اتا پتا نہیں۔'' اس نے زچ ہو کر سوچا، تھوڑی دیر اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر ثناء کا انتظار کیا۔

''آخر یہ ثناء کی بچی آج کہاں مر گئی؟'' تھک ہار کر وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی ردم میں داخل ہوئی۔

روسٹرم کے پاس میں کھڑے ہو کر اس نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی اور حیران رہ گئی، ثناء کسی اور لڑکی کے ساتھ کلاس کی پچھلی رو میں بیٹھی گپیں لگانے میں مصروف دکھائی دی۔ وہ جل بھن گئی۔ ان دونوں کی دوستی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ کلاس میں کسی اور کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ورنہ ان دونوں کی یہ روٹین تھی کہ جو پہلے کلاس میں پہنچ جاتا، اپنا بیگ رکھ کر سہیلی کے لیے سیٹ ریزرو کرا لیتا۔ میم کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر ثمن نے سر جھٹکا اور سامنے والی قطار میں اپنی ایک اور کلاس فیلو کے ساتھ بیٹھ گئی، جس نے کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

☆......☆......☆

''ثمی...... کہاں جا رہی ہو؟'' پیریڈ ختم ہونے کے بعد ثمن بے رخی سے باہر جانے لگی تو ثناء نے اسے پیچھے سے پکارا۔

''بس فری پیریڈ ہے کینٹین تک جا رہی ہوں۔'' اس نے بے اعتنائی دکھائی۔

''ایک منٹ رکو ہم بھی چلتے ہیں۔'' وہ ڈھیٹ بنی اس لڑکی کا ہاتھ تھامے پیچھے چلی آئی۔

''مس...... سوری۔'' کیا آپ کو میرا آنا برا لگا ہے؟'' دردانہ نے اسے مسلسل منہ پھلائے دیکھا تو چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' دونوں نے ایک ساتھ

پوچھا۔

''کالج میں داخل ہوتے ہی پہلی ٹکر ان محترمہ سے ہوگئی، مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں دیکھے بناء ہی سوری کی اور نکل لیں۔'' دردانہ کا انداز اتنا ظریفانہ تھا کہ ان دونوں نے قہقہے لگائے۔

''او..... اگین سوری میں اس وقت نوٹس کی تلاش میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کسی اور چیز کا دھیان نہیں رہا۔'' ثمن نے خوش دلی سے بتایا۔

''اٹس او کے ویسے تم جتنی حسین ہو۔ اس سے کہیں زیادہ نخرے دکھا سکتی۔'' دردانہ پہلے دن ہی اس پر عاشق ہوگئی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ شرم سے گلابی ہونے لگی۔ مگر ثناء کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔

دوسرے کالج سے مائیگریشن کروا کے آنے والی دردانہ بھی، اب کلاس میٹ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کی مشترکہ فرینڈ بن گئی۔ وہ تینوں ہر جگہ ایک ساتھ نظر آتیں، کالج کی شرارتی لڑکیوں نے انہیں ''تھری اسٹار'' کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ تینوں اس بات پر بڑا فخر محسوس کرتیں دردانہ مزاجاً بہت اچھی لڑکی ہونے کے ساتھ خاصی کھلے دل کی تھی، دوستوں کی دوست تھی، ثناء تو اس پر واری صدقے جاتی، ثمن البتہ نارمل انداز میں ملتی۔ دردانہ ایک دو بار ان کے گھروں کے چکر بھی لگا چکی تھی۔

ایک دن اسے ضد سوار ہوگئی کہ وہ اپنی سہیلیوں کو گھر لے کر جائے گی۔ اس کی دعوت پر ثناء تو جانے کو بے چین ہوگئی، مگر ثمن تھوڑا تذبذب کا شکار ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ والد صاحب کو اس قسم کی آزادی پسند نہیں۔ دردانہ کی منت سماجت کے بعد بڑی مشکلوں سے انہیں اجازت ملی اور وہ دونوں دردانہ کی گاڑی میں اس کے بڑے سے گھر روانہ ہوگئیں۔

☆......☆......☆

''سجاد ولا'' میں داخل ہوتے ہی ان کی آنکھیں سچ مچ میں کھلی کی کھلی رہ گئیں، ہزار گز پر پھیلے وسیع و عریض گھر کو وائٹ اور براؤن ماربلز سے سجایا گیا تھا۔ لان میں کی گئی پھولوں کی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عقب میں چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی بنائی گئی تھی، جس سے بہتی آبشار ایک بیضوی تالاب میں جا گرتی، جس میں کنول کے پھول تیر رہے تھے، انہوں نے سراہتی نگاہوں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ ثناء نے تو فوراً ہی زور و شور سے تعریفیں شروع کر دیں، مگر ثمن نے متانت کا دامن تھامے رکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دردانہ کی امارت اور عیش و عشرت سے بے جا مرعوب ہو کر ان لوگوں کی نظروں میں خود کو ہلکا کر دے۔

دردانہ نے انہیں اپنی امی رفیعہ سجاد سے ملوایا، وہ دونوں سے ہی بہت پیار و محبت سے ملیں۔ چھوٹی بہنوں نے ملازموں سے کہہ کر فوراً ہی لان کے شیڈ تلے کرسیاں بچھوائیں اور ان کی تواضع یخ اورنج جوس اور چاکلیٹ کوکیز سے کروائی۔

دونوں لڑکیوں نے دردانہ کی فیملی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔ ثناء یہاں بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی، ثمن کو مسلسل نظرانداز کرتے ہوئے، رفیعہ سجاد کے ساتھ محبت جتاتی رہی، ثمن نے اس کی ایسی عادتوں پر خفا ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دردانہ اور اس کی چھوٹی بہنوں

کے ساتھ خوشگوار موڈ میں باتیں کرتی رہی۔ خوب سارے لوازمات کے ساتھ خوشبو دار الائچی والی چائے پی کر وہ لوگ واپسی کے لیے پر تولنے لگ گئیں۔

''ہاں چلتے ہیں ایک منٹ رکو۔'' دردانہ نے کچھ سوچ کر انہیں ٹھہرنے کے لیے کہا۔

''ظفیر بھائی خان چاچا آج جلدی چھٹی لے کر چلے گئے ہیں۔'' اس نے اپنے خوبرو بھائی کو پکارا جو کچھ دیر قبل آفس سے لوٹے تھے۔

''ہاں تو پھر؟'' بہن کو محبت سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔

''کیا آپ ان دونوں کو گھر تک چھوڑ دیں گے؟'' اس نے لاڈ سے پوچھا۔

''ہونہہ.....ٹھیک ہے، تم لوگ آجاؤ میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں۔'' ظفیر نے اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد اثبات میں سر ہلایا۔

رفیعہ سجاد نے ان دونوں کو گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ اسکے بعد زبردستی کچھ تحائف ساتھ کر دیے۔ ثناء کی تو باچھیں چری جا رہی تھیں، مگر ثمن نے سادگی سے شکریہ ادا کیا۔ وہ تینوں ہنستی مسکراتی جا کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

طویل کارپورچ سے چمک دار لینڈ کروزر نکلتے دیکھ کر گارڈ نے بڑی مستعدی سے بلیک آہنی گیٹ کھول دیا۔ وہ بڑی مہارت سے گاڑی چلاتے ہوئے مین روڈ پر لے آئے۔ یہ ان دونوں کی ظفیر سجاد سے پہلی براہ راست ملاقات تھی، اس سے قبل دردانہ کے منہ سے اپنے بھائی کے ہزاروں قصے سن رکھے تھے۔ ظفیر سجاد لندن سے تعلیم حاصل کر کے حال ہی میں وطن لوٹے تھے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہونے کے علاوہ دردانہ کو ملا کر چار چھوٹی بہنوں کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے والد سجاد علی جدی پشتی رئیس تھے، جن کا ایک برس قبل انتقال ہو گیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت پر ان کے کھڑے نقوش سج رہے تھے، مردانہ وجاہت کے حامل ظفیر سجاد کو ثمن نے خاصا پر وقار پایا وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر خاصی محتاط بیٹھی رہی مگر ثناء کی نگاہ تو جیسے ان پر سے ہٹ نہیں رہی تھی، پورے راستے وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی دردانہ سے ہنسی مذاق میں مشغول رہی، ایک دو بار بلا ضرورت ظفیر سے بھی بات کرنے کی کوشش کی جس کا جواب خاصی سنجیدگی سے دیا گیا۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد سے ثمن نے ثناء میں واضح تبدیلی دیکھی۔ اس کا مکمل جھکاؤ، دردانہ کی جانب ہو گیا۔ وہ ثمن کی جگہ دردانہ کو بے تحاشہ اہمیت دینے لگی۔ ہاں اس کی غیر موجودگی میں ثمن سے پیار جتاتی۔ یہ سب محسوس کر کے وہ گھن چکر بن کر رہ گئی۔ دردانہ البتہ ان دونوں سے برابری کی بنیاد پر ملتی مگر وہ جب بھی ثمن کی کسی چیز کو سراہتی یا اسے اہمیت دینے لگتی تو، ثناء کو بہت برا لگتا اور کوئی نہ کوئی بات نکال کر بے جا تنقید شروع کر دیتی۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ وہ ثمن کو ان دونوں کے بیچ میں سے ہمیشہ کے لیے غائب کر دے۔

ثمن کے لیے ایسا رویہ برداشت کرنا کچھ مشکل ہو گیا، ایسے موقعوں پر وہ چپ چاپ ان دونوں کے بیچ سے اٹھ جانا چاہتی۔ دردانہ ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتی وہ اس سے بہت محبت سے ملتی اور اس کے پیچھے ہٹنے پر بے چین دکھائی دیتی۔ اس کے لیے ثناء سے لڑتی تو وہ الٹا اسے ہی مورد الزام ٹھہراتی کہ ثمن اب مذاق پر بھی برا مان جاتی

ہے۔ ثمن ان باتوں سے گھبرانے لگی۔ جب بھی ایسا لگنے لگتا کہ تھری اسٹار کا ایک کونہ ٹوٹنے والا ہے۔ ثناء بڑی ہوشیاری سے ثمن کو منالیتی، وہ ساری باتیں بھول بھال کر دوستوں کی طرف سے اپنا دل صاف کرلیتی۔

☆......☆......☆

اسی کھنچا تانی میں ان لوگوں کے فائنل ایگزام سر پر آگئے تو تینوں کا دھیان پڑھائی کی طرف مڑ گیا، امتحانات سے فراغت پانے کے بعد اچانک ثمن کو ٹائیفائیڈ نے آ گھیرا۔ اس بیماری میں وہ بہت کمزور ہوگئی، پندرہ، بیس دن بعد جب اس کی طبیعت سنبھلی تو عجیب سا انکشاف ہوا کہ گھر آنا تو دور کی بات تھی، جان لٹانے والی سہیلیوں نے ایک بار کال کرکے اس کا حال احوال تک نہیں پوچھا۔ وہ ان لوگوں کی بے رخی پر اداس ہوگئی۔

دوسرے دن بڑی ہمت کرکے وہ جب کالج گئی تو ایک خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بھی ثناء اور ظفیر سجاد کی منگنی کی بات گردش کرتی ہوئی آ پہنچی۔ وہ یہ سب سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ اسے ظفیر کوئی خاص 'دلی' جذباتی یا ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ مگر یہ بات اس کے دل میں کھب گئی کہ دونوں سہیلیوں نے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اپنی خوشیوں میں شریک کرلیتیں۔

اس نے پھر بھی بڑا پن دکھاتے ہوئے مبارک باد دینے کے لیے ان دونوں کو تلاش کرنا شروع کردیا۔ کسی نے بتایا کہ وہ کینٹین میں موجود ہیں۔ ثمن دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی اندر داخل ہوئی تو سامنے والی ٹیبل پر ثناء اور دردانہ بیٹھی ہنس ہنس کر گپیں لگارہی تھیں۔

"ہائے...... تم دونوں تو بہت بے مروت نکلیں۔" وہ سرپرائز دینے کی خاطر ان کے سامنے موجود خالی چیئر پر بیٹھ گئی۔

پہلے تو وہ دونوں چونک کر خاموش ہوگئیں، پھر دردانہ کے چہرے کی رنگت بدلی۔ اس نے ثمن کو یوں نظرانداز کیا، جیسے اس کا وجود وہاں موجود ہی نہ ہو۔

"میری کلاس ہے ثناء۔" اپنی چائے چھوڑ کر بیگ کاندھے سے لٹکائے کھڑی ہوگئی۔

"ہاں میں بھی آرہی ہوں۔" ثناء ایک دم اٹینشن سی ہوکر نگاہ چرائی، اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔

"انہیں کیا ہوا؟" ثمن کو اپنی آنکھیں گیلی ہونے کا احساس بھی نہیں ہوا، ایک ٹک انہیں باہر جاتا دیکھتی رہی۔

یہ اس کی اپنی سہیلیوں سے آخری ملاقات تھی۔ تھری اسٹار کا ایک کونا ٹوٹ گیا، جس کی کرچیاں بہت بری طرح سے اس کے دل میں چبھ گئیں۔ اس کے بعد نہ ان لوگوں نے کوئی رابطہ کیا اور نہ ہی ثمن نے پلٹ کر پکارا۔ اس تک آخری خبر ظفیر اور ثناء کی شادی کی پہنچی۔ جس میں اسے بلانا تو ایک طرف اطلاع دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

"ایسی کون سی خطا ہوئی، جو ان دونوں نے مجھ سے قطع تعلق کرلیا۔" اسے ہمیشہ سے یہ ایک سوال دکھی کرتا آیا۔

گرل انگلیوں میں گڑنے لگی، آنکھیں ضبط سے لال سرخ انگارے جیسی ہوگئیں۔ تب جاکر کہیں ماضی کا سفر تمام ہوا، وہ بستر پر روتے روتے سوگئی۔ چہرے پر آنسوؤں کے مٹے ہوئے نشان اس کے دکھ بھری کیفیت کے غماز

تھے۔

☆......☆......☆

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی ثمن اور راحیل نے اس ماہ کی پرنور ساعتوں اور قیمتی لمحوں کے فیوض اور برکات حاصل کرنے کے لیے خصوصی عباوات کا سلسلہ شروع کردیا۔ اسی مہینے کی برکت سے انہیں شادی کے تین سال بعد ماں باپ بننے کی خوش خبری ملی تو دل سے سارے ملال مٹتے چلے گئے۔

دوسرے روزے کی بات ہے وہ افطاری بنانے کے لیے پکوڑوں کا بیسن گھول رہی تھی کہ اچانک زور کا چکر آیا اور نقاہت محسوس ہونے لگی اس نے کچن کی دیوار کو تھام کر سہارا لیا۔ کسی نہ کسی طرح سارے کام نمٹائے اور روزہ کھولنے کے بعد جب راحیل کے ساتھ ڈاکٹر کو دکھانے گئی تو انہیں اتنی بڑی خوش خبری سننے کو ملی۔ دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ظہور احمد نے فوراً بہو کا صدقہ نکالا۔

”اللہ تعالیٰ تو نے تو مجھے ایسے نوازا ہے جس کے میں قابل بھی نہیں تھی۔“ وہ گھر آ کر سجدے میں گر گئی۔

بس اب راحیل کی اچھی سی نوکری اور لگ جائے۔“ اس نے گڑ گڑا کر ایک اور عرضی اپنے رب کے سامنے رکھ دی۔

زندگی یوں مہربان ہوسکتی ہے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“ اس کی روح تک سیراب ہوگئی۔

قسمت اور اس کی ہمیشہ ان بن رہی۔ اچانک ہونے والی شادی کے بعد راحیل نے نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور سابقہ تجربے کی بنیاد پر ایک بڑی این جی او سے منسلک ہوگیا۔ معقول تنخواہ تھی، پھر اس کے ماموں سسر جوان لوگوں کے ساتھ رہتے تھے، اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ ان دونوں پر خرچ کردیتے۔ یوں زندگی سکون سے بسر ہونے لگی، اچانک غموں کی کالی آندھی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

راحیل کو اس کی سچائی اور ایمانداری کی بڑی کڑی سزا ملی۔ وہ جس ٹرسٹ سے منسلک تھا، وہاں پر ہونے والی بہت بڑی کرپشن کا انکشاف ہوا۔ یہ لوگ بے گھر یتیم بچوں کو کفالت کے بہانے اپنے یہاں پناہ دیتے اور بعد میں انہیں بیرون ملک اسمگل کردیا جاتا۔ اس کام میں مالکان کے ساتھ چند پرانے نمک خوار بھی ملوث تھے۔ راحیل نے فرض شناس شہری ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے خاموشی سے پولیس سے رابطہ کیا اور سارے ثبوت اکٹھا کرکے ان کے حوالے کردیے۔

ایک بڑے چھاپے کے بعد سب کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔ چند دنوں تک اخبارات اور میڈیا نے اس واقعے کی خوب تشہیر کی۔ راحیل کی ایمانداری کے ڈنکے پیٹے گئے۔ مگر اس کے بعد وہ ہی ہوا جو یہاں کا سسٹم ہے۔ جیسے ہی معاملہ دبا، پیسے کے زور اور پولیس کے تعاون سے وہ لوگ باعزت بری ہوگئے، عدالت جاکر سارے گواہ مکر گئے، الزامات جھوٹے ثابت ہوگئے اور این جی او دوبارہ کھل گئی، سب کچھ پہلے جیسا ہوگیا، مگر راحیل کی زندگی جیل بنادی گئی۔ اول تو کوئی بھی اب اسے نوکری دینے پر تیار نہ ہوتا۔ وہ جہاں جاتا لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے کیوں کہ تقریباً ہر ادارے میں کسی نہ کسی شکل میں کرپشن کی بیماری موجود تھی۔ اگر

قسمت سے کہیں جاب لگ بھی جاتی تو پرانے مالکان اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اسے وہاں سے نکلوا کر دم لیتے۔

راحیل نے تھک ہار کر اپنی قابلیت سے کمتر چھوٹے موٹے کام کرنا شروع کر دیے، یہ ان کی زندگی کا سب سے مشکل دور ثابت ہوا۔ ثمن کا ہاتھ بہت تنگ رہنے لگا، میکے کا بھی کوئی آسرا نہ تھا، بس ایک ظہور ماموں کا دم تھا۔ بڑی مشکلوں سے گزارا ہوتا۔ راحیل کو اپنی محبت اور جذبوں پر ندامت محسوس ہونے لگی، جس نے ثمن کو آزمائشوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔

''میں نے کسی کے ساتھ برائی نہیں کی۔ میرے ساتھ بھی اچھا ہوگا۔'' ہر نماز کی ادائیگی کے بعد اسے یہ ایک بات تسلی دیتی۔

''میرے مولا تیرا شکر ہے تو جس حال میں رکھے۔'' عشاء کی نماز کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو من میں نور ہی نور پھیل گیا۔

بلاشبہ جو برا کرتا ہے۔ وہ مضطرب اور بے چین رہتا ہے۔

☆......☆......☆

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ ثمن نے آج اپنے میکے والوں کو افطار پر بلانے کا سوچا، شادی کے ایک سال بعد ہی اس کے والدین نے بیٹی داماد کو معاف کر دیا تھا، پہلے جیسی بات تو نہیں رہی، کم کم ہی سہی مگر عید تہوار پر وہ سب ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے۔ ثمن نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے، کچن کا پھیلاوہ سمیٹا وہ سحری کے لیے آٹا گوندھ کر کمرے میں سونے آئی تو راحیل نیم غنودگی کی کیفیت میں پہلے سے بستر پر دراز تھا۔

''امی کے یہاں سے سب کو ایک دن افطار پر بلانا ہے۔'' اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد بات شروع کی۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ڈیئر سب کو کل بلالو۔'' راحیل نے اسکے ہاتھ تھپتھپا کر اجازت دے دی۔

''پیسوں کے بغیر یہ دعوت کیسے انجام پائے گی۔'' وہ یہ بات سوچ کر گھبرانے لگی۔

''سنو۔'' مڑ کر شوہر سے جرح کرنا چاہی مگر وہ تو نیند کی وادیوں میں کھو چکا تھا۔

''تھک کر سو گئے ہیں۔ اس وقت جگانا مناسب نہیں۔'' ثمن نے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے سوچا۔

''میں بھی لیٹ جاؤں۔ ورنہ سحری میں آنکھ کھلنا مشکل ہو جائے گی۔'' الارم سیٹ کرنے کے بعد، اس نے لائٹ آف کی اور بستر پر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

صبح جب راحیل نے گھر سے نکلتے وقت ثمن کے ہاتھوں میں اچھی خاصی رقم دعوت کے لیے تھمائی تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ یہ بھی پوچھنا بھول گئی کہ اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے؟ وہ چلا بھی گیا۔

''ابھی افطاری کے لیے بہت ساری چیزوں کا اہتمام کرنا تھا۔'' اس نے سامان کی لسٹ تیار کرتے ہوئے سوچا۔

''فلیٹ کے نیچے واقع سپر اسٹور سے یہ سارا سامان با آسانی مل جائے گا۔'' اس نے پرس میں احتیاط سے پیسے رکھنے کے بعد خود ہی سامان لانے کا سوچا۔

''گرمی کا زور کم ہی نہیں ہو رہا۔'' روزے اور اپنی ایسی کنڈیشن کی وجہ سے ثمن کا پیدل چلنا

محال ہو رہا تھا۔

''تم...... ثمن ہو نا؟'' اس نے ابھی ٹرالی میں چیزیں رکھنا شروع کی تھی کہ اپنے پیچھے ایک شناسا سا آواز ابھری۔

''جی......'' وہ خوش دلی سے بولتے ہوئے پلٹی

''تم......'' اتنے سالوں بعد اپنے سامنے دردانہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی، پھر بے رخی سے منہ پھیر کر جانے لگی۔

''ایک...... منٹ...... ٹھہرو...... مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔'' قدرت نے ایک موقع فراہم کیا تھا، دردانہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

''مجھے...... آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' ثمن نے قدرے تکلف بھرا لہجہ اپنایا۔

''پلیز...... چند باتیں سن لو تاکہ میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔'' دردانہ نے درخواست کی پھر اس کا ہاتھ تھام کر زبردستی کھینچا۔

''ارے...... کہاں لے جا رہی ہو؟'' وہ ہکا بکا اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

''یہاں...... سکون سے بیٹھ کر بات ہو سکے گی۔'' دردانہ مزے سے بولتی ہوئی اسے اسٹور کے بیرونی حصے میں لے آئی۔

☆......☆......☆

''تم کچھ کہنا چاہتی تھی پلیز...... ذرا جلدی بولو مجھے واپس گھر جانا ہے۔'' اس نے دردانہ کے چہرے پر واضح ہچکچاہٹ دیکھی تو خود ہی بات شروع کی۔

''مجھے تم سے معافی مانگنی تھی۔'' اس نے اپنے ہاتھوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

''معافی کس بات کی، تم سے کوئی قصور ہوا ہے کیا؟'' ثمن کے لہجے میں طنز کی لہر جاگی۔

''میرا قصور یہ ہے کہ...... میں نے آنکھوں پر بدگمانی کی پٹی باندھ لی اور کبھی سچ جاننے کی کوشش بھی نہ کی۔'' وہ نگاہیں ملانے سے گریزاں ہوئی۔

''جو کہنا ہے کھل کر کہو۔'' وہ نروٹھے پن سے بولتی ہوئی اپنے اندر کے تجسس کو چھپا گئی۔

''میں نے ایک دھوکے باز لڑکی کے کہنے میں آکر تم جیسی پیاری دوست کو کھو دیا۔'' اس کے ایک ایک انداز میں پچھتاوے بول اٹھے۔

''تم...... کس کی بات کر رہی ہو؟'' ثمن سمجھ تو گئی تھی، پھر بھی تصدیق چاہی۔

''میں ثناء بھابھی کی بات کر رہی ہوں۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''اس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ تھا، وہ میرے سامنے پیار لٹانے والی بنی رہی، جبکہ اس کے من میں منافقت بھری ہوئی تھی۔ پہلے تم اپنے بھولے پن اور سادگی کے ہاتھوں اس کی باتوں میں آکر دھوکا کھا گئی۔ اس کے بعد اس نے ہمارے خاندان کو نشانہ بنا ڈالا۔'' دردانہ کی باتوں میں یاسیت اتر آئی۔

''ایسا کیا ہوا تھا۔ جو تم نے دونوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔'' ثمن کے ہاتھ سرد ہونے لگے۔

''یہ بڑی لمبی تفصیل ہے، اگر تمہارے پاس ٹائم ہو تو...... میں بات شروع کروں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... پوری بات سننا چاہوں گی تاکہ برسوں پرانی پھانس نکالی جا سکے۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے جلدی سے گویا ہوئی۔

”ثناء بھابھی نے بڑی چالاکی سے پہلے ہماری نگاہوں میں تمہیں برا بنایا اور پھر میرے بھائی کی زندگی تباہ کردی۔“ دردانہ نے اس کا ہاتھ تھام کر بتانا شروع کیا۔

”یہ...... کیا...... کہہ رہی ہو تم۔“ ثمن نے بےیقینی سے دیکھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے تم لوگوں کو گھر بلانے کی ضد کی۔ اس دعوت کے پیچھے میرا ایک مقصد چھپا ہوا تھا۔“ دردانہ نے دھیرے سے ماضی کے بند کیواڑ کھولے۔

”مقصد...... کیسا مقصد؟“ اس کے حلق میں گولہ سا پھنسا۔

”تمہیں خاص طور پر، امی جان سے ملوانا اور بھائی کو تمہاری ایک جھلک دکھانا، کیوں کہ کالج میں تمہیں دیکھتے ہی میں نے اپنی بھابھی بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا، اور گھر آ کر بھی روزانہ تمہارا ذکرِ خیر کرتی، چھوٹی بہنوں کو بھی تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ جب ظفیر بھائی لندن سے واپس لوٹے تو میں امی کے پیچھے پڑگئی کہ تمہارے گھر رشتہ مانگنے چلیں، مگر انہیں یوں گھر گھر جاکر لڑکیاں دیکھنا خاصہ معیوب محسوس ہوتا، اسی لیے تمہیں بہانے سے بلوایا گیا، امی جان پر تمہاری من موہنی صورت کا جادو چل گیا، باقی بہنوں نے بھی مسکرا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کردیا، ایک مرحلہ طے پا گیا تو...... میں نے ڈرائیور کے جلدی چلے جانے کا بہانہ بنایا اور گھر چھوڑنے کے بہانے ظفیر بھائی کو تمہیں اچھی طرح سے دکھا دیا بعد میں انہوں نے پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ تمہیں اوکے کردیا۔ ظفیر بھائی کو تو تم پہلی نظر میں اتنی بھا گئی تھی کہ وہ شادی کے لیے بے تاب ہو رہے تھے اور میں خوشی سے ناچ اٹھی۔“ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بتایا۔

”دردانہ......“ وہ حیرت سے اسے تکتے ہوئے صرف اتنا بول پائی۔

”ہاں یہ سچ ہے، خیر امی جان بھی میرا جوش و خروش دیکھ کر ہنستی رہیں پھر کہا کہ ”پتا تو کرو کہیں اس کی منگنی وگنی تو نہیں ہوگئی ہے‘ اتنی پیاری لڑکیوں کو کون چھوڑتا ہے۔ خاندان سے ہی دس رشتے آجاتے ہیں“ یہ سن کر میں بجھ سی گئی خیر امی کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے سوچا، ثناء کی اور تمہاری بہت پرانی دوستی ہے، وہ محلے دار بھی ہے۔ اس سے تمہارے بارے میں ساری معلومات مل سکتی ہے، بس اسے کرید نے لگی، جس پر وہ چوکنا ہوگئی اور تمہارے بارے میں غیر محسوس طریقے سے ایسی باتیں شروع کردیں کہ جو مجھے شاق گزریں، بقول اس کے تمہارا تو کافی سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہیں، پڑھ لکھ کر پہلے جاب کرو گی، پھر آزاد زندگی بسر کرو گی۔ اتفاق سے میں نے جب تم سے پوچھا کہ آگے کا کیا ارادہ ہے تو۔ تم نے بھی فٹ سے یہ ہی کہا کہ جاب کروں گی۔ ثناء نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارا کیا، میں چپ رہ گئی۔ اس کے باوجود بھابھی کی ساری باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ میں تمہارے ساتھ نارمل رہی۔ اگزامز کے بعد ایک بار تمہارے گھر امی جان کو لے کر جانے کا تہیہ کرلیا۔“ دردانہ کا گلا خشک ہوگیا تو وہ لمحہ بھر سانس لینے کو رکی۔

”اچھا...... اس کے بعد کیا ہوا؟“ ثمن جو ساکت بیٹھی سب سن رہی تھی، پر تجسس انداز

میں پوچھا۔
''تم کافی دنوں سے کالج نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ثناء سے تمہارے گھر چلنے کا کہا تو اس نے بتایا کہ تم سہیلیوں کا اپنے گھر آنا جانا زیادہ پسند نہیں کرتی ہو اور تمہاری امی تو منہ پر باتیں سنا دیتی ہیں۔ میں نے حیرانی کا اظہار کیا کہ ایسا کیوں ہے اور جوش میں آ کر تمہارے حوالے اپنے سارے جذبات اور بھابھی بنانے والی بات ثناء کے ساتھ شیئر کر دیں۔'' دردانہ نے سوچتے ہوئے بتایا۔
''اچھا..... تو پھر؟'' ثمن کو شدید غصہ آ رہا تھا کہ ثناء نے بے معنی باتوں کو کیسے اپنے حساب سے بامعنی کر دیا۔
''پہلے تو وہ ہکا بکا سی رہ گئی، مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہیں ہوا، کہ ثناء کی پلاننگ کیا ہے اور وہ مجھے تم سے بدگمان کر کے اپنی طرف راغب کرنا چاہتی ہے ورنہ محتاط ہو جاتی۔'' دردانہ نے دور کہیں ماضی میں جھانکا۔
''میں نے سہیلی جان کر اس سے دوستانہ مشورہ مانگا۔ وہ اس وقت تو مسکرا کر بات ٹال گئی، مگر بعد میں اپنی بدفطرتی کی وجہ سے ہر ہر معاملے میں غلط بیانی سے کام لیتی رہی۔ اتفاق سے تم بھی اس کی کہی ہوئی ہر بات کی تصدیق کرتی اور میں کنفیوز ہو گئی۔'' دردانہ بے چین ہوئی۔
''مثلاً..... کس قسم کی غلط بیانی۔'' ثمن نے اپنے زخمی ہوتے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
''اس نے مجھے بتایا کہ تم ہماری فیملی کو نو دولتیا سمجھتی ہو اور میرے بھائی کا ہنس ہنس کر مذاق اڑاتی ہو۔ مجھے گاڑی میں تمہارا رویہ یاد آیا کہ تم کتنی لاتعلق بیٹھی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تم میرے پیٹھ پیچھے اس لڑکی پر ترس کھاتی ہو، جو میری بھابھی بنے گی اور اسے اتنی ساری نندوں کو بھگتنا پڑے گا۔'' ایسی باتیں سن کر میں پریشان ہو گئی۔
''یہ..... سب باتیں جھوٹ پر مبنی ہیں؟'' ثمن نے پرزور تردید کی۔
''میں بہت دکھی ہو گئی اور آہستہ آہستہ اس کی باتوں میں آ کر تم سے بدظن ہونے لگی۔'' دردانہ نے ثمن کا لرزتا ہاتھ دبایا۔
''او..... مائی گاڈ، ایک بار تصدیق تو کرتی۔'' ثمن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''کیا بتاؤں..... ہم شریف اور خاندانی لوگ سب کو اپنی طرح سچا اور سیدھا سادا سمجھتے تھے۔'' اس کا لہجہ گلوگیر ہوا۔
''ایسا بھی کیا سیدھا پن؟'' ثمن کو اب دردانہ پر بھی جلال آیا۔
''دل اتنا ٹوٹ چکا تھا کہ تصدیق کی خواہش باقی نہ رہی، ایسے جھوٹ فراڈ کا ہمارے یہاں کوئی تصور جو نہیں تھا۔'' دردانہ بے دم ہونے لگی۔
''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ثناء میرے بارے میں ایسا سوچتی ہے۔ مجھے تو وہ دنیا میں اپنی سب سے بڑی ہمدرد لگتی تھی۔'' ثمن دکھی ہو کر بولی۔
''امی جان کو بھی بہت دکھ ہوا بھائی کے لیے لڑکیوں کی کمی نہ تھی۔ مگر ہماری خواہش تھی کہ کوئی جان پہچان والی اچھے مزاج کی لڑکی مل جائے۔ دراصل ابا جان کے بعد بھائی کو کھونے کا حوصلہ نہیں تھا۔ تمہاری طرف سے بدگمان ہونے کے اس معاملے پر مٹی ڈال دی گئی۔'' دردانہ نے

سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر بتایا۔

''ثناء بیگم نے اور..... کیا گل کھلائے؟'' ثمن کا غیض وغضب برا حال ہوا۔

''وہ مجھ سے خوب لگاوٹ بھری باتیں کرتی۔ میرے گھر والوں کی اچھائیوں کو سراہتی۔ میں اس کے خلوص سے متاثر ہوتی چلی گئی اور پھر ایک دن اسے بھابی بنانے کا فیصلہ کر ڈالا، شاید میں یہ جتانا چاہتی کہ اگر تم نے میرے بھائی کو ریجیکٹ کردیا تو کیا ہوا۔ میں ایک اور سہیلی کو اپنی بھابی بناؤں گی۔

امی جان میرے اتاؤلے پن پر پریشان ہوگئیں، جانے کیوں وہ ثناء کے معاملے میں کچھ مشکوک سی تھی۔ بھائی بھی کچھ اداس تھے مگر اس نے تو میری ایسی مت ماری کہ میں نے سب کو منا کے دم لیا، عجلت میں منگنی کردی گئی۔ بس یہیں سے ہماری بدقسمتی کا آغاز ہوا۔'' دردانہ کا لہجہ نمی سے بھر گیا۔

''ایسا کیا ہوگیا؟'' ثمن نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ثناء کو تو ہماری دولت سے پیار تھا۔ شادی کے ایک سال تک تو وہ مشرقی بہو بننے کا ڈرامہ رچاتی رہی۔ امی جان کی خوب خدمت کی، ہم سب سے بہت سلوک کے ساتھ رہی اور اپنے قدم مضبوط کرنے میں لگی رہی، ہم سب خوش تھے۔ اس کے بعد جیسے ہی میرا بھتیجا شہیر اس کی گود میں آگیا وہ اپنی اصلیت دکھانے پر اتر آئی۔ اسے ہم سب برے لگنے لگے۔ پورا دن کمرے سے باہر نہیں نکلتی۔ کبھی شہیر کو سلانے کا بہانہ ہوتا، کبھی اس کی بیماری کا ڈھکاوا۔ ایک ایک کرکے اس کے چہرے سے سارے نقاب اترتے چلے گئے تب جا کر ہوش آیا۔'' دردانہ نے آنکھیں ملتے ہوئے بتایا۔

''یہ..... تو اس نے بہت غلط بات کی خیر..... پھر کیا ہوا؟'' ثمن کو افسوس ہوا مگر آگے کی بات بھی سننی تھی۔

''گھر کے معمولات ڈسٹرب ہونے لگے۔ ایک دن امی جان نے بیٹھ کر بات کی۔ وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئی خوب رونا دھونا مچایا اور بھائی سے الگ گھر کا مطالبہ کردیا۔

وہ پہلے تو انکار کرتے رہے۔ پھر بیوی کے آنسوؤں اور اپنے بچے کی محبت سے مجبور ہوگئے اور شہر کے دوسرے کونے پر ایک اور گھر لے لیا، جہاں اب ثناء بھابی شان سے رہتی ہے۔ مگر اکیلی کیوں کہ بھائی اور شہیر کا زیادہ وقت ہم لوگوں کے ساتھ گزرتا ہے۔'' وہ مشکل سے مسکرائی۔

''مجھے ابھی بھی یقین نہیں آرہا کہ ثناء.....'' ثمن کچھ بولتے بولتے رک گئی۔

''ہاں..... ہمیں بھی پہلے ایسا ہی شاک لگا، اس کے بعد تمہاری سچائی اور اس کے دوغلے پن اور بدفطرتی پتا چلا، مگر کیا فائدہ۔'' دردانہ نے ہاتھ ملا۔

''اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ وہ بھی خوش نہیں رہ پائے گی۔'' ثمن کی ہمت جواب دینے لگی، اپنا سر تھام لیا۔

''ایک بار میں نے پوچھا کہ ثمن جیسی اچھی دوست کے ساتھ ایسی دشمنی کیوں نبھائی؟'' دردانہ نے اٹھنے سے قبل آخری بات بتائی۔

''تو..... تو، اس نے کیا کہا؟'' وہ پوری جان سے لرزنے لگی۔

''وہ ہنستے ہوئے بولی کہ ہر مقام پر ثمن کو مجھ پر سبقت حاصل رہی۔ جیت ہمیشہ اس کا مقدر

ٹھہری مگر اس راؤنڈ میں مجھے ظفیر جیسے خوبرو، اکلوتے، امیر لڑکے کو اس سے جیتنا تھا اور میں کامیاب ہوگئی۔ ویسے بھی، محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔'' دردانہ نے آہ بھر کر شناء کا فلسفہ دہرایا اور اجازت طلب کی۔

''اچھا تو...... جیت اس کا مقدر ٹھہری پھر؟'' ثمن لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔

''نہیں ......وہ جیت کر بھی ہار گئی، اسے روپے پیسے تو مل گئے، مگر بھائی کی محبت اور بیٹے کا پیار نہیں ملا۔ وہ دونوں شناء کی رفاقت سے دور بھاگتے ہیں اور شہیر تو بس امی جان کو ہی ماں پکارتا ہے اور ہمارے گھر ہی رہتا ہے، ظفیر بھائی بھی بس رات کو سونے گھر جاتے ہیں، بھابھی چیختی چلاتی رہ جاتی ہے مگر ان پر اثر نہیں ہوتا۔'' دردانہ نے سرد آہ بھر کر قصہ مکمل کیا اور وہ دونوں سامان لے کر باہر نکل آئیں، مگر ثمن کا ذہن ان ہی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔

''تم صرف ایک بار کہتی، میں تمہاری خاطر ظفیر کے رشتے سے خود انکار کر دیتی۔'' ثمن نے تصور میں اس سے شکوہ کیا۔

ایسا ہوتا بھی تو کیسے شناء ''طواف آرزو'' میں مبتلا ہمیشہ سے غلط راہ چنتی آئی۔ اسی لیے اپنی شادی شدہ زندگی کی بنیاد بھی برائی پر رکھی، جس کے صلے میں آج دولت کے بیچ میں اکیلی رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

ثمن اداس سی بستر پر سر نیہوڑائے بیٹھی تھی، جب راحیل نے مسکراتے ہوئے، چٹ چٹ کر کے کمرے کی ساری بتیاں جلا دیں۔

''تم...... آگئے ہو۔'' ثمن نے چہرہ اوپر کر کے پوچھا، اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پاس چلا آیا۔

''چاند...... رات مبارک ہو جاناں۔'' راحیل کی آنکھیں وارفتگی کے جذبے لٹاتی، بیوی پر ٹک گئیں۔

''خیر مبارک۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا، آنکھوں سے ایک آنسو پھسل کر گال پر جا ٹھہرا۔

''کیا ہوا، اس قدر مغموم اور افسردہ کیوں ہو؟'' وہ چہرے پر پھیلی یاسیت کو چونک کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں کل عید ہے اور......'' وہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ نہیں کر سکی، کچھ بھی تیاری نہیں ہو سکی ہے۔

''ہاں یہ تو ہے چلو ہم لوگ بھی شاپنگ والا کھیل کھیلتے ہیں۔'' راحیل نے شرارت سے کہا۔

''جھوٹی خوشی حاصل کرنے کا کیا فائدہ؟'' اس کی نگاہوں کی تپش سے پگھلتی ہوئی ثمن نے سر جھٹک کر انکار کر دیا۔

''پلیز...... میری خاطر...... جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' راحیل کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ کر تیار ہونے چل دی۔

بیوی کو چاند رات میں اداس دیکھنے کا حوصلہ کسی کے پاس نہیں ہوتا، پھر وہ کیسے یہ بات برداشت کرتا۔ اسی لیے ''شاپنگ کا پرانا کھیل'' کھیلنے کا سوچا۔

وہ ثمن کا ہاتھ تھامے کچھ سوچتے ہوئے بڑے سے شاپنگ مال میں گھس گیا، جہاں چاند رات کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔

☆......☆......☆

راحیل نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا

اور کیپسول لفٹ کے ذریعے مال کی اوپری منزل پر جدید انداز کے بنائے گئے فوڈ کورٹ میں داخل ہوا۔

''اس موسم میں، ٹھنڈا شیک پینے کا اپنا ہی مزہ ہے۔'' وہ چہکا۔

''مجھے بتاؤ گے کہ یہ سب کیا ہے؟'' اس نے نہ سمجھ میں والے انداز میں شوہر کو دیکھا۔

''میری زندگی..... تمہارے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے۔'' آنکھوں سے ایک خاص چمک اٹھ رہی تھی۔

''راحیل..... جلدی سے بتاؤ نا۔'' وہ شوہر کی بالوں بھری کلائی تھام کر بولی۔ ہلکے میک اپ سے اس کا ملکوتی حسن عود آیا تھا۔

''اچھا تو سنو..... ایک بین الاقوامی مشہور تنظیم، پاکستان میں غریب بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کافی عرصے سے کام کر رہی ہے مہینے بھر قبل انہوں نے مجھے بلوایا اور کہا کہ ان کی امدادی تنظیم بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ نئے منصوبوں پر کام شروع کرنا چاہ رہی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ کام کروں۔ مجھے بہت اچھے عہدے کی آفر دی گئی۔ خطیر تنخواہ کے ساتھ گاڑی اور دیگر مراعات کا سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

دوسرے دن سے ان کا ٹرسٹ جوائن کر لیا۔'' اس کے لہجے سے جھلکتا، بلا کا اعتماد ثمن کو پسند آیا۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' وہ بڑے دھیان سے ساری بات سننے کے بعد شکوہ کر بیٹھی۔

''پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمہیں یہ خوشخبری اسی وقت سنا دوں، پھر چھپا گیا تاکہ عید کے ساتھ بہت ساری خوشیوں سے تمہارا دل، مسرور ہو جائے۔'' راحیل کے چہرے کی چمک، ثمن کی نگاہوں کو خیراں کیے دے رہی تھیں۔

''چلو اب..... عید کی شاپنگ کے ساتھ تم وہ چیزیں بھی خریدو گی، جو پہلے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑنا پڑتی تھیں۔'' اف راحیل کی نگاہوں کی گرمی، اس کی گلابی ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔

''دعائیں یوں مستجاب ہوں گی۔ ایسا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' قسمت ایک بار پھر پلٹے گی۔ وہ جتنا بھی خوش ہوتی کم تھا۔

''میری زندگی کس سوچ میں ہو؟'' راحیل نے اسے گم پایا تو بے قرار ہو کر ہاتھ تھام لیا۔

''اپنی قسمت پہ ناز کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' اس نے ہنس کر بھی گردن اٹھائی اور مدھر لہجے میں کہا۔

''اس چاند ذات نے تو خوشیوں سے ہمارا دامن لبالب بھر دیا ہے۔'' وہ چہکا تو ثمن کی ہنسی میں خوشیوں بھرے ترانے کی دلنشین گونج تھی۔

''تو چلو عید شاپنگ شروع کرتے ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، جہاں ایسی خوشی تھی جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''جو حکم جناب.....'' ثمن نے اتراتے ہوئے تھوڑا جھک کر اقرار کیا۔

راحیل کی شرارتی نگاہیں، اس کے چاند سے چمکتے چہرے کی طرف اٹھ گئیں اور وہ دونوں ان گھڑیوں سے خوشیاں کشید نے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆.....☆☆

مجھے اپنی ذات کا محور کر دے

”پلیز اشعر صاحب بہتری اسی میں ہے کہ آپ شرافت سے یہاں سے چلے جائیں اور ہاں اب آئندہ آپ اکیلے میرے گھر نہیں آئیں گے۔ خدا کے لیے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ اُس نے دونوں ہاتھ معافی مانگنے کے انداز میں ملائے تو اشعر تیزی سے آگے...

”لعنت ہے تمہاری سوچ پر حد ہوتی ہے ایسی باتیں کرتے ہوئے...... تم مرد ہو...... ارے بیہودگی کی۔ شرم آنی چاہیے اپنی بیوی کے لیے مرد نام ہے ایک تحفظ کا، ایک احساس کا ایک

سائبان ایک حصار غیرت و عزت و وقار کا، ایک مان ہوتا ہے۔ بھرپور سہارا اپنائیت کا کیسا مان توڑا ہے تم نے ایک بیوی کا......"

"بکواس بند کرو...... تم کو شوہر سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ کیا اس طرح بات کی جاتی ہے شوہر سے، کمانے کیا لگی ہو خود کو سپر سمجھنے لگی ہو۔ ضرورت نہیں ہے کل سے نوکری پر جانے کی وہاں تم تفریح کرنے جاتی ہو چھڑے اڑانے اپنے پرستاروں کا دیدار کرنے اُن لفنگوں کی قربت میں لطف آتا ہے تمہیں۔

"میں نہیں جاؤں گی تو گھر کیسے چلے گا...... تم غذا اور علاج کے بغیر مر جاؤ گے۔"

"میری زندگی رُک گئی ہے مجھے پالنا ہے تمہیں، اگر آج تم کما رہے ہوتے تو میں کیوں نوکری کرتی۔"

"دیکھا...... دیکھا...... دے دیا نہ مجھے طعنہ کہ میں تمہارے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں۔ نہیں چاہیے مجھے تمہاری یہ بھیک...... زبان بہت چلنے لگی ہے۔" وہ زور سے چیخا...... بالکل چلے گی زبان جب تم اس قدر گرے ہوئے تکلیف دہ الزام دو گے اپنی بیوی کی تذلیل کرو گے اُس کی پاکدامنی پر شک کرو گے تو کیا وہ اپنی دفاع میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں بولے گی؟

"گھر کا کرایہ، بجلی کا بل، گیس کا بل، چوکیدار کے پیسے کیبل کے پیسے، سبزی ترکاری دکھ بیماری، ان میں کون سی چیز ایسی ہے جو بغیر پیسوں کے ہے ہر چیز کے لیے پیسہ درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نجانے کن گناہوں کے بدلے میں ایسا شخص نصیب کیا جو کسی لحاظ سے بھی میرے معیار پر پورا نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ یہ ہی دعا کی تھی کہ رب کریم مجھے روپیہ پیسہ، بینک بیلنس جائیدادیں...... کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے ایسا شخص نصیب کر جو بے حد مخلص، پیار کرنے والا، رحم دل اور اعلیٰ سوچ رکھنے والا عقل و شعور اور بردباری میں یکتا ہو...... مگر...... مگر...... مجھے یہ کیسا شخص ملا...... جاہل...... جہالت کی باتیں کرنے والا منفی سوچ رکھنے والا۔"

گویا آج وہ بھی یہ سوچ کر اُلجھ رہی تھی کہ آر یا پار دس سال کا عرصہ کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا شادی کے دوسرے ہی سال سے اس شخص نے اپنی اصلیت دکھانی شروع کر دی کہ تم بانجھ ہو تمہیں اولاد نہیں ہو رہی ہے مجھے بچے چاہیے۔ صنوبر روتی بلکتی اللہ سے دعائیں کرتی مگر...... اس نعمت سے محروم رہی۔ سجاد کی سب سے بڑی اور اہم برائی یہ بھی کہ وہ شکی مزاج تھا خود تو کسی بھی غیر لڑکی اور عورت سے فری ہو جاتا لیکن اگر صنوبر اپنے سے چھوٹے یا بہت بڑے سے بھی بات کر لے تو شک کی نگاہ سے دیکھتا۔ اتنے سوالات کرتا کہ صنوبر بیزار ہو جاتی۔

"تو...... یہ تمہارا فیصلہ ہے کہ تم نوکری کرو گی۔" سجاد نے بے تکا سا سوال کیا تو صنوبر نے جھاڑو لگاتے ہوئے اُسے دیکھے بغیر کہا۔

"ٹھیک ہے نہیں جاتی پھر تم گھر کے اخراجات پورے کرو۔"

"تمہیں پتہ نہیں کہ میں بیمار ہوں اور ویسے بھی مجھے نوکری کہاں ملتی ہے؟"

"بس تو پھر ظاہر ہے مجھے نوکری کرنی پڑے گی۔"

"تم نوکری کرنے کے بہانے غیر مردوں کے پہلو گرم کرتی ہو۔ ایک بیمار کمزور مرد سے جان چھڑا کر تفریح کا اس سے اچھا موقع اور کیا ملے گا۔"

"سجاد لعنت ہے تم پر تمہاری سوچ پر تمہاری زبان پر میں ایک منٹ بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ تم نے...... تم نے آج مجھے اتنی بڑی اور

گھناؤنی گالی دی ہے کہ یہ سن کر میں ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رک سکتی تمہاری مکروہ شکل سے اور سوچ سے تمہاری ذات سے مجھے نفرت ہوگئی شدید ترین نفرت ہے۔'' وہ روتی جارہی تھی اور اٹیچی میں اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔

''تم صرف مرد ہی نہیں بلکہ انسان بھی نہیں ہو بلکہ تمہیں جانور کہنا بھی جانور کی توہین ہوگی ارے...... اگر دس سال ایک جانور بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہے گا تو اُن میں محبت رفاقت ہوگی انسیت ہوگی ایک دوسرے سے واقف ہوجائیں گے۔تم کسی جانور کے ساتھ بھی رہنے کے قابل نہیں ہو وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

زبان کو لگام دے اے ذلیل عورت...... اپنے عیب چھپانے کے لیے آنسو بہا رہی ہو۔ میں ایسی بدکردار، زبان دراز عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، کمینی، بدذات ، آوارہ بدچلن...... نکل میرے گھر سے......سجاد کی زبان انگارے برسا رہی تھی۔

''خبردار......جواب تم نے زبان سے ایک لفظ منہ سے نکالا میں تمہارا منہ نوچ لوں گی کیونکہ......اب......اب تم نے مجھے طلاق دے دی ہے تم اب میرے لیے اجنبی ہو۔'' وہ غصے سے بپھر گئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

آج دس سال بعد اُسے اس دہلیز کو عبور کیا کبھی نہ لوٹنے کے لیے حالانکہ بڑے بزرگوں نے رخصتی کے وقت یہی نصیحت کی تھی کہ بیٹا اب اس دہلیز کو تم نہیں بلکہ تمہارا بے جان وجود چار کاندھوں عبور کرے گا۔ مگر...... یہاں تو اُس نے ایسے حالات اور سچویشن پیش کی تھی کہ بزرگوں کے منع کرنے پر اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا تھا۔ اب یہاں سے لٹ کر ہی داماں...... خالی جھولی دکھوں اور بربادیوں سے بھرا من لے کر میکے بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے میکے کا دروازہ خود بند کرلیا تھا۔ اپنوں کی دہلیز خود ہی کھوئی تھی۔

''اب...... رختِ سفر باندھے تو...... کس منزل کی طرف......محوِ سفر ہوگی۔ نہ کوئی منزل...... نہ کوئی سائبان......نہ کوئی چہار دیواری......نہ کوئی حصار......نہ کوئی تحفظ......نہ کوئی نشیمن نہ کوئی پاسبان وہ تھی شب کی سیاہی تھی سناٹے تھے، ہُو کا عالم ہے۔ تنہائی تھی یادوں کے ہجوم تھے۔ اچھے دنوں کی یادیں تھیں۔ بُرے دنوں کا سفر شروع ہوا تھا۔ مستقبل کی فکریں تھیں۔ حال کی کٹھن منزل اور امتحان تھے۔ آزمائشیں تھیں۔ اُس کی آنکھیں بار بار دھندلا رہی تھیں۔ اٹیچی ہاتھ میں لیے وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کھڑی تھی بار بار اُس کا خیال ثریا کی طرف جارہا تھا۔ آخر اُس نے حتمی فیصلہ کر ہی لیا اور گاڑی میں سوار ہوگئی۔ اُس نے کال بیل پر انگلی رکھی چند ہی لمحوں میں دروازہ کھل گیا سامنے ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا۔

''آداب......صنوبر نے سلام کیا۔

''آداب......'' نوجوان نے جواب دیا ثریا اشعر ہوں گی اُس نے سوال کیا۔

''جی......!'' اشعر نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''میں اُس کی دوست صنوبر ہوں۔'' صنوبر نے تعارف کروایا۔

''ارے تو آیئے نا...... باہر کیوں کھڑی ہیں۔ بیٹھیں میں ثریا کو بلاتا ہوں۔ اشعر اندر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ صنوبر نے کمرے کا جائزہ

لیا متوسط آبادی میں خوبصورت سا سجا ہوا فلیٹ تھا۔ تب ہی باتوں کی آواز پر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی اور دوسرے ہی لمحے دونوں دوست ایک دوسرے کے گلے لگے رو رہی تھیں۔ اشعر دونوں کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

''بھئی کمال ہے آپ لیڈیز کا بھی خوشی کے موقع پر بھی روتی ہیں اور خدانخواستہ غم ہو تو چپ کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ارے بھئی اس وقت رونا اچھی بات نہیں۔ ہنسیں قہقہہ لگائیں۔'' وہ ہنس رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے بری طرح لپٹی ہوئی تھیں۔

''اگر آپ لوگوں کی یہ بن بادل برسات تھمے تو ہم بھی کوئی قدم بڑھائیں۔''

''کیا مطلب آپ کا اب کیا آپ گلے سے لگ کر روئیں گے۔'' ثریا نے ہنستے ہوئے کہا تو صنوبر بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔

''بیٹھو بھئی تم لوگ بیٹھ کر باتیں کرو میں جب تک کھانا گرم کرتا ہوں۔'' اشعر نے اپنی خدمات پیش کیں ثریا نے پیار سے میاں کی طرف دیکھا۔

''جیتے رہیں جانو۔'' صنوبر مسکرانے لگی اُسے ثریا کا اس طرح کا کہنا بہت اچھا لگا۔

''یہ ہوتی ہے زندگی......'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ اُس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا پھر اشعر گڑیا کے جاگنے پر کمرے میں چلے گئے۔ تب ثریا نے اُس سے پوچھا۔

''آخر اُس نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا۔''

دونوں کی شادی آگے پیچھے ہوئی تھی پھر اشعر کا آفس کے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ دادی اماں کے انتقال کی وجہ سے صنوبر ثریا کی شادی میں شرکت نہ کر سکی تھی اس وجہ سے اشعر اُس کی ملاقات پہلی بار ہوئی تھی اس لیے اُسے اشعر سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اشعر کے کمرے سے جانے کے بعد اُس نے ثریا کو من و عن اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔

''ثریا مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب لڑکی کی شادی ہوتی ہے اور وہ ایک بیوی یا بہو بن جاتی ہے تو کوئی اور مخلوق کیوں بن جاتی ہے۔ بے حس، اندھی، بہری، گونگی، محکوم، بے بس، لاچار اُس کی لغت سے نہیں۔ نو...... نیور...... کیوں...... کیا...... کیسے...... لفظ نہیں ہوتے۔''

''جی، اچھا، او کے، ٹھیک ہے...... جیسے لفظوں سے ڈکشنری بھری ہوتی ہے اُس کی ذات کو ایک حقیر...... بے دام...... بے مول، فالتو، بیکار، فضول، ٹین ڈبے کے سامان کی طرح گھر کے ایک کونے میں جگہ بنا دی جاتی ہے۔''

ایک لڑکی کو دلہن بننے کے بعد آخر اتنے امتحانوں سے کیوں گزارا جاتا ہے؟ کیوں اُسے ڈی گریڈ کیا جاتا ہے کیوں اُس کے صبر و استقلال کا امتحان لیا جاتا ہے۔ ضبط و برداشت کی حد ختم کر دی جاتی ہے۔ صنوبر کے آنسو مستقل گالوں پر بہے جا رہے تھے۔

''ثریا...... بولو نا...... یہ کہاں کا انصاف ہے۔ ہماری ذات پر ہمارے کردار پر گھناؤنا اور گھٹیا وار کیا جاتا ہے۔ ہماری برداشت، ہماری غیرت اور روح پر چرکے لگائے جاتے ہیں۔ کیسے ہمارے وجود کو لہولہان کیا جاتا ہے۔ ثریا تم ہی بتاؤ ایسی باتیں سن کر میں کیسے برداشت کرتی کیسے بے غیرت بنتی وہ اپنی کمزوری چھپانے کی خاطر مجھ پر کیسے کیسے ننگے الزامات لگا رہا تھا۔ میں نے کبھی اُس سے کوئی شکایت نہیں کی تھی۔''

''ارے...... مجھے تو ایسی باتیں سوچنے کا وقت ملتا تھا نہ میرے جذبات یا امنگیں مجھے

گڈ گڈاتے تھے۔ میں تو صرف اور صرف نوٹ بنانے کی مشین بنی تھی ہر حال میں روپیہ کمانا تھا سجاد کا جب سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ ریڑھ کی ہڈی کے ٹوٹنے سے بالکل معذور ہو گیا تھا چلنے پھرنے سے محروم...... کسی کا محتاج...... ایسے شخص کو میرے ساتھ کیسے رہنا چاہیے تھا...... اور وہ کیسا رویہ رکھتا تھا۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا مگر اپنی ذات پر ایسا گھناؤنا گھٹیا، حملہ برداشت نہ کرسکی۔''

''اور ہمیشہ کے لیے ایسے بے حس اور ظالم شخص کو چھوڑ آئی۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دے دو۔ جیسے ہی کرائے کا مکان مل جائے گا میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گی۔''

''میری جان تم آرام سے رہو یہ تمہاری بہن کا گھر ہے۔'' ثریا نے صنوبر کے آنسو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے بڑے ہی خلوص سے کہا تو صنوبر نے اُسے گلے سے لگا لیے۔

کافی دیر تک تینوں بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر ثریا اور اشعر بیڈ روم میں چلے گئے۔ صنوبر نے بھی عشاء کی نماز ادا کی اور بستر پر چلی آئی۔

نیند بھلا کیسے آتی دس سال ایک کمرے میں ایک بستر پر سوتی رہی تھی اور آج...... ایک نئے گھر میں نئے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔

سجاد میں نے اپنی جوانی، اپنے جذبات اپنی اُمنگیں زندگی کے حسین وہ خوبصورت گنگناتے لمحات تمہاری بیماری کی نذر کر دیے۔ شادی کے دوسرے ہی سال تم معذور ہو گئے اور میں نے اپنا آپ تم پر ملیا میٹ کر دیا۔ ایک بچے کی طرح میں نے تمہیں سنبھالا۔ مہنگے علاج کو جاری رکھا۔ بہترین غذا تمہیں دی تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی جب رات کو سارے دن کی محنت و مشقت کے بعد رات میں بستر پر لیٹتی تو تب میرا دل چاہتا کہ تم...... مجھ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے لب میری تپتی پیشانی پر رکھتے میری محنت میرے کام کی تعریف کرتے میری تھکن پر میرے لیے پیار و اپنائیت کے چند جملے کہتے مجھے اور میری خدمات کو سراہتے کچھ میری ذات کے بارے میں پوچھتے، کچھ اپنی ذات کے بارے میں بتاتے......

اچھے خوبصورت انداز میں باتیں کرتے کرتے ہم سوجاتے...... مگر...... مگر...... میں صرف ایسا سوچ سکتی تھی تصور کرتی...... حقیقت سے دور دن و رات محو سفر رہے اور یہ عرصہ کرب و ملال میں گزرا کوئی خوبصورت...... یادیں ہماری زندگی میں صرف تھوڑی دیر کے لیے آتی تھیں۔

ثریا کی تین سالہ بیٹی حیاء صنوبر سے بہت مانوس ہو گئی تھی صنوبر بھی اُسے بہت پیار کرنے لگی تھی صبح اشعر، صنوبر اور حیاء گھر سے نکلتے...... دوپہر میں ثریا اور حیاء گھر پر ہوتے شام کو صنوبر پہلے آجاتی اور اشعر دیر سے گھر آتے یوں زندگی کی رتھ دھیرے دھیرے جانب منزل رواں تھی۔ صنوبر کو ثریا اور اشعر کی کوششوں سے قریب ہی فلیٹ مل گیا تھا۔

زندگی میں کوئی کشش یا خوشی نہیں تھی بس یوں ہی صنوبر کی زندگی بسر ہو رہی تھی حیاء اور وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہتے ثریا اور صنوبر بھی ایک دوسرے کو بہت مس کرتے اگر ایک دن بھی نہ ملتے۔ صنوبر کو جب بھی تنخواہ ملتی حیاء کے لیے قیمتی اور خوبصورت سے کھلونے اور نت نئی چیزیں لاتی ثریا اور اشعر بہت منع کرتے مگر ہر بار صنوبر یہ ہی کہتی کہ یہ آنی اور حیاء کا معاملہ ہے۔ آپ لوگ بیچ میں نہیں بولیں۔

''میں اپنی بیٹی کے لیے لاتی ہوں وہ حیاء کو گود میں لے کر پیار کرتی کبھی کبھی چھٹی والا دن

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

حیاء سارا دن صنوبر کے ساتھ اُن کے فلیٹ پر گزارتی۔ بے کیف بے مزا دن گزر رہے تھے حیاء کے آنے سے صنوبر کچھ مصروف ہوگئی تھی۔

مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کو کوئی معمولی سا سرا مل جائے تو پھر وہ اُسے اتنا طول دیتے ہیں۔ ایک لمبی کہانی جنم لیتی ہے جس میں کبھی کبھی سچ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لوگ محلہ ہر سوسائٹی میں ضرور کوئی نہ کوئی ہوتا ہے یہ ہی آج کل صنوبر کی کہانی ہر زبان پر تھی زیادہ تر لوگ اس کی ذات سے منفی کہانیاں گھڑنے لگے تھے کوئی کوئی ایسا تھا جو اُس کے بارے میں اچھے خیالات رکھتا ورنہ ہر کوئی منفی سوچ رکھتا تھا۔

اُدھر دونوں سہلیاں بالکل بہنوں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرتی تھیں ہر کام ایک دوسرے کو بتا کر کرتیں مگر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی کے نصیب خراب ہوں ٹینشن، پریشانیاں مسائل کسی کی زندگی میں شامل ہوں تو پھر...... بہت کم وقت ملتا ہے انہیں خوش اور مطمئن رہنے کے لیے یہ ہی حال صنوبر کا تھا۔ آج کل اشعر اپنی خوبصورت باوفا بے انتہا پیار کرنے والی بیوی کے ساتھ کچھ ناانصافی کرنے لگے تھے وہ صنوبر میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ ثریا اپنے شوہر پر اندھا اعتماد کرتی تھی وہ بھی خواب میں بھی تصور نہیں کرتی کہ اشعر اُس سے بے وفائی کرے گا اپنی بیوی کی اتنی محبت کرنے والی سہیلی کو اس نظر سے دیکھے گا۔

وہ تو اکثر حیا کو اشعر کے ساتھ صنوبر کے پاس بھیج دیتی۔ آج کل اُس کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی اس وجہ سے وہ اکثر ہی گھر پر رُک جاتی باپ بیٹی صنوبر کے پاس چلے جاتے تھے۔ اشعر نے بھی یہ ٹھان لی تھی کہ صنوبر سے ''بھائی'' کا شوشا ہٹا کر رہے گا ہر وقت اشعر بھائی اشعر بھائی...... اور آج وہ سوچ کر صنوبر کے ہاں پہنچا۔

''اشعر پلیز آپ میرا ایک کام کریں گے۔''

ثریا نے خوشامدی لہجے میں میاں سے سوال کیا۔

''ارے کہو جانِ عزیز تمہیں حکم کرنا چاہیے بندہ حاضر ہے۔'' اشعر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا خم ہوتے ہوئے کہا تو ثریا نے مسکرا کر کہا۔

''آج بہت دیر ہوگئی ہے ذرا صنوبر کو چھوڑ آئیں۔''

''جانو...... ارے جان...... تم کو ایسا لہجہ اور انداز اپنانے کی ضرورت نہیں بندہ تابعدار ہے اور پھر آپ کی عزیز از جان سہیلی کو نہیں چھوڑیں گے تو...... یہاں رہیں گے کیسے...... چلیے حضور بندہ خاکسار حاضر ہے۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے صنوبر کو سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ثریا نے تو مسکرا کر میاں کو تھینکس کہا لیکن صنوبر نجانے کیوں آج سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

''ارے نہیں میں چلی جاؤں گی ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی اتنا قریب ہی تو ہے۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی تب ہی اُسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ پیچھے دیکھنے کے لیے پلٹی تو اشعر بالکل اس کے قریب آگئے تھے۔ وہ پیچھے ہٹنے لگی تو اپنا بیلنس برقرار نہ رکھ سکی اور وہ گرنے لگی تب ہی اک لمحے میں وہ اشعر کی بانہوں میں آگئی۔

اُن کے لباس سے اٹھتی ہوئی خوشبو اور مہکتی گرم سانسیں وہ تڑپ کر اُن کی بانہوں سے نکل گئی۔

''اوہو...... بھئی کیا ہوگیا ہے صنوبر آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ چلو اوپر واپس چلتے ہیں۔''

''جی...... جی...... نہیں اشعر بھائی آپ پریشان نہ ہوں میں ٹھیک ہوں چلی جاؤں گی۔''

وہ اُن سے نظریں چرا رہی تھی۔
"ارے کیا خاک چلی جاؤ گی ابھی چکرا کر گرنے لگی تھیں۔ آگے ایک کتا یا بلی نظر آ گئی تو محترمہ دوبارہ چکرا کر گرنے لگیں گی اور پھر کوئی بانہیں بھی نہ ہوں گی جو تمہیں سنبھال لیں۔ چلو اچھا اب میں نہ گر پڑوں۔" وہ ہنس پڑے۔ صنوبر سر جھکا کر آگے آگے چلنے لگی۔
اشعر اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔ صنوبر بار بار...... اُس سین کو یاد کر رہی تھی۔ اُس کی سانسوں میں ابھی تک اشعر کی خوشبو آ رہی تھی کتنی دلفریب مسحور کن خوشبو تھی۔
اُسے اشعر کے متعلق منفی خیالات آ رہے تھے کبھی وہ سوچتی اشعر کی باتیں ذومعنی سی ہوتیں کبھی اُن کی نگاہیں اُسے اچھی نہیں لگتیں۔
آج کل ثریا کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی دوسرے مہمان کی آمد بھی کہیں کچھ پیچیدہ تھا تھرڈ فلور پر فلیٹ تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سیڑھیاں چڑھنے کو منع کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ چند ماہ کے لیے اپنی امی کے ہاں چلی گئی تھی۔ لیکن ایک مسئلہ یہ تھا کہ حیا کے اسکول میں ایگزام ہو رہے تھے۔ طے یہ پایا کہ حیاء چند روز کے لیے صنوبر کے ہاں رہے گی۔ صنوبر بھی مجبور تھی اب وہ کس طرح ثریا کو حیاء کو رکھنے سے منع کرتی۔
اکثر ہی اشعر اشاروں ہی اشاروں میں کوئی نہ کوئی جملہ کہہ جاتے اور صنوبر مسکرا کر ٹال دیتی۔
اس معاشرے میں زندگی نہیں گزار سکتی اُسے قدم قدم پر بڑے مسائل اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اپنے کردار، گفتار اور عمل کو لوگوں کی نظروں میں مشکوک نہ ہونے کے لیے بڑے کٹھن لمحات سے دوچار ہونا پڑتا ہے پھر بھی لوگوں کی انگلیاں اُس کی طرف اٹھتی ہیں۔ ابھی تم ڈسٹرب لگ رہی ہو میں چلتا ہوں تم اچھی طرح سوچ لو...... اللہ حافظ!" وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئے صنوبر نے اُٹھ کر دروازہ لاک کیا اور وہیں صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔
کیا واقعی میں تنہا زندگی نہیں گزار سکتی۔ کل میری دوست نے مجھے یہ ہی مشورہ دیا کہ میں شادی کر لوں۔ پڑوس کی خالہ ایک رشتہ لے کر آئیں کہ بیٹا میرا بھانجا ہے۔ چار بچے ہیں بیوی مرگئی چھوٹا بچہ ایک ماہ کا ہے۔ اُسے عورت کے یعنی بیوی کی ضرورت ہے جو اُس کے بچوں کی پرورش کر سکے۔
اُسے راحیلہ نے مشورہ دیا۔ پگلی کب تک ایسی زندگی گزارے گی ایک جیون ساتھی ہونا چاہیے جو دکھ سکھ میں اپنا ہو اُس کے کندھے سے لگ کر اپنے غم اپنی پریشانیاں شیئر کر سکو اور اب اشعر...... میں اشعر کے بارے میں ایسا بھی نہیں سوچ سکتی۔ میری جان سے زیادہ عزیز دوست جو مجھ پر اور اپنے شوہر پر مکمل اعتماد رکھتی ہے میں اُس محسنہ اور عزیز ترین دوست کے سہاگ پر ڈاکہ ماروں...... یہ کبھی نہیں ہوسکتا میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی میں اب اشعر کو دوٹوک جواب دے دوں گی۔
اشعر نے صنوبر کو سوچنے کی مہلت دی لیکن صنوبر نے جو فیصلہ کیا وہ اشعر تک نہ پہنچ سکا۔ چند دن یوں ہی بے آواز گزر گئے ثریا اور صنوبر کی علیک سلیک فون پر ہوتی رہتی تھی۔
آج پھر وہ بہت ڈیپریس تھی ماضی، حال، مستقبل سب ہی کے بارے میں کئی سوچوں نے اس پر یلغار کر دی تھی۔ وہ بہت اُلجھی ہوئی تھی کمپنی میں پتہ چلا کہ کینٹین کے بابا سفید براق سی بڑی داڑھی، کپکپاتے ہاتھ پاؤں، وہ صنوبر میں دلچسپی

رکھتے ہیں انہیں اُس کی جوانی، خوبصورتی، تنہائی پر ترس آتا ہے انہوں نے کسی کے ذریعے اُسے پیغام بھیجا تو بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''یا اللہ...... کیا دنیا میں کوئی بھی جوان خوبصورت عورت تنہا نہیں ہے؟ کیا میں اکیلی ہی خوبصورت اور جوان ہوں...... یہ میرا کیسا امتحان ہے مولا...... تو نے آخر میری قسمت لکھتے وقت سارے ہی امتحان میرے لیے منتخب کیے ہیں۔ آخر میری زندگی میں یہ قدم قدم پر، آزمائشیں، امتحان اور مسائل ہی مسائل ہیں تو نے میرے بخت اتنے خراب کیوں بنائے ہیں۔ کہیں ستر سالہ بوڑھا ہے تو کہیں جان سے زیادہ پیاری اور عزیز دوست کا شریک حیات...... آخر میں جاؤں تو جاؤں کہاں......

کل ہی ایک خاتون نے مجھے راستے میں روک کر مختلف سوالات کر ڈالے۔ بی بی سچی بات بتاؤں۔ انہوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر اُس سے سوال کیا؟ جی فرمائیے صنوبر نے بھرپور توجہ کے ساتھ کہا۔

مجھے تم اچھی لگتی ہو شریف بھی...... لیکن سوسائٹی کے اور لوگ تمہارے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ جوان لڑکی صبح گھر سے نکلتی ہے رات کو لوٹتی ہے کسی سے ملنا ملانا نہیں کرتی ہم سے کتنے ایسے ہیں جو اُس کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کہاں جاتی ہے؟ راتوں کو کمرے کی لائٹ کھلی رہتی ہے۔ ٹیرس کی لائٹز جلتی رہتی ہیں وغیرہ وغیرہ...... صنوبر ہنس پڑی بھئی شاباش اُن لوگوں پر جو خود سے زیادہ دوسروں کے لیے اتنا ٹائم نکالتے ہیں ورنہ آج کل کے اس دور میں ہر ایک کے پاس اتنے مسائل اور اُلجھنیں ہیں کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ بہرحال اس سوسائٹی سے جو بھی مجھ سے ملتا ہے میرے بارے میں معلومات کرتا ہے اور میں سب کو ایک ہی بات بتاتی ہوں پھر آخر ان لوگوں کو میری اتنی فکر کیوں رہتی ہے وہ دکھ سے بولی تو خاتون نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا بیٹا حوصلہ رکھو کٹھن حالات اور آزمائش کا ہمت حوصلہ اور جوانمردی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔

''بیٹا کبھی میرے فلیٹ آؤ نا میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' خاتون کا اس طرح بات کرنا اور محبت سے اپنے گھر آنے کی دعوت دینا صنوبر کو بہت اچھا لگا۔

''جی باجی میں ضرور آؤں گی فلیٹ اور فیز نمبر بتا دیجیے۔'' اُس نے دلچسپی لیتے ہوئے ایڈریس مانگا...... فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی نجانے کن سوچوں میں تھی دروازہ بند تو کر دیا مگر لاک کرنا بھول گئی۔ سر میں شدید درد ہو رہا ہے بدن ٹوٹ رہا تھا آج دوا لے آؤں گی۔ وہ آنکھیں بند کیے بیڈ پر آڑھی ترچھی لیٹ گئی۔ پھر وہی خیالوں کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔ یا اللہ مستقبل، حال اور ماضی ان دنوں کی یادیں میرے لیے عذاب بنتی جا رہی ہیں۔ میں اپنی زندگی کا کیا فیصلہ کروں؟ کہاں جاؤں۔ کیسی اُلجھنیں اور پریشانیاں شیئر کروں؟ اگر یہاں کے لوگوں کے ڈر سے ان کے سوالات سے گھبرا کر کسی اور جگہ چلی بھی جاؤں تو کیا گارنٹی ہے کہ دوسرے لوگ کھلے دل و دماغ کے ہوں گے میرے بارے میں مثبت خیالات رکھتے ہوں گے...... یہ تو ممکن نہیں کہ کھٹملوں کے ڈر سے گودڑی جلا ڈالوں......

میں ثریا کو ساری باتیں بتا کر ایک طرف سے

تو مطمئن ہو جاؤں..... دشمنِ جاں نے زندگی عذاب کر رکھی ہے وہ بڑبڑائی کروٹ بدل کر کچھ دیر یوں ہی لیٹی رہی نیند کی دیوی آخر اُس پر مہربان ہی ہوگئی۔ اذان کی آواز پر اُس نے تیزی سے آنکھیں کھولیں وال کلاک دیکھا اف خدایا...... میں کیسے سوگئی اذان ہو رہی ہے وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی پہلے لائٹ آن کی پھر وضو کر کے رب العزت کے سامنے سربسجود ہوگئی۔

یہ اِس کی بچپن سے عادت تھی جب ٹینشن میں ہوتی بہت زیادہ پریشان ہوتی تو اللہ تعالیٰ سے بڑی ہی خضوع وخشوع کے ساتھ ہمکلام ہوتی آنکھیں بند ہوتیں اور گالوں پر اشک رواں رہتے ہاتھوں کے کٹورے اشکوں سے بھیگتے رہتے دامنِ مراد تر ہو جاتا۔ پھر تب کہیں جا کر اُسے کچھ سکون نصیب ہوتا۔ جب دیر تک دعا مانگ چکی خوب جی بھر کے رو چکی تو دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا۔

یہ آج مجھے اتنی نیند کیوں آ رہی ہے کہیں بلڈ پریشر لو تو نہیں۔ اُس نے نماز کا دوپٹہ اور جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف رکھ کر دوبارہ بیڈ پر لیٹ گئی آنکھیں بند کرنے پر اُس کے سامنے حیاء کا چہرہ آ گیا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو اشعر دروازے پر کھڑے تھے۔

''ارے...... آپ...... دروازہ تو لاک تھا۔''

وہ سٹپٹا رہی تھی اُس نے دوپٹہ ڈھونڈا نہ جانے کہاں رکھ دیا تھا۔

''خیر تو ہے صنوبر...... اس وقت سو رہی ہو۔''

اشعر کا لہجہ بڑا ہی اپنائیت اور پریشانی سے پُر تھا۔

''جی...... اور ہاں دروازہ کھلا تھا میں ناک کر کے آیا ہوں۔''

''تم بیمار لگ رہی ہو۔'' اشعر اس کے قریب آ کے بڑی بے تکلفی سے اُس کا ماتھا چھوا۔

''ارے تم کو تو بہت تیز بخار ہے۔'' وہ پریشان ہو گئے صنوبر نے ایک جھٹکے سے اُن کا ہاتھ اپنے ماتھے پر سے ہٹایا۔

''پلیز اشعر صاحب بہتری اسی میں ہے کہ آپ شرافت سے یہاں سے چلے جائیں اور ہاں اب آئندہ آپ اکیلے میرے گھر نہیں آئیں گے۔ خدا کے لیے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں اُس نے دونوں ہاتھ معافی مانگنے کے انداز میں ملائے تو اشعر تیزی سے آگے بڑھے اُس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور برق رفتاری کے ساتھ جا چکے تھے کمرہ اُن کی پسندیدہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔

☆......☆......☆

''گڑیا بیٹا یہ تم...... آنٹی کی ڈائری کیوں لائی ہو۔'' ثریا نے اُس ڈائری کی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ انسانی فطرت میں تجسس اور دوسروں کی باتیں معلوم کرنے کا شوق ہوتا ہے کسی کی پرسنل لائف کے بارے میں جاننے کے شوقین لوگوں میں اس طرح کی غیر اخلاقی حرکت کرنا بری بات نہیں ہوتا سو ثریا نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک جستجو کی وجہ سے ڈائری کے صفحات پلٹتی گئی ہر لمحہ اُس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ وہ پوری توجہ اور انہماک سے پڑھ رہی تھی۔

ڈائری میں لکھے ہوئے جملے جیسے اس کو جلا کر خاکستر کیے دے رہے تھے۔ اُس کا شوہر اُس سے یوں بدل جائے گا یہ تو کبھی ثریا کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھاگ کر صنوبر کا گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے کہ وہ اس کے سہاگ پر کیوں ڈاکہ ڈال رہی ہے میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔

اسے مجھ سے ایسی کیا دشمنی ہے۔
''اُدھر...... بڑی سوچ بچار کے بعد صنوبر اس نتیجے میں پہنچی کہ ثریا کو فون کر کے سارے حالات سے آگاہ کر دے۔ اُس نے جیسے ہی فون کیا۔ ثریا بھری بیٹھی تھی اُسے موقع ملا اور اس نے خوب ٹھیک ٹھاک صنوبر کی خبر لی...... وہ بار بار بیچ میں بولتی رہی میری بات تو سنو ثریا...... سنو تو...... میں کیا کہہ رہی ہوں...... میرا یقین کرو...... ایسا کچھ نہیں ہے۔ مگر اُس نے ایک نہ سنی اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

ثریا تمام کاموں سے فارغ ہوئی آج اشعر کہہ کر گئے تھے افطار پارٹی ہے وہ افطار پر گھر نہیں آئیں گے حیاء اور صائم سو چکے تھے اچانک ثریا کو صنوبر کی ڈائری کا خیال آیا وہ تیزی سے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''مگر آج...... ان بے جان صفحات پر کیسی جاندار تحریر تھی ہر ہر لائن ہر ہر لفظ اُس کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ اُس روز اُس نے جلد بازی میں پوری ڈائری نہیں پڑھی تھی اسی لیے صنوبر کو ایک نہ کہنے دیا وہ بہت کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر میں نے اُسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور دل کھول کر اُس کی بے عزتی کی کیسی کیسی باتیں سنائی۔ بس مجھے اسی بات کا غصہ اور ملال تھا کہ اُسے چاہیے تھا کہ وہ ثریا سے سب کچھ کہہ دیتی اُس نے بھی اشعر کو ڈھیل کیوں دی۔

''مگر...... وہ...... وہ تو میری صحت' میری طبیعت اور اُس کنڈیشن کی وجہ سے کچھ نہ بول پائی صنوبر کو میرا کتنا خیال تھا اور میں...... میں تو بے لگام بولتی گئیں۔ اگر میری جگہ صنوبر ہوتی تو وہ بھی یقیناً یہ ہی کرتی۔ ثریا اس وقت ذہنی خلفشار میں اُلجھی ہوئی تھی۔

وہ چاہتے ہوئے بھی اس مسئلے پر اشعر سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میاں بیوی کے درمیان ایک بھروسے کا ہی تو رشتہ ہوتا ہے جس کے باعث دو غیر لوگ ایک دوسرے کے لیے اپنوں سے بھی زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی بھروسے کے اس پردے کو چاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

صنوبر شام کی چائے پی رہی تھی کال بیل پر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
'' آیئے آیئے باجی بیٹھیں چائے لاتی ہوں۔'' وہ خاتون کو بٹھا کر کچن کی طرف جانے لگی تو مسز رحمان نے اُسے روکنا چاہا لیکن اُس کے اصرار پر مسکرانے لگیں۔
''اچھا چلو جیسے تمہاری مرضی......''
ثریا چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی لائی تھی خوشگوار موڈ میں وہ لوگ باتیں کر رہی تھیں۔
''صنوبر بیٹا میں آج ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ صنوبر بیٹا اُس روز تم نے مجھ پر اعتماد کیا اپنی زندگی کی دکھ بھری کہانی سنائی مجھے تم سے دلی ہمدردی ہوگئی ہے اور تمہاری اس اپنائیت اور محبت کی وجہ سے میں نے تمہارے لیے کچھ سوچا ہے۔''
اگر تم کہو تو میں تمہیں اپنی بھابی بنالوں...... یہ میری دلی خواہش ہے۔ وہ پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔
''صنوبر کو میرا بھائی مجھ سے بہت چھوٹا ہے مجھے بہت عزیز ہے کیونکہ میں نے اُسے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ مارکیٹنگ منیجر ہے ہینڈسم اور خوبرو ہے حارث نام ہے۔ اگر تم چاہو تو اُس سے مل سکتی ہو۔ صنوبر چند لمحے چپ رہی۔

''جی جیسے آپ کہیں ...... لیکن باجی انہیں میری ساری تفصیل اور حقیقت سے آگاہ کردیں کوئی بات بھی نہ چھپائیں۔

''ہاں بیٹا جی میں نے ہر بات کلیئر کردی ہے حارث بھی ایک بار تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے مل کر اطمینان کرلو۔'' جی ٹھیک صنوبر نے اقرار میں سر ہلایا۔

شہر کے ایک بڑے ریسٹورنٹ میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ علیک سلیک کے بعد اصل موضوع پر آگئے صنوبر نے پوچھا۔

''آپ کو باجی نے میرے بارے میں تفصیل بتائی...... جی ...... ہاں میرا خیال بلکہ آپ کو مشورہ ہے کہ آپ اب اپنے ماضی کو بالکل بھول جائیں۔ نہ میرا ماضی مجھے یاد ہے۔''

دوسرے دن مسز رحمان صنوبر کے پاس آئی اور انہوں نے تفصیل بتائی کہ کس طرح شادی ہوگی پروگرام کے مطابق شادی کی تاریخ اور وقت مقرر کیا گیا۔ صنوبر رحمان کہہ رہے تھے کہ وہ تمہارے بڑے بھائی کی حیثیت سے شادی میں شریک ہوں گے وہ تمہیں تمہارے گھر سے رخصت کریں گے۔ صنوبر کی آنکھیں خوشی اور مسرت سے ڈبڈبانے لگیں۔ یا اللہ تو مجھ پر کتنا مہربان ہے۔ تو بڑا رحم ہے میرے مولا تو بڑا کریم ہے مجھے میرا بڑا بھائی ملا بہن ملی اور اب سائبان ملے گا۔

ایک مضبوط تحفظ ایک پیار بھرا چاہت بھرا حصار ملے گا۔ مولا میں اس قابل تو نہ تھی۔ وہ بے اختیار رونے لگی مسز رحمان نے اُسے سینے سے لگایا اُس کا ماتھا چوم لیا بیٹا یہ سب قدرت کے فیصلے اور انعام ہیں۔

آج شادی کا دن تھا۔ حارث تیار ہوکر بہن بہنوئی کے ساتھ صنوبر کے ہاں پہنچے۔ مہمانوں کو ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ شربت سے تواضع کی گئی ابھی رسومات شروع نہیں ہوئی تھی شاید کچھ اور مہمانوں کا انتظار تھا۔

آج اُسے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ اپنے سگے والدین کے سائے میں پیاء دیس سدھار رہی ہے جب رحمان صاحب نے صنوبر کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ تب ہی اشعر آگے بڑھے اور بولے۔

''اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی کا یہ سفر اور ہمسفر مبارک کرے۔ بھائی کی دلی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی اگر بھائی کی ضرورت محسوس کرو تو آدھی رات کو اس بھائی کا دروازہ کھلا ہے تمہارے لیے اور مجھے یقین ہے کہ نادانستہ جو غلطی مجھ سے ہوئی تم وہ معاف کردو گی۔'' آخری جملہ اشعر نے دھیرے سے بولا تھا۔ صنوبر نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر پہلے ثریا کو دیکھا اور پھر اشعر کی گود میں ہمکتے صائم کو سب نے بے حد خوشی اور مسرت کا اظہار کیا ثریا کی آنکھوں میں بے شمار آنسو جمع ہوگئے تھے۔ وہ تشکر کے آنسو تھے اللہ نے اس کا گھر بچالیا اور دوستی بھی۔

سین کچھ زیادہ ہی المیہ نظر آرہا تھا رحمان صاحب نے کہا۔

''بھئی اب جذباتی سین ختم کریں۔ دستر خوان لگایا جائے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' سب نے اُن کی فرمائش کو سراہا اور بڑے ہی خوبصورت حسین لمحات میں کھانا لگایا گیا۔

سب ہی بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ پُر لطف ضیافت کھلے کھلے چہرے مسکراتے لب دلوں میں مچلتی ہلچل جذبات میں ایک جوش ایک ولولہ...... اپنا پن...... ہر ایک کے دلی جذبات الگ الگ تھے مگر تھے سب بے انتہا خوش......

☆☆......☆☆

ناولٹ

فوزیہ احسان رانا

دھوپ چھاؤں سی زندگی

''بھابی آپ جانتی ہیں مسز رافع کون ہیں؟'' علی کے سوال پر ردا کے ساتھ اسفر نے بھی چونک کر علی کو دیکھا۔ ''ایک نیک دل خاتون ہیں۔'' ردا نے اُلجھنے سے علی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہونہہ نیک دل، آپ نیک کس کو کہتی ہیں؟'' ایک اور...

فائیو اسٹار ہوٹل کے فرسٹ فلور میں پارٹی کا انتظام تھا۔ ردا بغیر بازوؤں کی سیاہ ساڑھی (جس کا بارڈر ملٹی کلر کا تھا) پہنے، لمبے سیاہ سلکی بال پشت پر پھیلائے سارے انتظامات دیکھ رہی تھی وہ ہر طرح سے اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہیں کوئی کمی رہے یہ اُسے گوارا نہیں تھا۔ مختلف ڈشز کا آرڈر بک ہو چکا تھا ردا کرسیوں اور میزوں کی ترتیب اس طرح کروا رہی تھی کہ مخیّر حضرات نمایاں ہو کر بیٹھیں اگلی نشستیں اُن کے خاص مہمانوں کے لیے مختص تھیں۔

مسز رافع نے صحافیوں کو خاص طور پر مدعو کیا ہوا تھا۔ صحافیوں سے اُن کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مسز رافع ایک این جی او کی روحِ رواں تھیں۔ سوشل سرگرمیاں ہوں یا معاشرتی و سماجی مسائل وہ ہر وقت عوام کی خدمت پر کمر بستہ رہتیں وہ اپنی این جی او کی متحرک اور سرگرم عمل رکن تھیں اور اس کام میں بہت ساری خواتین اُن کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ردا اسفر اُن سب میں سرِفہرست تھی۔

ردا چونکہ ماسٹر ڈگری ہولڈر تھی اس لیے مسز رافع ردا پر زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرتی تھیں وہ ہر معاملے کو اپنی عقل و دانش اور اپنی صلاحیتوں کی بدولت زیادہ اچھے طریقے سے سنبھال لیتی تھی۔ دوسری اہم وجہ ردا بہت خوبصورت گلیمرس اور دلکش نظر آتی تھی۔ اپنی بات کہنے کا ہنر جانتی تھی اُس کی صلاحیتوں نے مسز رافع کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

ردا نے ہوٹل منیجر کو مختلف ہدایات دیتے ہوئے اسفر کا نمبر ملایا کال بک ہونے پر وہ زیرِلب مسکرائی اور ایک ادائے ناز سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''ہیلو اسفر، آپ نے آج کی پارٹی میں ضرور آنا ہے۔'' ردا اک ادائے دلبری سے بولی جیسے اُسے مکمل یقین ہو کہ اسفر اس بات ٹال ہی نہیں سکتا۔

''میں نہیں آ سکتا، مجھے اس طرح کی پارٹیز پسند نہیں ہیں۔'' اسفر دھیرج سے بولا۔

''آپ اِس وقت کہاں ہیں۔''

''میں لنچ کے لیے گھر جا رہا ہوں۔''

''اسفر پلیز میری خاطر صرف ایک بار

آ جا ئیں۔'' وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

'' او کے مگر صرف ایک بار، دوبارہ کبھی مت کہنا۔'' اسفر رسانیت سے بولا اور گاڑی گھر کی طرف موڑ دی۔

یہ سب انتظامات 'کارخیر' (این جی او کا نام) کی طرف سے ہو رہے تھے باہر سے ایک پارٹی 'کارخیر' کو ملنے کے لیے آ رہی ہے اور مسز رافع کی بہت ساری خوش رنگ امیدیں (اس وفد کے آنے سے) پوری ہونے کا قوی امکان ممکن نظر آ رہا تھا۔ امید واثق تھی کہ آنے والی ٹیم مسز رافع کی آس و امید پر پوری اُتر کر ایک بھاری رقم دے کر جائے گی اور مسز رافع زیادہ سے زیادہ غریب بچوں اور نادار افراد کے لیے کام کر سکیں گی کیونکہ یہی اُن کا مقصدِ حیات تھا۔

☆☆☆

مہمان آنا شروع ہو چکے تھے۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس مرد حضرات، خوبصورت ساڑھیاں پہنے خواتین، میک اپ زدہ مصنوعی سے چہرے، بے مقصد گفتگو کرتی خواتین، جیسے کسی فیشن شو میں شرکت کے لیے آئی ہوں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش میں بے ڈھنگی ڈریسنگ (جو اُن کے فربہی مائل بدنوں پر بالکل بھی جچ نہیں رہی تھی) کر رکھی تھی دادو اور نانو کے مرتبے پر فائز مسز گیلانی شاکنگ پنک شرٹ کے ساتھ چیک کا ٹراؤزر پہنے نوخیز الہڑ لڑکیوں جیسی حرکتیں کر رہی تھیں۔ اُن کے اسٹیپ کٹنگ ڈائی شدہ بال اُن کے بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے جھوم رہے تھے باتیں کرتے ہوئے وہ قصداً سر کو جان بوجھ کر ہلاتی تو اُن کے بال گول دائرے کی صورت حرکت میں آ جاتے وہ اپنے بالوں کی خوبصورتی اور چمک سے بخوبی آگاہ تھیں بلاشبہ اُن کے بال بہت گھنے تھے۔

ردا مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے خوش دلی سے مسکرا رہی تھی کہیں کہیں خود کو زیادہ پرجوش ثابت کرنے کے لیے ہلکا سا قہقہہ بھی ضروری سمجھ رہی تھی۔ ہر آنے والی خاتون مہمان ردا کے گال پر بوسہ دیتی اور جواباً ردا بھی اُن کے گال پر بوسہ کر رہی تھی کچھ خواتین تو صرف گال سے گال ہی مس کر رہی تھیں، خوش اخلاقی، یگانگت، اتحاد، باہمی محبت، کچھ کر دکھانے کا جذبہ حقیقتاً تھا بھی یا بس صرف مظاہرہ ہی تھا۔ جو بھی تھا بہر حال ہر چہرہ مطمئن اور شاداب نظر آ رہا تھا۔ خوشی اُن کے ہر ہر انداز سے عیاں تھی۔

بزنس مین، اور چند نامور مخیر حضرات بھی تشریف لا چکے تھے جو سامنے والی نشستوں پر براجمان تھے۔

مسز رافع تشریف لا چکی تھیں۔ سارے انتظامات کو انہوں نے توصیفی انداز میں سراہا تھا۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں واضح ستائش جھلک رہی تھی انہوں نے جی بھر کر ردا کی تندہی لگن اور دلجمعی سے سارے امور سنبھالنے کی تعریف کی تھی۔

ردا پھولے نہیں سما رہی تھی۔ مسز رافع ایک اخبار رپورٹر سے باتیں کر رہی تھیں۔ مہمان اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔

'' ردا......'' مسز رافع نے مہمانوں کے ساتھ مگن ردا کو نہایت لگاوٹ و وارفتگی سے پکارا تو ردا مسز رافع کی جانب پلٹی۔

'' جی میم آپ نے بلایا۔'' ردا مؤدب سی کھڑی تھی۔

'' آئی ایم پراؤڈ آف یو ڈارلنگ۔'' انہوں نے ردا کو گلے لگایا اور پُرجوش انداز میں اُس کی پیٹھ تھپکی۔

”میم یہ آپ کی محبت ہے ورنہ میں کس قابل، اگر میری وجہ سے کسی یتیم بچے کا بھلا ہوسکتا ہے تو میں اس سے بھی زیادہ جدوجہد کرسکتی ہوں۔“ ردا ایک عزم سے بولی۔

”اسفر آرہے ہیں کیا؟“ مسز رافع نے پوچھا۔

”جی ہاں......“ ردا نے بات سمیٹی اور مسز رافع کو متوجہ کیا کیونکہ مہمان خصوصی کی گاڑی آچکی تھی۔ مسز رافع پورے اعتماد کے ساتھ ردا کو ساتھ لیے استقبالیے کی طرف گامزن ہوئیں وہ پرتپاک استقبال کرنا چاہتی تھیں اپنے خصوصی مہمانوں کا۔

☆......☆......☆

شگفتہ بی کے ہاتھ پھرتی سے آلو کاٹنے میں مگن تھے وہ آج آلو گوشت بنارہی تھیں۔ اسفر کو آلو گوشت بہت پسند تھا اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی کھانا بنایا کرتی تھیں۔

سالن چولہے پر رکھ کر انہوں نے آٹا گوندھا ہاتھ دھو کر سلاد کاٹ کر فریج میں رکھی۔ اسفر کے آنے کا ٹائم ہورہا تھا وہ ہمیشہ کھانا گھر میں ہی کھایا کرتا تھا۔ بلاوجہ ہوٹلنگ اسفر کو پسند نہیں تھی اُسے اپنی بی جان کے ہاتھ کا پکا بہت پسند تھا۔

شگفتہ بی نے بریانی دم پر رکھی اور دوسرے چولہے پر روٹی پکانے لگ گئیں وہ روٹیاں پکاتے ہوئے زیرلب مسکرائیں وہ جانتی تھیں کہ اسفر کھانا لیٹ ہونے پر بچوں کی طرح بسورنا شروع کردیتا تھا۔ شگفتہ بی نے روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھیں۔

گیٹ کھلنے اور اسفر کی گاڑی کے ہارن کی آواز پر شگفتہ بی کے پسینے سے تر جسم میں اک توانائی سی بھر گئی۔

”السلام علیکم اماں!“ اسفر نے کچن میں آکر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام بیٹا!“ انہوں نے محبت پاش نظروں سے اسفر کو دیکھا اسفر ماں کے پاس آیا اُن کو محبت اور عقیدت سے دیکھتا رہا اور پھر اپنی ماں کو اپنے گلے لگالیا۔ شگفتہ بی کا دھان پان سا وجود اسفر کے شاندار قدوقامت والے سراپے میں چھپ سا گیا۔

اسفر نے فرطِ جذبات سے سرشار اماں کی پیشانی چومی تو ایک ماں کی دن بھر کی تھکن کہیں ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اس ایک بوسے میں اتنا احترام اور گہری عقیدت تھی کہ شگفتہ بی کو ایک روح افزا سی سرشاری اپنے تن بدن میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔ ممتا بھرا مان شگفتہ بی کو زیست کی ساری رعنائیاں ودیعت کرگیا اسفر کی محبت اور سعادت مندی پر انہیں ناز تھا۔

اسفر روز گھر سے جاتے ہوئے اور گھر آنے پر ایسے ہی اپنی بی جان کو ملا کرتا تھا۔ پرجوش محبت کا مظاہرہ، والہانہ عقیدت۔ شگفتہ بی سادہ سی خاتون تھیں۔ زمانے کی عیاریوں و مکاریوں سے ناآشنا، مگر انتہائی معاملہ فہم اور صابر خاتون جو ہر وقت خدا کا شکر ادا کیا کرتیں کہ اُن کا بیٹا تابعداری کرتا تھا خدا بزرگ و برتر نے رزق کی فراوانی عطا کی تھی۔ آسائشیں اور سہولتیں دے رکھی تھیں۔ شکر ادا کرنا تو واجب تھا اور شگفتہ بی ہر نماز کے بعد خدا کے سربسجود ہوکر شکر بجالاتی تھیں۔

”بیٹا آپ فریش ہوجاؤ میں کھانا لگاتی ہوں۔“ شگفتہ بی نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔ آنکھیں بار بار دھندلا رہی تھیں۔ آنسو چھلکنے کو بے تاب ہورہے تھے۔ آنسوؤں کی بھی عجیب کہانی ہے ہم خوش ہوتے ہیں تو بھی آنسو ہمارا ساتھ دینے چلے آتے ہیں ہم غم زدہ دکھ اور صدمے کی کیفیت میں ہوں تو بھی یہ آنسو ہمارا ساتھ دیتے ہیں سب ہمیں اکیلے چھوڑ دیں مگر آنسو ہمارا ساتھ نبھاتے

ہیں خوشی میں، ندامت میں، اظہارِ تشکر میں۔

"جی اماں میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ چلا گیا اور شگفتہ بی برتن نکالنے لگیں۔

گرما گرم کھانا ٹیبل پر سج چکا تھا۔ اسفر دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے بہت خوشگوار موڈ میں کھانے کے لیے بریانی اپنی پلیٹ میں ڈالنے لگا۔ تھوڑے سے چاول ڈال کر اُس نے کھانے شروع کیے۔

"واہ بی جان، ماں ہو تو آپ جیسی، سارا وقت کاموں میں لگی رہتی ہیں اور آپ کی بہو صاحبہ کو کوئی احساس ہی نہیں مگر داد دینی پڑتی ہے آپ کے حوصلے کی۔" ارحم کے رونے کی تیز آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

"ارحم جاگ گیا شاید......" اسفر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم کھاؤ بیٹا، میں دیکھتی ہوں۔" وہ ہانپتی کانپتی جب تک کمرے میں پہنچیں، وہ گیلا ہونے کی وجہ سے پہلو بدل بدل کر چیخ رہا تھا۔ بی جان نے اُس کے کپڑے اور پیمپر تبدیل کر کے لابی میں آئیں تب تک ڈرائیور لائبہ کو بھی اسکول سے لے آیا تھا۔ ارحم لائبہ کی طرف دیکھ کر ہمکنے لگا۔

"السلام علیکم دادو!" لائبہ بھی اسفر کی دیکھا دیکھی شگفتہ بی کو اسکول جاتے ہوئے بھی اور آ کر بھی یونہی گلے میں بازو ڈال کر پیار کرتی تھی۔ اب بھی وہ بی جان کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ شگفتہ بی کی روح شانت ہوگئی معصوم لائبہ کی محبت کا گدگداتا سا احساس اُن کے کمزور اور بوڑھے وجود میں جان سی ڈال رہا تھا۔

بی جان کو ارحم تنگ کر رہا تھا وہ اُس کو سنبھالتی، بہلاتی نڈھال ہو رہی تھیں۔ ایک سال کے ارحم کی اُچھل کود نے بی جان کی سانسیں اکھیڑ ڈالی تھیں۔ اُن کو سانس کی تکلیف تھی۔ ارحم کو پکڑے پکڑے وہ بری طرح کھانس رہی تھیں۔ اُن کی سانس ہموار نہیں ہو پا رہی تھی۔ اُن کو اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہو رہا تھا سانس لینے میں بھی دقت اور دشواری ہو رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ وہ چکراتے سر کو تھامے وہیں بیٹھتی چلی گئیں۔ ارحم اُن کے ہاتھ سے گر کر نیچے قالین پر بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ ایک سال کا صحت مند گل گوتھنا سا بچہ تھا مگر ابھی تک نہ ہی کھڑا ہوتا تھا اور نہ ہی کسی نے اُسے کھڑا ہونا اور پاؤں پاؤں چلنا سکھایا تھا۔

"دادو دادو آنکھیں کھولیں۔" لائبہ کی تیز چیخ پر اسفر کی ساری توجہ بی جان کی جانب مبذول ہوگئی۔ اُسے کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسفر بھاگ کر کمرے میں گیا تو دیکھا اماں نڈھال سی رائٹنگ ٹیبل سے ٹیک لگا کر کھانسے جا رہی ہیں اُن کی آنکھیں بند اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اسفر نے ردم فریج سے پانی کی بوتل نکالی عجلت میں گلاس میں پانی ڈالا اور اماں کے ہونٹوں سے لگا دیا پانی کا پورا گلاس پی کر اُن کے اوسان کچھ بحال ہوئے اسفر نے سہارا دے کر بی جان کو بیڈ پر لٹایا اور روتے بلکتے ارحم کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

لائبہ ابھی تک اسکول یونیفارم میں تھی، اک ناگواری کی تیز لہر اسفر کو اپنے دل میں اٹھتی اور سارے وجود میں تیزی سے پھیلتی محسوس ہوئی تھی کچھ دیر پہلے فضا خوشگوار سی تھی اب گھر کی فضا عجیب سوگوار سی ہوگئی تھی۔ کوفت و بیزاری اسفر پر حاوی ہونے لگی مگر وہ لب بھینچے ساری صورت حال پر غور کرتا رہا اُس کے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

"سکینہ......" اسفر نے گھر کی ملازمہ کو آواز دی جو گھر میں صفائی کا کام اور برتن و کپڑے دھوتی تھی۔

''جی......'' وہ تین چار گھروں میں کام کرتی تھی ہر کسی کی کوشش ہوتی کہ پہلے ہمارے گھر میں کام کرے پھر دوسرے گھر جائے مگر شگفتہ بی نے کبھی سختی نہیں کی تھی۔ بلکہ انہوں نے تو سکینہ سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ ہمارے گھر کا کام سب سے بعد میں کر جایا کرو اور بی جان ہمیشہ اُسے نا صرف باقی لوگوں کی نسبت تنخواہ بھی زیادہ دیا کرتی تھیں بلکہ وقتاً فوقتاً اُس کو کپڑے، کھانے پینے کا راشن، اور اضافی پیسے بھی دے دیا کرتی تھیں اس لیے سکینہ بھی اِس خاندان سے دلی محبت اور گہرا جذباتی لگاؤ رکھتی تھی۔ سکینہ ارحم کے بھی چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتی تھی، سنبھال بھی لیتی تھی بوقت ضرورت......

''ارحم کے لیے دودھ بناؤ'' اسفر کے کہنے پر سکینہ اثبات میں سر ہلاتی کچن میں چلی گئی اور اسفر روتے ہوئے ارحم کو بہلانے لگا۔ ابھی سیل فون کی مدھری ٹیون نے اسفر کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ ردا کا فون تھا۔ اسفر بدمزہ سا ہو گیا گھر میں تناؤ کی کیفیت تھی۔ سب افراد گم صم تھے اسفر نے بددل سا ہو کر کال ڈسکینکٹ کر ڈالی مگر ردا نے پھر کال کر ڈالی تھی۔

''جی حکم......'' اسفر باوجود کوشش کے بھی اپنے لہجے کو تلخ ہونے سے روک نہیں پایا تھا مگر ردا نے محسوس تک نہیں کیا وہ چہکتی سی آواز میں بولی۔

''اسفر آ جائیں نا جلدی۔''

''اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ردا، اور ارحم بھی تنگ کر رہا ہے لائبہ ابھی تک اسکول کے کپڑوں میں ہے میں نہیں آ سکتا۔'' اپنی بات سے شاید وہ ردا کو کچھ جتلانا چاہتا تھا۔

''آپ سکینہ سے کہیں وہ سب دیکھ لے گی آپ پلیز آ جائیں میری عزت کا سوال ہے میں سب کو بتا چکی ہوں کہ میرے میاں بھی اِس پارٹی میں آ رہے ہیں۔'' وہ سرشاری سے لبریز لب و لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''او کے......'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

سکینہ نے ارحم کو فیڈر دے کر سلا دیا لائبہ کے کپڑے تبدیل کر کے اُس کو کھانا کھلایا۔ اسفر تیار ہو کر نکلا تو سامنے ہی سکینہ لائبہ کو کھانا کھلا رہی تھی۔

''سکینہ گھر مت جانا پلیز، لائبہ اور ارحم کا خیال رکھنا، اماں کی طبیعت بھی نڈھال سی ہے میں اُن کی دوائی لے کر آتا ہوں ختم ہو گئی ہے۔'' اسفر نے کہا اور پورچ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆......☆......☆

اسفر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل اُلجھ رہا تھا اپنے آپ سے......

اسفر کو دیکھ کر ردا کے اندر احساسِ تفاخر انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا اور وہ پھرتی سے آگے بڑھی اور اسفر کا ہاتھ پکڑ کر مختلف لوگوں سے ملوانے لگی اسفر سب سے ملتے ہوئے اخلاق کا مظاہرہ ضرور کر رہا تھا مگر اندر سے وہ بجھا بجھا سا تھا۔

وہ ایک نشست پر صم گم سا بیٹھا تھا گلیمرس خواتین' بھاری جیولری' اور مک اپ زدہ چہرے جھوٹے وعدے یتیموں اور بیواؤں کی قسمت بدل دینے کے دعوے اور وعدے' کیمرے کی فلیش لائٹس' صحافی رپورٹرز کے تیزی سے چلتے قلم بیواؤں اور یتیم بچوں کو بند لفافے پیش کیے جا رہے تھے۔ مسز رافع کی واہ واہ ہو رہی تھی اور اُن کی مشیر خاص ردا اسفر کی بھی، مسز رافع اور ردا داد و تحسین سمیٹتے ہوئے اترائی اترائی سی پھر رہی تھیں۔

کھانے کا انتظام دوسرے ہال میں تھا کھانا شروع ہو چکا تھا سب لوگوں کی میزوں پر ہر چیز پہنچ رہی تھی کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوئیں سارے ہال میں چکراتی پھر رہی تھیں اسفر کھانا چونکہ کھا چکا تھا۔

دوسرا اُس کا دھیان مسلسل اماں اور ارحم میں اُلجھا ہوا تھا۔

''آئیں نا اسفر......'' مسز رافع کے کہنے پر وہ بادل نخواستہ کھانے کی جانب متوجہ ہوا قیمہ مٹر بریانی، روسٹ چکن، مٹن، گاجر کا حلوہ، طرح طرح کے رائتے اور سلاد......

اسفر کا دل نجانے کیوں ملال سے بھر گیا وہ بے توجہی سے کھیرے کے چند ایک ٹکڑے کتر کتر کر کھا رہا اُس کا مقصد کچھ کھانا نہیں بلکہ ٹائم پاس کرنا تھا وہ بے خیالی سے اِردگرد دیکھے جا رہا تھا اُسے سب کچھ اتنا مصنوعی لگ رہا تھا دکھاوا ہی دکھاوا کہیں خلوص، نیک نیتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہ مخفی نہ عیاں، اسفر کا دل اُوب کر بالکل ہی اُچاٹ ہو گیا اُسے یہ سارا منظر بے رنگ اور بہت پھیکا سا لگ رہا تھا اُس کے بیٹھنے کے انداز میں واضح اکتاہٹ تھی۔

ردا ساڑھی کی فال درست کرتے ہوئے کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی میک اپ کب کا بہہ چکا تھا اب وہ دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ بھی بہت دلکش لگ رہی تھی۔ موتیوں کی طرح سفید دانت چمک رہے تھے اسفر کڑے ضبط سے گزر رہا تھا ردا ہنستی مسکراتی پاس سے گزری تو اسفر نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا ردا نے اسفر کے چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی کو غور سے دیکھا۔

''میں گاڑی میں ہوں جلدی آجاؤ۔'' وہ اُس کا جواب سنے بغیر باہر نکل آیا۔

وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا جب اسفر نے ردا کو تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھا مسز رافع بھی اُس کے پیچھے تقریباً بھاگتی ہوئی آ رہی تھیں جیسے ہی ردا گاڑی میں بیٹھی مسز رافع بالکل پاس آ کر اسفر کی طرف کھڑی ہو کر اسفر کا شکریہ ادا کرنے لگیں اسفر بے دلی سے ہوں ہاں کرتا رہا۔

سارا راستہ خاموشی کی نظر ہو گیا اسفر کے چہرے کے تاثرات سے خائف ہو کر ردا نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک دو بار ردا نے کچھ کہنے کے لیے اپنے ہونٹ وا کیے مگر اسفر کے انداز میں اتنی رکھائی اور اجنبیت تھی کہ ردا لب بھینچ کر رہ گئی اسفر کی غیر معمولی سنجیدگی سے ردا بیزاری ہو گئی وہ تو آج بہت خوش تھی مگر اسفر اُسے یوں نظر انداز کر رہا تھا جیسے ردا اُس کے ساتھ ہی نہیں۔ ردا اسفر کے دلی جذبات سے یکسر بے خبر پیچ و تاب کھا رہی تھی اُس کے ہنستے مسکراتے چہرے پر اب اک تناؤ کی سی کیفیت چھائی ثبت ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت اسفر کے منہ سے اپنی تعریف سننا چاہتی تھی مگر اسفر......

اسفر نے ایک جگہ گاڑی روک کر اماں بی کی دوائیاں لیں اور ہنوز چپ کی بُکل اوڑھے پھر گاڑی میں آ بیٹھا ردا اُس کی ناقابل فہم کیفیت کو آبرو اچکائے کڑی نظروں سے کچھ پل دیکھتی رہی پھر لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ ردا کو اسفر کا گریز بری طرح کھٹک رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں منجمد سرد مہری ردا کو اپنے دل میں سرایت ہوتی محسوس ہو رہی تھی مگر اُس نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی اور رخ موڑے بے خیالی سے باہر دیکھے گئی۔

☆......☆......☆

جب وہ گھر پہنچے مغرب کا ٹائم ہونے والا تھا۔ گھر کی اندرونی عمارت کی لائٹس جل رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ارحم کو گود میں لٹائے سکینہ خود بھی صوفے پر بیٹھی اونگھ رہی ہے۔ نیند کے شدید جھٹکے سے وہ چند ثانیے صوفے کی پشت

سے ٹیک لگالیتی مگر اگلے ہی پل ارحم کے ہلنے جلنے کی وجہ سے اُس کی آنکھ کھل جاتی کیونکہ ارحم ابھی جاگ رہا تھا۔

اسفر نے آگے بڑھ کر ارحم کو گود میں لینا چاہا تو سکینہ نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی آنکھوں میں تھکن اور شدت کی نیند کا غلبہ تھا۔ اسفر کے ارحم کی طرف بڑھتے ہاتھ سکینہ کو خوفزدہ اور سراسیمہ کر گئے۔ ایک عجیب ڈری ہوئی سہمی ہوئی کیفیت سکینہ کی آنکھوں میں نظر آئی مگر اسفر کو سامنے پا کر وہ خوف زائل ہو گیا ورنہ وہ سوئی جاگی حالت میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ سامنے کون ہے۔

''سکینہ بہت شکریہ، اب آپ کو میں گھر چھوڑ آتا ہوں ایک منٹ۔''

اسفر نے اپنے پیچھے پلٹ کر ردا کو دیکھنا چاہا تا کہ ارحم اُسے پکڑا کر خود سکینہ کو اُس کے گھر چھوڑ کر اُس کے مگر ردا تو کب کی جا چکی تھی۔ اسفر نے بے یقین نظروں سے اپنے ساتھ خالی جگہ کو دیکھا اُس کی آنکھوں میں واضح تاسف ابھرا تھا۔

''اماں بی اب کیسی ہیں؟'' اسفر نے پوچھا۔

''جی ابھی اُن کی آنکھ لگی ہے صبح تک ٹھیک ہو جائیں گی۔'' سکینہ نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

''انشاءاللہ اور لائبہ.....''

''جی وہ بھی بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی سو گئی ہیں۔'' سکینہ نے چادر اوڑھی اور جانے کے لیے باہر نکلی اسفر نے اُسے دو منٹ رُکنے کا کہہ کر کمرے میں جا کر ارحم کو لٹایا اور انہی قدموں پر واپس پلٹا اور سکینہ کو گھر چھوڑنے چلا گیا۔ وہ دلی طور پر سکینہ کا ممنون تھا کہ جس طرح وہ اکثر ہی ایسی صورت حال میں سارا وقت گھر میں نہ صرف رُک جاتی تھی بلکہ اماں کا بھی بہت خیال رکھتی اور بچوں کو بھی سنبھال لیتی تھی اسی لیے اسفر اپنے دل میں سکینہ کے لیے خاص احترام اور عقیدت رکھتا تھا۔

اسفر جب واپس آیا تو ارحم سو چکا تھا جبکہ ردا کسی گہری سوچ میں مدغم بیڈ چیئر پر ٹانگیں اوپر رکھے بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن دبا رہی تھی۔ تازگی یا بشاشت کی کوئی رمق اُس کے دلکش چہرے پر ڈھونڈے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔

''ردا.....'' اسفر نے ہولے سے پکارا اور سر کے خفیف سے اشارے سے اُسے اپنے پاس بیڈ پر بلایا۔

''جی.....'' ردا نے اسفر کے اشارے کو مکمل طور پر سمجھ کر بھی نظرانداز کر دیا اور محض ''جی'' کہہ کر دوبارہ سے آنکھیں موند کر نزاکت سے اپنے بالوں میں ہاتھ چلانے لگی۔

''ردا یہاں آؤ میرے پاس۔'' اب کے بار اسفر نے ذرا درشتگی سے کہا تو ردا بادل نخواستہ چیئر سے اُٹھ کر بیڈ پر آن بیٹھی۔

''جی کہیے۔'' ردا نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''تھک گئی ہو۔'' اسفر نے اُس کے تھکے تھکے نڈھال وجود کو دیکھ کر پوچھا۔ اسفر نرم لہجے میں بات کر رہا تھا گو کہ اندر سے وہ بہت اُلجھا ہوا اور پژمردہ سا ہو رہا تھا مگر بظاہر وہ ردا سے ملائمت سے ہی بات کر رہا تھا۔

''ہاں تھک گئی ہوں، مگر آپ کو کیا؟'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''ردا مجھے تمہاری تھکن تمہارے دکھ کا احساس نہیں ہوگا تو بھلا اور کس کو ہوگا۔'' اسفر محبت کی آنچ دیتے لہجے میں بولا مگر ردا نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سر کو نفی میں جھٹکتے ہوئے قہر آلود نظروں سے اسفر کو گھورنے لگی۔

"بولو نا ردا......"

"کیا بولوں آپ نے اگر ایسے ہی میری انسلٹ کروانی تھی تو آپ پارٹی میں آتے ہی نا، کیا سوچتی ہوں گی مسز رافع۔" وہ رو دینے کو تھی۔ اسفر نے دکھ، صدمے اور آزردگی سے ردا کی بے حسی کو دیکھا جس کی سوئی مسز رافع پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"میں نے، میں نے تمہاری کیا انسلٹ کروائی۔" اسفر نے تحیر سے کہا۔

"سب سے الگ تھلگ بیٹھے رہے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔" ردا نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ بات کے اختتام پر اُس کا گلا رندھ گیا۔ میں کبھی بھی کسی کی بھی عزت نفس مجروح نہیں کرتا کیونکہ میں یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ہمیشہ عزت دینے سے ہی عزت ملتی ہے جیسے کہ جتنی محبت ہم کسی کو دیتے ہیں وہ اُس سے کہیں بڑھ کر ہمیں وہ محبت لوٹاتا ہے بشرطیکہ اُس میں دکھاوا نہ ہو کوئی غرض پوشیدہ نہ ہو۔" اسفر نے ردا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بتایا بلکہ سمجھایا۔

"اور پیسے کیوں نہیں دیے آپ نے۔" وہ ابھی تک وہیں تھی گھر آ کر بھی اُسی ٹرانس میں تھی۔

"کیونکہ مجھے دکھاوا اور نمود و نمائش پسند نہیں ہے۔" اسفر نے قطعی لہجے میں کہا۔

"آپ کے خیال سے ہم دکھاوا کرتے ہیں۔" وہ تنک کر دو بدو بولی۔

"ہاں ایسا ہی ہے، ردا یہ سب دکھاوا ہے نیک نیتی اور دوسروں کی فلاح و بہبود کا جذبہ کہیں نہیں تھا یا پھر مجھے ہی نظر نہیں آیا۔" اسفر کی بات پر ردا آگ بگولا ہو کر چیخنے لگی۔

"ہم جو صبح سے شام تک خوار ہوتے ہیں یہ محض دکھاوا ہے آپ کے لیے۔"

"ہاں کیونکہ اے سی گاڑی میں بیٹھی تمہارے جیسی سفر کرتی لڑکی اُس غریب اور مزدور لڑکی کے درد کو نہیں جان سکتی جو سخت دھوپ میں کھیتوں میں گندم کاٹتی ہے لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے دوسروں کے طعنے تشنے سہتی ہے زمانے کے سرد و گرم حالات کا وار اپنے نازک بدن پر سہتی ہے۔

نہیں ردا محض باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوتا یا رفقط باتیں ہی باتیں لفاظی اور غریبوں کی قسمت بدل دینے کے وعدے اور دعوے، باتوں سے کیا ہوگا ردا جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اُس کو کسی غریب کی بھوک کی شدت کیسے محسوس ہو سکتی ہے کبھی نہیں، تم لوگ کبھی بھی اُس درد اور اذیت کو جان نہیں سکتے۔" اسفر غصے میں ضرور آیا تھا اُس کے انداز میں کوفت اور ہلکی سی ناگواری کا تاثر ابھر رہا تھا۔ خفگی نے اُس کے چہرے پر تمتماہٹ بکھیر دی تنفس معتدل نہیں رہا تھا۔

"ہم صرف باتیں نہیں کر رہے کام بھی کر رہے ہیں۔" ردا نے لفظ چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے "بھی" پر خاصا زور دے کر بولتے ہوئے سلگتی نظروں سے اسفر کو دیکھا اسفر اُس کی قہر آلود گھورتی آنکھوں سے خائف ہونے کی بجائے تنک کر بولا۔

"کون سا کام، لاکھوں روپیہ برباد کر کے تقریب کا انعقاد مخیر حضرات اور باہر کی پارٹی سے کروڑوں کی امداد لینے کا کام، غریب بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کو چند ہزار بند لفافوں میں دے کر ڈالنے کا کام، مشہور ہستیوں کے ہاتھوں وہ لفافے اُن کو تھما کر اُن کی خودی اور عزتِ نفس کچلنے کا کام، دھڑا دھڑ تصویریں بنوانے یا سارا بہترین کھانا خود ہی کھا جانے کا کام، بتاؤ مجھے نیک نیتی کا جذبہ کہاں تھا اُس کھانے میں کتنے غریب لوگ شامل تھے بتاؤ۔"

تم لوگ اپنے گھروں میں بھی اچھا کھانا

کھاتے ہو تو آج کا کھانا غریبوں میں بانٹ دیتے تا کہ تم اور تمہاری مسز رافع کے طفیل ایک دن کے لیے ہی سہی غریب لوگ بھی اچھا کھانا کھا لیتے۔''
اسفر کی بات پر ردا غصے سے لال بھبھوکا ہو کر رہ گئی کچھ پل وہ خونخوار آنکھوں اور جارحانہ تیوروں سے اسفر کو دیکھتی رہی پھر کچھ لمحے خاموشی کی نظر ہو گئے۔
''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' ردا مسلسل گھورتے ہوئے سخت لہجے میں بولی اس کے لہجے کی تیزی اور تندی اسفر کو بری طرح چبھی تھی۔
''میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سب وقت برباد کرنے کے ڈھکوسلے ہیں غریب اور مستحق افراد کی مدد کرنا ہمارا یعنی ہم سب کا اخلاقی فرض ہے لیکن اس کی بنیاد خداترسی، رحمدلی اور خلوص ہونا چاہیے اردگرد رشتے داروں میں محلے میں ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ جن کی ہم مالی امداد کر سکتے ہیں تم بھی گھر کے اندر رہ کر ایسے لوگوں کی بساط بھر مدد کر سکتی ہو مگر بغیر جتلائے بغیر بتائے ایسے کہ ایک ہاتھ دے تو دوسرے کو خبر نہ ہو جو ہمارے اسلام میں طریقہ بتایا گیا ہے اس پر عمل کرو ڈیئر بہت سکون ملے گا مگر نیک نیتی اور خلوص دل سے صرف اللہ کی رضا کے لیے اسفر نے ردا کے تپتے چہرے پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے نرم لہجے اور ہلکی آواز میں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
''میں تھک گئی ہوں مجھے نیند آ رہی ہے۔'' وہ ناگواری سے پہلو بدل کر لیٹ گئی۔
''او کے سو جاؤ۔'' اسفر نے انتہائی رنج سے اپنی خوبصورت طرحدار بیوی کو دیکھا اور آنکھیں موند لیں مگر تھکا ہونے کے باوجود بھی نیند جیسے اس کی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے اسفر کی آنکھ بہت لیٹ کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کے سوئے ہوئے اعصاب ارحم کی رونے کی تیز آواز پر یک لخت بیدار ہوئے تھے۔ اس کی مندی مندی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں اسفر عجلت میں بیڈ سے اترا اور ارحم کو اپنے توانا بازوؤں میں لے کر بہلانے لگا۔ ردا بے خبر سوئی ہوئی تھی جیسے اس کا نہیں پڑوسن کا بچہ رو رہا ہے۔
''ہونہہ چراغ تلے اندھیرا' دوسروں کے ورد دل میں لیے پھرتی ہے اور اپنے بچوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں مدر ٹریسا بنی پھرتی ہے۔'' اسفر ایک نظر ردا کو دیکھ کر وال کلاک کی طرف دیکھنے لگا دس بج چکے تھے ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے دماغ میں ہلچل مچا گیا اور اسفر تیزی سے کمرے سے نکل کر اماں بی کے کمرے کی طرف بڑھا۔
اماں بی جاگ رہی تھیں جبکہ لائبہ ان کے پہلو میں سوئی پڑی تھی اسفر کا دل ملال سے بھر گیا۔
''اماں آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔'' اسفر پاس رکھی چیئر پر بیٹھ چکا تھا۔
''ٹھیک ہوں بچے، بس اٹھا نہیں جا رہا اور میری وجہ سے لائبہ کی بھی چھٹی ہو گئی اسکول سے، مجھے بہت دکھ ہے۔'' وہ شرمندہ ہو کر بولیں۔
''اماں پلیز ایسے بات مت کریں مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔'' اسفر دھیرے سے بولا پھر کچھ ثانیے توقف کے بعد کسی گہری سوچ میں متفرق جیسے خود سے ہم کلام ہوا تھا۔
''مگر اماں بی یہ آپ کی ذمہ داری تو نہیں جو آپ شرمندہ ہوں حیرت اور افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ جس کے فرائض میں یہ سب شامل ہے اسے شرمندگی تو کجا احساس تک نہیں۔
اس کی بڑبڑاہٹیں شگفتہ بی نے بھی سنی ضرور تھیں مگر قصداً انجان بن گئیں اور کچھ بھی کہنے سے

گریز کیا وہ چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ بنانے والی خاتون نہیں تھیں بلکہ جلتی آگ پر ٹھنڈا پانی ڈالنے والی معاملہ فہم اور صابر خاتون تھیں۔

''وہ اماں جب میں رات کو گھر آیا تو آپ سو چکی تھیں۔ میں نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور آپ کے آرام کے خیال سے......اُس کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ ارحم نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا تھا۔

''بیٹا مجھے لگ رہا ہے کہ ارحم کا پیمپر گیلا ہو گیا ہے اسی لیے یہ اُلجھن محسوس کر رہا ہے۔ مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ میں اس کو چینج کرواتی ہوں اور دودھ بھی بنا کر دیتی ہوں۔'' اماں بی نے ذرا سا اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اسفر کی طرف بڑھایا مگر اسفر نے انہیں لیٹا رہنے اور آرام کرنے کی تلقین اور تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے کی راہ لی۔

اسفر نے ارحم کو قالین پر بٹھایا اور اُس کے کپڑے ڈھونڈنے لگا مگر لاکھ کوشش کے باوجود بھی اُسے ارحم کا کوئی مکمل سوٹ نہیں مل رہا تھا کبھی کوئی پینٹ ہاتھ آتی تو شرٹ نہیں ملتی اگر شرٹ ملتی تو تب تک پینٹ الماری میں ٹھونسے کپڑوں میں گم ہو جاتی اسفر کافی دیر اسی تگ و دو میں لگا رہا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا اُلٹا الماری میں ٹھونسے کپڑوں کا ڈھیر زمین بوس ہو کر اسفر کو جھنجلانے پر مجبور کر گیا وہ تلملا کر رہ گیا۔ غصے سے اُس کی رگیں کنپٹیوں میں ابھرنے ڈوبنے لگیں اوپر سے ارحم کا گلا پھاڑ کر رونا......

''ردا، ردا اٹھو جلدی۔'' اسفر نے حلق کے بل چیختے ہوئے ردا کو جھنجوڑ ڈالا۔

''کیا بات ہے کیوں شور مچا رکھا ہے۔'' وہ بھی جواباً چیخ کر بولی۔

''ردا تم ایک ماں ہو خدا کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اپنے فرائض کو دلجمعی سے ادا کرو پہلو تہی مت کرو پلیز تمہاری وجہ سے آج لائبہ کی چھٹی ہوئی ہے اسکول سے۔'' اسفر لب بھینچے کھڑا تھا ردا ساکت و جامد اسفر کو دیکھے جا رہی تھی۔

''اسفر میں بہت تھکی ہوئی ہوں پلیز مجھے سونے دو جانتے ہو نا کل کی تقریب کا سارا انتظام میں نے کروایا تھا۔'' وہ پھر سے لیٹ گئی۔

اسفر بھی روتے ارحم کو وہیں چھوڑ کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا اُس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں لہو رنگ ہو کر دھک رہی تھیں۔ اُسے ردا کی بے حسی اور لاپروائی نے شدید صدمے سے دوچار کیا تھا وہ اپنی ساری ذمہ داریاں اماں بی کے کمزور کندھوں پر ڈال کر بری الذمہ ہو گئی تھی۔ اسفر ردا کی خود غرضی اور لاتعلقی پر اکثر پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا مگر اب تو حد ہو گئی تھی اور اسفر کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو کر چھلکنے لگا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ جو فرائض ردا کے ہیں وہ اُن سے پہلو تہی کر رہی ہے۔

اُس کی جو روٹین بنتی جا رہی تھی وہ اُسے اپنے گھر بچوں اور شوہر سے دور کرتی جا رہی تھی اور اسفر کے لیے اب یہ ساری بدلتی ہوئی صورتِ حال ناقابلِ قبول تھی۔

وہ انتہائی رنج و الم میں گھرا بیٹھا رہا ارحم کے رونے کی آواز اسفر کی سماعتوں میں کسی بھاری ہتھوڑے کی مانند برستی رہی مگر وہ خود پر قصداً جبر کر کے بیٹھا رہا اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کیے وہ اپنا سر ہولے ہولے اُن پر مار رہا تھا۔ اُس کی یہ اضطرابی کیفیت اُس کے اندرونی جذبات کی غماز تھی پھر ارحم کی آواز آنا بند ہو گئی۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ردا ارحم کے کپڑے اور

پیمپر بدل کر لاؤنج میں آئی تو وہاں بیٹھے اسفر کی نظر سے ردا کی نظر ٹکرائی تو وہ منہ کے زاویے بگاڑتی اور کھا جانے والی نظروں سے اسفر کو دیکھتی کچن میں جا گھسی۔

دن کے گیارہ بج چکے تھے اور ناشتے کے کوئی امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔

یہ اِس گھر کی روایت نہیں تھی دن چڑھے تک سونا دیر تک جاگنا اور دیر تک سونا اور پھر لیٹ ناشتا کرنا۔

شگفتہ شروع سے ہی بہت اصول پسند خاتون تھیں اسفر اکلوتا بیٹا تھا مگر بگڑا ہوا نہیں۔ شگفتہ نے ہمیشہ کچن کا کام خود کیا تھا اپنے میاں اور بیٹے کو خود پکا کر کھلایا ہمیشہ، اسی لیے اسفر گھر کے کھانے کا ہی عادی تھا کبھی کبھار ہی بحالتِ مجبوری وہ دوستوں کے ساتھ مل کر باہر سے کھانا کھاتا تھا۔

سکینہ آچکی تھی لائبہ اور اماں بی بھی اٹھ چکی تھیں۔ اماں بی منہ ہاتھ دھو کر اسفر کے پاس ہی صوفے پر آ بیٹھیں۔ اسفر نے لائبہ کو دیکھا اُلجھے بکھرے بال، بلکجی میلی ہوئی سلوٹ زدہ فراک اسفر کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اسفر نے اماں بی سے نظریں چرائیں وہ اپنی بیوی کی گھر اور بچوں سے لاتعلقی پر نہ صرف خود خائف تھا بلکہ اماں بی سے بھی نظریں چراتا رہتا تھا۔

اُسے احساس تھا کہ اماں بی اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور بیمار بھی ہیں بجائے اِس کے کہ اُن کا خیال رکھا جائے اُن کو گھریلو ذمہ داریوں سے الگ کر کے آرام کا موقع دیا جائے اُن کی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر کا ماحول خوشگوار رکھا جائے۔ اُلٹا اُن کے ناتواں وجود کو تھکن اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ وہ فرائض اُن کے نہیں تھے جو اُن کے کمزور ہاتھ لگن اور دلجمعی سے ادا کر رہے تھے وہ اپنی بردباری اور بزرگی کا حق ادا کرتے ہوئے ردا کی ذمہ داریوں کا بار اپنے ضعیف اور جھکے ہوئے کندھوں پر اٹھائے پھر رہی تھیں مگر اُن کی ایک دن کی بیماری نے کیسے سارا گھر اور گھر کے مکینوں کو اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔

"اماں کیا لائبہ نے میلی فراک پہن رکھی ہے؟" اسفر نے گندے میلے حلیے والی لائبہ کو اُلجھ کر دیکھتے ہوئے اماں سے سرسری سا پوچھا۔ وہ اپنی ماں سے سرزنش یا سوال نہیں کر سکتا تھا اُس کی آنکھیں ماں کے آگے جھکی رہتی تھیں یہ احساس ہر پل اسفر کے اعصاب پر چھایا رہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کو صرف تھکن دے رہا تھا ایک بوجھ اُس کے دل پر ہر پل دھرا رہتا اور اُس کے دل کی سطح نم سی رہتی۔

"پتہ نہیں بیٹا......!" اماں بی نے دانستہ اسفر اور لائبہ سے نظریں چرائی تھیں۔

"سکینہ......" اسفر کی آواز پر سکینہ دوڑی چلی آئی۔

"لائبہ کو نہلا کر اس کے صاف ستھرے کپڑے پہناؤ مجھے کراہیت آرہی ہے۔" اسفر نے لائبہ کا ہاتھ پکڑ کر سکینہ کو تھمایا تو سکینہ کچھ لمحے شگفتہ بی کی طرف دیکھتی رہی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر اگلے ہی پل سکینہ شگفتہ بی کی آنکھوں میں چھپی خاموش التجا کو دیکھ کر لائبہ کو لے کر باہر نکل گئی۔

ردا بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھولتی ہوئی ارحم کا فیڈر تیار کر رہی تھی ردا نے ارحم کو کندھے سے لگایا اور فیڈر دوسرے ہاتھ میں پکڑا کچن سے نکل کر جب وہ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو اپنے بیڈ روم میں جانے کے لیے تیزی سے بڑھتے اُس کے قدم تھم گئے۔ اماں بی کی نظر سے نظر ٹکرائی تو وہ ایک پل کے لیے نادم سی ہوگئی اُس کے چہرے پر شرمندگی واضح نظر آئی تھی وہ کمرے میں جانے کے بجائے دوسیٹر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی اُس کے بالکل سامنے اسفر

اور اماں بی بیٹھے تھے۔

''اماں بی اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔'' ردا جھینپی جھینپی سی بولی۔

''ٹھیک ہوں بیٹا اب، اِس عمر میں ایسے چھوٹے موٹے مسائل تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' اماں بی نے کسی ممکنہ بدمزگی کے تحت اپنا انداز شگفتہ سا بنا کر بات کی اُن کو اسفر کے چہرے کے بگڑتے زاویے سہارے تھے وہ ایک دانا بزرگ ہونے کے ناطے اپنے گھر کی فضا کو سوگوار اور کشیدہ نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔

اماں آپ آرام کریں ناشتہ میں بناتی ہوں۔'' خلاف توقع وہ ارحم کو دہیں اسفر کے پاس لٹا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اسفر اور اماں بی کے تحیر آمیز اُلجھن سے جاتی ہوئی ردا کو دیکھا اِس اُلجھن میں خوشگوار سی حیرت در آئی۔ اماں بی نے نم آنکھوں سے اسفر کو دیکھا تو وہ بھی پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر جبراً سجا کر اماں بی کو دیکھنے لگا۔ اِس بات سے بے خبر کہ جس ماں کو اسفر نے مطمئن کرنے کے لیے مسکان لبوں پر سجائی تھی۔ ماں تو جانتی ہے کہ یہ مسکراہٹ مصنوعی، پھیکی اور بے جان ہے صرف ماں جانتی تھی اور ماں ہی جان سکتی تھی۔

''اماں میں آپ کی دوائی لے آیا تھا آپ نے باقاعدگی سے دوائی لینی ہے پلیز۔'' اسفر نے محبت پاش نظروں سے اماں بی کو تکتے ہوئے فورِ جذبات سے اُن کے ہاتھ تھام لیے اور اپنے ہونٹ اُن کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔

''ہاں میرا بچہ، ضرور لوں گی۔'' اماں بی نے اسفر کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکال کر اسفر کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ممتا سے بھرپور وارفتگی سے اُسے دیکھا۔

وہ اونچا لمبا بھرپور مردانگیں پھیلا کر اماں بی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں ایک سکون اطمینان اور آسودگی اسفر کے اندر حائل ہونے لگی۔ ماں کا ہاتھ اُس کے بالوں میں تھا ایک ٹھنڈک اور تازگی کا روح پرور احساس اسفر کے جسم و جاں میں سرایت کر رہا تھا مگر اگلے چند پل میں کیا ہونے والا تھا وہ بے خبر تھا انجان تھا۔

''اماں بی میں بھی آپ کی گود میں لیٹوں گی۔''

لائبہ کی آواز نے اُن دونوں کو اِس خوبصورت احساس سے چونکا ڈالا جس میں وہ دونوں ماں بیٹا شاداں و فرحاں تھے۔ اسفر نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ لائبہ اُسی گندے اور ناقابلِ برداشت حلیے میں کھڑی تھی۔

''کپڑے کیوں نہیں چینج کیے تم نے؟'' اسفر زور سے دھاڑا اُس کی آواز کی گھن گرج سے معصوم سی لائبہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ سکینہ بھاگ کر آئی۔

''جی بھائی ابھی کرداتی ہوں۔'' اسفر نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اُس کے آنسو دل پر گر رہے تھے وہ صبر اور ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہا تھا اب وہ اضطرابی انداز میں اپنے ہاتھ مسلے جا رہا تھا۔

جو بات اماں بی اسفر سے چھپانا چاہتی تھیں وہ ظاہر ہو کر ہی رہی تھی۔ اماں بی جتنا اُسے پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا ہی مضطرب ہو رہا تھا۔ حالات و واقعات نا جانے کیا رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اماں بی کے ہاتھ سے سارے معاملات ایسے نکلے جا رہے تھے۔ جیسے اُن کے بدن سے توانائی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے اندر سکت نہیں ڈھونڈ پا رہی تھیں۔ وہ باوجود کوشش اور خواہش کہ بھی گھریلو معاملات سے نبرد آزما نہیں ہو پا رہی تھیں۔ پھر بھی اپنی ہمتیں مجتمع کر کے میدان میں کود پڑتی تھیں لیکن کچھ دن بعد پھر بے دم سی

ہو جاتی تھیں۔

ردا ناشتہ میز پر لگا چکی تھی اور سکینہ لائبہ کو نہلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا چکی تھی مگر پھر بھی گھر میں خاموشی اور سوگواریت سی ٹپک رہی تھی اسفر کے چہرے کے عضلات تن سے گئے بہت دیر ایک ہی پوزیشن اور ایک ہی زاویے سے بیٹھا وہ پُرسوچ انداز میں کچھ سوچتا رہا اُس کی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور چہرہ سپاٹ تھا کسی قسم کے جذبات واحساسات سے عاری۔

اماں بی چپکے سے اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھی سکینہ دوبارہ اسفر کو ناشتے کے لیے بلانے آچکی تھی مگر نہ ہی وہ ٹس سے مس ہوا اور نہ ہی اُس کی سوچ کا ارتکاز ٹوٹا۔

اسفر نے ایک کپ چائے کی شدید طلب محسوس کی تو وہیں اپنے لیے چائے منگوالی۔ سکینہ چائے دے کر چلی گئی۔

اسفر گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا مگر شکنوں کا جال ہنوز اُس کی پیشانی پر جوں کا توں تھا وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا کمرے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔

☆☆☆

اسفر اپنے کمرے میں آکر سوگیا نجانے وہ کب تک سوتا رہا کچھ دیر سونے کی وجہ سے اسفر کے تنے ہوئے کشیدہ اعصاب کسی حد تک پُرسکون ہوچکے تھے۔ وہ وہیں چند ثانیے چت لیٹا چھت کی ڈیزائننگ کو گھورتا رہا پھر صبح کے ناخوشگوار واقعات اُسے یاد آئے تو ردا کا خیال بھی......

"پتہ نہیں شاید آج ردا کا بلاوا نہیں آیا یا پھر وہ گھر کی ناخوشگوار فضا کو دیکھتے ہوئے خود ہی کہیں نہیں گئی۔" اسفر واش روم میں فریش ہونے چلا گیا۔

نہا کر وہ اپنے آپ کو قدرے بہتر اور تازہ دم محسوس کررہا تھا۔

باہر ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی اسفر نے بال سُلجھا کر اپنے بیڈ روم کی گلاس ونڈو کھولی تو ایک ٹھنڈا یخ ہوا کا جھونکا جو قدرے نم نم سا تھا۔ اسفر کے چہرے کو چھو گیا اسفر نے خوشگواریت سے اُس معطر نمی کو اپنے اندر اُتارا اُس جھونکے کی مہک نے اسفر کی طبیعت کا بوجھل پن جیسے سرے سے غائب کرڈالا اُس کی تلخی اُس کا اضطراب کہیں دور جاسوئے۔ اس نے مسرور سا ہوکر تاحد نظر نگاہ دوڑائی تو ایک مکمل اور جاندار منظر اُس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا گیا۔

عجلت میں تار پر سے دھلے ہوئے کپڑے اتارتی سکینہ اور ٹیرس پر کرسی ڈالے بیٹھی بی اماں اور ردا کے سامنے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس کھیلتے ہوئے مگن سے ازحم اور لائبہ......

"اے میرا خدا اس منظر کو امر کردے ہمیشہ کے لیے ردا کو واپسی کا راستہ دکھلا دے اس سے پہلے کہ دیر ہوجائے۔

میں جانتا ہوں ردا ویسی نہیں ہے جیسی بن گئی ہے۔ اُس کا ارادہ اچھا ہے مقصد ٹھیک ہے مگر طریقہ غلط ہے مگر وہ سمجھ نہیں پارہی تو ہی صحیح راستہ سمجھا دے۔" اسفر نے انتہائی عاجزی وانکساری سے آسمان کو تکتے ہوئے صدقِ دل سے دعا مانگی اُس کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا جانا تھا کہ دعا رد ہوجانی تھی یہ صرف خدا ہی جانتا تھا خدا اپنے پیاروں کی دعائیں مستجاب کرتا ہے۔

ردا ہنستے مسکراتے تہہ کیے ہوئے کپڑے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی جہاں اسفر بیڈ پر لیٹا کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔

عام سے گھریلو حلیے میں بھی وہ دل میں اُتر

جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ اسفر نے آنکھ کے خفیف سے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا تو وہ کسی معمول کی طرح کھنچتی چلی آئی وہ دونوں یوں باتوں میں محو اور ایک دوسرے کی ذات میں کھو گئے جیسے درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔

''چائے پئیں گے کیا کھانا تو اب دیر سے ملے گا۔'' ردا مسکراتے ہوئے چائے کا پوچھ رہی تھی۔ اسفر نہال سا ہو کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔ وہ کمرے سے نکل گئی تو اسفر نے گنگناتے ہوئے رسالہ دوبارہ اٹھالیا۔

ذرا ہی دیر بعد دو مگ چائے کے ساتھ ردا حاضر تھی۔ پھر لائبہ کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں ارحم کی شوخ قلقاریوں اور ردا کی جذبے لٹاتی بولتی آنکھوں میں زندگی کے رنگ دیکھتے دیکھتے رات ہوگئی اور رات کے مہکتے ہوئے آنچل میں بھی اُن کے لیے بہت خوش رنگ ساعتیں شوخ جذبے اور بہت سی امیدیں آس کے جگنو پوری آب و تاب سے جگمگا رہے تھے۔

جو رات اتنی خوبصورت تھی اُس کی صبح اُس سے بھی زیادہ دلفریب ہونی تھی رات ایک دوسرے میں مدغم وہ ہر گلہ ہر شکایت بھلا چکے تھے۔ رات کا آخری پہر ختم ہو چکا تھا صبح کی سپیدی اور پاکیزگی چار سو پھیل چکی تھی۔

سارے گھر میں ہلچل اور خوشگواریت پھیل رہی تھی۔

ردا سکینہ کی مدد کے بنا ناشتہ بنا رہی تھی لائبہ کو تیار کر کے اُس نے اسکول بھی بھجوا دیا۔ ارحم ابھی سو رہا تھا اور اماں بی بھی ناسازی طبع کی بدولت ابھی نہیں اٹھی تھیں۔ اسفر جب تک واش روم سے نکلا تب تک ردا اُسے کپڑے جوتے تیار کر چکی تھی۔ اسفر کے اندر آج اک مست سی ترنگ اُتر گئی تھی وہ نہال سا اُس کے لیے تیار ہو رہا تھا اور ردا اُس کی تیاری میں معاونت کر رہی تھی بالکل ویسے ہی جیسے چند سال پہلے کیا کرتی تھی۔

اُن دونوں نے بہت عرصے بعد اکٹھے ناشتا کیا تھا وہ بھی بغیر کسی بدمزگی اور تلخ کلامی کے کیونکہ آج کل اُن دونوں کے بیچ سرد مہری آن ٹھہری تھی۔ عجیب اجنبیت اور بیگانگی در آئی تھی۔

''اماں بی کو ناشتے کے بعد یاد سے دوائی دے دینا۔'' اسفر نے خاص تاکید کی۔

''جی، کوئی اور حکم......'' ردا پرانی جون میں آئی ہوئی تھی اسی لیے اٹھلا کر بہر تسلیم خم کیا۔

''شام کو اچھا سا تیار ہو جانا کہیں باہر گھومنے چلیں گے۔'' اسفر نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں کو پھیلا کر سمیٹا اُس کے دیکھنے کے انداز میں ایک خاص تاثر نمایاں تھا اپنائیت کا محبت و حلاوت کا چاہت کی چاشنی اور اپنا پن......

''جی ضرور اب آپ جائیں۔'' ردا گاڑی کا دروازہ کھول کر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگی اور اسفر نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی وہ مسکرائے جا رہا تھا مسکراہٹ اُس کے گداز لبوں پر بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

''یار اماں کا خیال رکھنا انہیں ہماری توجہ کی بہت ضرورت ہے۔'' اسفر یک دم سنجیدہ ہوا ردا نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر اسفر کی بات کی تائید کی اور اپنا بہت خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے خدا حافظ کہا ردا تادیر اسفر کی گاڑی کو جاتا ہوا دیکھتی رہی جب تک کہ گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

سکینہ آچکی تھی سکینہ بھی کبھی جلدی آجاتی تھی تو کبھی دیر سے مگر چونکہ آج وہ جلدی آگئی تھی تو ردا نے ناشتے کے برتن اُس کے حوالے کیے اور خود

آ کر اپنے کمرے میں آ کر اخبار دیکھنے لگی جو اسفر کو خدا حافظ کہتے وقت اس نے لان سے اٹھایا تھا۔

جیسے جیسے اخبار دیکھتی جا رہی تھی فخر و انبساط اُس کے اندر سے امڈ کر چہرے پر شادابی بکھیر رہا تھا۔ اخبار نے اُن کی پی سی والی تقریب کو بڑھ چڑھ کر کوریج دی تھی چاہے ایک دن کے گیپ سے ہی سہی مگر 'کارِ خیر' کی کاوش کو بھرپور طریقے سے سراہا گیا تھا مضامین 'خبریں' تصویریں ردا ہر جگہ چھائی ہوئی تھی۔ من موہنی اور نازک سی ردا مہمانوں میں گھری کھڑی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے اخبار جلدی جلدی بڑھتی چلی گئی۔ اخباری رپورٹروں نے ردا کی قائدانہ صلاحیتوں کو بہت سراہا تھا۔ ردا اخبار ہاتھ میں تھامے سوچوں میں گم تھی خوشی کے بے پایاں احساس نے اُس کی آنکھیں نم کر ڈالی تھیں۔

تبھی اُس کے سیل فون کی ہلکی سی بیپ نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا نمبر دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"ہیلو مسز رافع کیسی ہیں آپ......" ردا اندر کی بے تابی کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔ خوشی اس کے انداز سے عیاں تھی۔

"میں خوش باش ہمیشہ کی طرح تم سناؤ۔" اُن کی بات کے اختتام پر ہنسی کا جلترنگ ردا کی سماعتوں سے ٹکرایا، مسز رافع بہت خوش اخلاق خاتون تھیں یا شاید خود کو خوش اخلاق شو کرتی تھیں بہرحال جو بھی تھا وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی ہی رہتی تھیں۔ اُن کے قریبی ساتھیوں نے بھی کبھی اُن کو نڈھال پژمردہ اور رنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" ردا بھی خوش دلی سے ہنسی مگر اخبارات میں شائع شدہ مضامین رپورٹنگ اور تصویروں کا تذکرہ قصداً گول کر گئی۔ اُس کا من مچل رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات کرے مگر اک شرم اور جھجک آڑے آ رہی تھی کہ نا جانے مسز رافع کیا سمجھیں کہ ردا چاپلوسی کر رہی ہے یا اپنی تعریفوں پر نازاں ہو رہی ہے۔

"آج کے اخبارات دیکھے تم نے، واہ کمال کر دیا اتنی اچھی تصویریں، اور نعمان مرزا نے تو اتنی اچھی رپورٹنگ کی ہے کہ بس مزہ آ گیا۔" مسز رافع "بس" کو لمبا کر کے چٹخارہ لے کر بولیں۔

"جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" ردا نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا ورنہ وہ اندر سے جتنی خوش تھی اُس کا دل بہت کچھ کہنے کو چاہ رہا تھا۔

"کارِ خیر" کی بہت واہ واہ ہو رہی ہے ردا میں آج بہت خوش ہوں۔ صبح سے لوگوں کی تعریفی کالز وصول کر کر کے اب میں تنگ آ گئی ہوں اور ہاں ردا سب تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے اور کچھ تو تمہارا نمبر بھی مانگ رہے تھے خاص طور پر نعمان مرزا۔" وہ اپنی دھن میں بولے چلی جا رہی تھیں ردا چپ سی ہو گئی۔

"ردا میں نے تمہارا نمبر تم سے پوچھے بنا ہی دے دیا ہے سب کو۔" وہ متبسم لہجے میں بولیں اور پھر ردا کی مسلسل چپ کو محسوس کر کے ذرا توقف سے پھر بولیں۔

"ردا کیا میرا تم پر اتنا بھی حق نہیں۔" اور ردا جیسی معصوم اور زمانے کی عیاریوں سے نابلد لڑکی اُن کے مان بھرے انداز پر تڑپ کر ہی تو رہ گئی۔ دل پگھل کر پانی ہونے لگا۔

"ارے نہیں مسز رافع مجھے آپ پر ہر طرح کا بھروسا ہے آپ تو ایک آئیڈیل خاتون ہیں جو اپنے دل میں لوگوں کے لیے درد رکھتی ہیں میری تو دعا ہے کاش میں بھی آپ جیسی بن سکوں آپ کے نقشِ قدم پر چل سکوں۔" ردا حقیقتاً مسز رافع سے بہت متاثر تھی۔

"ارے نہیں ردا میں تو کچھ بھی نہیں ہوں یہ تو

تمہارے جیسی محبت کرنے والی ساتھی ہیں جو میری معاونت کرتی ہیں باقی اللہ بہتر کرنے والا ہے میں خود ذاتی طور پر تمہاری لگن اور محنت کی دل سے قدر دان ہوں مجھے تمہارے جیسی مخلص، محنتی، اور تندہی سے کام کرنے والی لڑکیاں بہت پسند ہیں جیسے اس تقریب کی کامیابی کا سارا کریڈٹ تمہیں ملا ہے محنت کی ہے تو نظر بھی آئی ہے آئی ایم پراؤڈ آف یو ردا ریئلی۔'' مسز رافع کہہ رہی تھیں اور ردا خوش گمانیوں کے سفر میں جانے کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی تھی۔

''بہت شکریہ نوازش ہے آپ کی، میں تو بس ایک ادنیٰ سی کوشش کر رہی ہوں خدا اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ہمیں اچھے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔'' پھر وہ دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

یہ دونوں خواتین ایک ہی NGO کے تحت کام کر رہی تھیں مگر ایک معصوم تھی خدا کی رضا کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کرنا چاہتی تھی۔ یتیموں، مسکینوں اور لاچار بیواؤں کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ صرف خدا کی خوشنودی اور اطاعت کے لیے مگر اس کی قسمت کہ وہ مسز رافع سے متاثر ہو کر اُن کے ہتھے چڑھ گئی اور مسز رافع نے ردا کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا اُس کو حد درجہ اہمیت دینا بلاوجہ تعریفیں کرنا اُس کے ہر ہر کام اور انداز کو سراہنا اور اُس کی سادہ دلی اور معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مقاصد کے لیے ردا جیسی خوبصورت اور دلکش لڑکی کو فرنٹ پر رکھنا اپنا وطیرہ بنا لیا ردا کو بھی ہلا گلا پارٹیز میں اتنی ستائش کا ملنا اچھا لگنے لگا وہ اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی کہ کس پارٹی نے کتنے پیسے دیئے اور کس پارٹی نے کتنے، وہ تو مسز رافع کی بلاوجہ کی جھوٹی محبت میں دھنستی جا رہی تھی۔ مسز رافع ردا کو جیسے چاہتی جب چاہتیں اپنے پاس بلوا لیتی تھیں اور ردا اُن کی مقناطیسی شخصیت کے سحر میں سب کچھ بھول بھال کر اُن کے اگلے حکم کو سننے اُن کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ ردا خود بھی بڑی بڑی رقوم مسز رافع کے 'کارِ خیر' کو دیا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

اسفر کا اپنا بہت بڑا شاپنگ سینٹر تھا جہاں سے دنیا جہان کی ہر چیز ملتی تھی۔ اسفر اس وقت سیکنڈ فلور میں بنے اپنے شاندار آفس میں بیٹھا تھا لڑکا بھاپ اڑاتی چائے کا مگ اور آج کا اخبار اسفر کے سامنے رکھ گیا تھا۔

اسفر خوشگوار موڈ میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اخبار دیکھنے لگا، اخبار الٹ پلٹ کرتے ہوئے 'کارِ خیر' کی تقریب کی جھلکیاں اور رپورٹنگ اسفر کے سامنے تھی۔

معروف اداکار مصطفیٰ گردیزی اور پریس رپورٹر نعمان مرزا کے ساتھ ردا اسفر کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی اور یہ منظر کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لیا تھا۔ مختلف نامور لوگوں کے ساتھ ردا کی تصویریں تھیں اخبار والوں نے بلاوجہ کی مدح سرائی اور مبالغہ آرائی کی حد تک جھوٹ لکھا تھا اسفر جانتا تھا مگر ردا کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔

اس نے بے دلی سے اخبار کو ایک طرف پٹخا اور علی ارسلان کو بلانے کے لیے بیل دی۔

''جی سر......!'' گڈو اسفر کی بیل کی آواز پر دوسرے ہی پل حاضر تھا۔

''علی ارسلان آ گیا کیا؟''

''جی سر......'' گڈو نے مودب انداز میں جواب دیا۔

''اُسے میرے پاس بھیجو۔'' اسفر کی بات پر

گذد مستعدی سے باہر لپکا اور لابی میں غائب ہوگیا۔

اسفر کی بقیہ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اس نے بے دلی سے کپ سائیڈ پر کیا اور کمپیوٹر آن کرنے لگا اُس کا ذہن سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کوئی خیال ذہن میں ٹک نہیں رہا تھا۔ وہ موجودہ ریٹس اور ختم ہونے والی نئی پرانی پراڈکٹس کے بارے میں علی سے بات کرنا چاہتا تھا تاکہ کمپنیز کو آرڈر بک کروائے جاسکیں۔ کمپیوٹر آن تھا اور اسفر بے خیالی میں اسکی چمکتی ہوئی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

''السلام علیکم!'' علی ارسلان نے اندر جھانک کر کہا۔

''وعلیکم السلام آؤ بیٹھو علی کیسے ہو۔'' اسفر نے چیئر کی جانب اشارہ کر کے ساتھ سلام کا جواب بھی دے دیا۔

''آپ نے بلایا'' علی ارسلان استفہامیہ انداز میں بولا۔

''ہاں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' اسفر نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ تبھی علی نے سامنے رکھے اخبار میں ردا کی تصویر دیکھی۔

''اسفر یار یہ بھابی ہیں نا؟'' علی ارسلان کی آنکھیں تحیر سے کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں اب وہ سوالیہ انداز میں اسفر سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں..... '' یہ ایک لفظ ''ہاں'' کہنے میں اسفر کو کتنی دقت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا جیسے وہ کوئی مجرم ہو اور اپنے کیے ہوئے جرائم پر نادم۔

''مگر کیوں یار، تمہاری بیوی اور اخباروں میں.....تم جو سو پردوں میں چھپا کر نیکی کرتے ہو تمہاری بیوی نیکیوں کی تشہیر کرنے والی کیسے ہوسکتی ہے۔ اخبارات میں تصویریں یہ خودنمائی، نمود و نمائش یہ دکھاوا یہ سب کیا ہے کیسے کیوں؟'' علی ارسلان کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ اسفر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ردا ایسی نہیں ہے وہ بہت اچھی ہے بس شاید سراہے جانا واہ واہ اور داد و تحسین اُس کے من کو بھانے لگے ہیں۔ شاید وہ اچھا عمل کرنے کے لیے پیچیدہ اور اُلجھاؤ والا راستہ منتخب کر بیٹھی ہے۔ یار بھول بھلیوں میں بھٹک گئی ہے۔'' علی ارسلان ہونقوں کی طرح بھونچکا رہ گیا اُسے یوں لگا جیسے اسفر کی آواز بہت دور سے آرہی ہے مدہم ٹوٹی بکھری جیسے کوئی خود سے ہم کلام ہو۔

''مگر یار یہ سب ٹھیک نہیں'' علی یاسیت بھرے لہجے میں بولا تو اسفر پھیکی سی ہلکی ہنسی ہنس کر سر جھٹکنے لگا۔

''جیسے مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ انتہائی رقت آمیز آواز میں بولا علی کو اسفر کا انداز بہت پُر تفکر اور اُلجھا ہوا سا لگا اسفر اُس کے اسکول کے زمانے کا دوست تھا۔ وہ دونوں بزنس پارٹنر بھی تھے اور اچھے دوست بھی......

پھر اسفر نے تفصیل سے علی کو ساری صورت حال بتائی جس کے بعد اُسے جاننے میں دیر نہیں لگی کہ ردا کن ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن رہی تھی۔ پہلے تو اُس نے سرسری سا ہی اخبار دیکھا تھا اور ردا کو یوں مردوں کے ساتھ دیکھ کر نہ صرف علی کو شاک لگا تھا بلکہ صدمہ، تاسف اور آزردگی نے اُس کے چہرے پر مردنی سی بچھا دی تھی مگر اب وہ اخبار کو نہ صرف بغور دیکھ رہا تھا بلکہ زیرک نگاہی سے مطالعہ بھی کر رہا تھا اور سب کچھ اُس کی سمجھ میں آتا جارہا تھا۔

''علی ردا کی یہ روش میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔ میں کوئی کنزرویٹو قسم کا

مرد نہیں ہوں میں جبر کرنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی عورت کے اوپر اپنی پسند زبردستی ٹھونسنے کا قائل ہوں۔ مگر یار یہ ردا کی کامیابی ہوتی تو میں اُس کا ساتھ دیتا جی بھر کر اُسے سراہتا مگر یہ تو سراسر دھوکے مکروفریب کا راستہ ہے سب ڈرامہ ہے۔ اسفر کی تلملاہٹ پر اب جھنجلاہٹ حاوی ہونے لگی تو وہ ذرا دیر سانس لینے کو رُکا اس کو کسی بہت اپنے اور ہمدرد کا کندھا درکار تھا اور علی ارسلان سے بڑھ کر کون اپنا اور غمگسار ہوسکتا تھا۔

''یار تو ٹھیک کہتا ہے۔'' علی اس ساری غیر متوقع صورت حال میں خود کو نہایت بے بس محسوس کررہا تھا وہ تو ڈھارس بندھانے اور تسلی کے دو بول کہنے کے بھی قابل خود کو نہیں سمجھ رہا تھا مگر وہ دل سے یہ ضرور چاہتا تھا کہ اگر اسفر اس مسئلے کو لے کر پریشان ہے تو دل سے شیئر کرلے کم از کم اُس کے دل کا بوجھ تو ہلکا ہوجائے گا۔

''پتہ ہے علی سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ ردا کو ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ وہ مجھ سے گھر سے اور بچوں سے دور ہوتی جارہی ہے۔ وہ ایسی تو نہیں تھی پتہ نہیں اُسے کیا ہوگیا ہے اماں بی بیمار ہیں میں بہت پریشان ہوں نہ ہی میں اُسے ہر وقت روک ٹوک کرسکتا ہوں کہ ایک تو یہ میرے مزاج کا حصہ نہیں۔ دوسرا میں نہیں چاہتا کہ میری ماں ہمارے آپس کے جھگڑے اور چپقلش سے مزید پریشان ہوں میں کیا کروں علی آخر کیا کروں؟'' وہ اَدھ موا اور نڈھال سا دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں تفکر کی لکیریں نمایاں نظر آرہی تھیں، پیشانی شکن آلود تھا اور آنکھوں کی سطح نم ہورہی تھی۔

''اسفر ریلیکس یار سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' علی ارسلان کو خود اپنے الفاظ کھوکھلے لگے تھے مگر کچھ تو کہنا ہی تھا نہ اپنے عزیز از جان دوست کو مطمئن کرنے کے لیے......

''میں اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں علی مگر ناجانے مسز رافع کے الفاظ میں ایسا کیا جادو ہے کہ وہ جب بلاتی ہے ردا گھر بچے حتیٰ کہ مجھے بھی نظر انداز کرجاتی ہے مجھے پتہ ہے وہ خود غرض نہیں تھی اور نہ ہے بس اُسے وہ گلیمرس دنیا نام نہاد شہرت جھوٹی تعریفیں اچھے لگنے لگی ہیں۔ اُس نے ہماری طرف سے بے حسی اپنے اوپر اوڑھ لی ہے۔'' اسفر نے بے بسی کے دبیز احساس تلے دب کر اپنا ہونٹ دانتوں تلے کچل ڈالا وہ زود رنج ہوکر خود کو اذیت دے رہا تھا بگڑتی ہوئی صورت حال نے اسفر جیسے جواں ہمت مرد کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''ہاں مسز رافع وہ عورت ہے جس نے کبھی گھر بنانے کی ضرورت نہیں سمجھی فراڈ اور چالباز، مکار عورت 'کارِخیر' کی میڈم مسز رافع اپنے شوہر کی تیسری بیوی ہے۔ اُسے شوہر نہیں کاٹھ کا اُلو چاہیے تھا اپنے لیے، اُس عورت کو صرف اپنی آزادی اور محفلوں کی جان بننا پسند ہے چاہے وہ 'کارِخیر' کی آڑ میں ہو یا کسی دوسرے ذرائع سے، نفرت ہے مجھے ایسی بے راہ روی کا شکار عورتوں سے جو ہوتی کچھ اور ہیں نظر کچھ اور آرہی ہوتی ہیں۔ جو مرد سے ہر طرح کا تعلق رکھنا فیشن کا حصہ سمجھتی ہیں۔'' غصے کی شدت سے اُس کی آواز لرز رہی تھی وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگیا اور جلدی سے پانی کا گلاس اُٹھا کر لبوں سے لگالیا۔

''علی بہت ساری این جی اوز حقیقتاً نیک نیتی کے جذبے کے تحت کام کررہی ہیں ہم سب کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔'' اسفر نے حقیقت پسندی سے کہا۔

''مجھے کسی اور کا نہیں پتہ میں صرف مسز رافع کی

دوغلی پالیسی کی بات کر رہا ہوں۔ جو عورت اپنی اولاد کو توجہ اپنائیت اور محبت نہ دے سکی جو اپنی اولاد کی نہ بن سکی وہ دوسروں کی اولاد کی فلاح کا کام کیا خاک کرے گی وہ نہ کبھی اچھی ماں کے فرائض ادا کر سکی ہیں اور نہ ہی بہترین بیوی کے......'' اب کی بار علی کے انداز میں رکھائی کے ساتھ ساتھ عجیب حقارت سی اسفر کو محسوس ہوئی تھی۔

اسفر نے نپی تلی گفتگو کرنے والے علی ارسلان کو دیکھا جو انتہائی غصے کی حالت میں بھی کبھی اخلاق کا دامن نہیں چھوڑتا تھا تو اب وہ ایک یکسر اجنبی عورت کے بارے میں اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ اچھی ماں نہیں، اچھی بیوی بھی نہیں اور وہ بھی اتنی نفرت اور کراہیت سے۔

''لیو اٹ یار......'' اسفر نے کہا علی ارسلان کی بگڑی حالت سرخ آنکھیں رنج والم میں مدغم وجود اسفر اپنی پریشانی بھول کر یک ٹک علی کو دیکھے گیا جس کی آنکھیں دھک رہی تھیں۔ اسفر کو اس لمحے علی ارسلان بہت گم صم اور سوچوں میں کھویا ہوا سا محسوس ہوا۔

''کہا نا چھوڑو یار، یہ بتاؤ انکل کی طبیعت اب کیسی ہے۔'' اسفر نے علی ارسلان کی سوچوں کا ارتکاز توڑنے کی بھرپور کوشش کی اور ہوا بھی ایسا ہی، علی ارسلان جیسے سوچوں کے سفر سے یوں واپس لوٹا تھا جیسے یک دم نیند سے جاگا ہو۔

''ٹھیک ہیں خدا کا شکر ہے اب اُن میں بہت بہتری آئی ہے، یار میں تمہارا بہت ممنون ہوں کہ تم نے اِس کڑے وقت میں میرا بہت ساتھ دیا ورنہ کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔'' علی دھیرے سے بولا محبت کی چمک اُس کے گالوں کو دہکا رہی تھی چند لمحے پہلے کی صدماتی کیفیت سے وہ باہر نکل آیا تھا اور اب پھر پہلے والا علی لگ رہا تھا خوش باش۔

''چھوڑو یار، جو کرتا ہے صرف اللہ پاک ہی کرتا ہے ہم انسانوں کی بساط کیا جو اپنی مرضی سے ایک سانس تک لینے پر قادر نہیں ہے انسان صرف وسیلہ بنتا ہے میں نہیں تو کوئی اور سہی۔'' اسفر نے کہا اور چیئر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کہاں......؟'' علی کا انداز سوالیہ تھا۔

''اُو یار کام کی بات تو کوئی ہوئی ہی نہیں آؤ باہر سے چائے پی کر آتے ہیں۔'' اسفر نے علی کو اٹھنے کا اشارہ کیا وہ ہر صورت علی ارسلان کو پُرسکون دیکھنا چاہتا تھا اور یہ بات اس وقت اسفر کے ذہن میں کسی پھانس کی طرح اٹک گئی تھی کہ علی اندرونی طور پر پریشان ہو گیا ہے۔ مگر کیوں؟ یہ اسفر نہیں جانتا تھا اُس کے پیش نظر اس وقت اُس سوالیہ 'کیوں' کو کھوجنا نہیں بلکہ علی کو اُس ان دیکھی انجانی اذیت سے نکالنا تھا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ ہنستے مسکراتے آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

☆......☆......☆

اسفر اور علی اسکول میں ملے تھے جب وہ دونوں کلاس میں 8th میں نئے نئے آئے تھے۔ علی ٹرانسفر ہو کر دوسرے اسکول سے آیا تھا۔ چند دنوں میں ہی وہ دونوں دوست بن چکے تھے اور پھر ہر آنے والا دن اُن کی دوستی کو مستحکم کرتا چلا گیا۔ علی اسفر کے ساتھ ساتھ رہتا اُس کی سنگت میں وہ دھیرے دھیرے بدل رہا تھا۔ اپنی لاپروائی وہ چھوڑتا جا رہا تھا اور پڑھائی توجہ اور لگن سے کر رہا تھا پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ۔

وہ دونوں روز اکٹھے لنچ کرتے تھے۔ اسفر کے لنچ بکس میں اکثر ہی دو پراٹھے ہوتے تھے کبھی آلو والے اور کبھی قیمے والے اور زیادہ تر دال والے......

اس وقت بھی وہ دونوں الگ تھلگ اسکول گراؤنڈ کی ایک طرف بینچ پر بیٹھے تھے۔ اسفر نے لنچ بکس کھولا۔

''واؤ دال والے پراٹھے......'' علی نے چمکتی آنکھوں سے پراٹھوں کو دیکھتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

''تمہیں پسند ہیں دال والے پراٹھے کیا؟'' اسفر نے اُس کی بے ساختہ خوشی کو حیرانی سے دیکھا۔ علی نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا اور پراٹھا کھانے لگا۔

''کل کی دال بچی پڑی تھی تو اماں بی نے پراٹھوں میں ڈال دی۔'' اسفر نے سادگی سے کہا۔

''کیوں......'' علی نے پوچھا۔

''کیوں کا کیا مطلب...... اماں بی کہتی ہیں کہ خدا کے دیے ہوئے رزق کی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے اس لیے......؟'' اسفر اپنی اماں بی کی طرح قناعت پسند اور خدا کے احکامات پر چل رہا تھا یہ اُس کی اماں بی کی تربیت اور دیا ہوا اعتماد تھا کہ اُس نے نہ ہی یہ بتانے میں کوئی عار یا شرمندگی محسوس کی تھی کہ دال کل کی بچی ہوئی ہے اور نہ ہی اپنی اماں کے افکار بتانے میں اُسے کوئی دقت کا سامنا تھا۔

''مگر یار اچھی اچھی چیزیں دوسروں میں آئی مین غریبوں میں بھی بانٹی جاسکتی ہیں۔'' علی اپنے انداز میں سوچ رہا تھا۔

''یار علی دوسروں کو ہمیشہ اچھی چیزیں دینی چاہئیں بچی ہوئی کیوں، تاکہ ہم اُن پر ثابت کرسکیں کہ وہ ہم سے کمتر ہیں، خود ہم تازہ کھائیں اور اُن کو باسی، ہمارے محلے میں جتنے بھی ضرورت مند گھرانے ہیں اماں اُن کی مالی معاونت کرتی ہیں مگر اس طرح کہ اُن کی انا اُن کی خودی مجروح نہ ہو میری اماں بی بہت اچھی ہیں۔'' اسفر کی باتیں علی کو حیران کرتی تھیں اُس نے ایسا ماحول کہاں دیکھا تھا ایسی باتیں کہاں سنی تھیں۔

''علی......'' اسفر نے ہولے سے اُسے پکارا کیونکہ علی کہیں کھوسا گیا تھا۔

''جی......'' اُس نے ایک لفظی بات کی۔

''کھاؤ نا رک کیوں گئے۔'' اسفر نے دیکھا علی کے ہاتھ میں چھوٹا سا نوالہ تھا مگر اُس کا ہاتھ ہوا میں معلق تھا اور وہ خود ساکت نظروں سے نجانے کہاں دیکھ رہا تھا۔

''علی تمہاری ماما کیسی ہیں تمہاری پسند سے ناشتہ بناتی ہیں کیا؟'' اسفر کی بات پر ڈھیروں پانی اُس کی کانچ جیسی چمکتی آنکھوں میں جمع ہوا اور اگلے ہی پل اُس نے اپنی آنکھیں بے رحمی سے رگڑ ڈالیں۔

''میری ماما مرگئی ہیں۔'' وہ رو رہا تھا۔

''اوہ آئی ایم سوری! یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔'' اسفر درد دل رکھنے والا نیک دل لڑکا اپنے دوست کے دکھ پر رو پڑا۔

''اسفر میری ماما مجھے ماں جیسی کبھی نہیں لگی کبھی نہیں میرے ڈیڈی اور میری ماما مجھ سے پیار نہیں کرتے میری ماما زندہ ہیں مگر میرے لیے وہ تب ہی مرگئیں تھیں جب میں پیدا ہوا۔ میری ماما کو ہمیشہ اپنی ڈریسنگ اپنی پارٹیز کی تو فکر رہتی تھی مگر اپنے اکلوتے بیٹے کی نہیں میں ہمیشہ نوکروں کے رحم و کرم پر پلتا رہا۔

''ڈیڈی کی اپنی مصروفیات تھیں اور مما کی اپنی، نقصان صرف میرا ہوا میرا دل کرتا ہے میں ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالوں مار ڈالوں خود کو۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑا اور اسفر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا وہ علی کو کن الفاظ میں تسلی دے۔ اُس نے بے ساختہ علی کو گلے لگا کر بھینچ ڈالا علی نجانے کب

تک اپنے دکھ پر روتا رہا اور اسفر اُس کے دکھ کو محسوس کر کے روتا رہا۔

☆......☆......☆

پھر اُن کے امتحانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسفر فرسٹ جبکہ علی سیکنڈ آیا اسفر بہت خوش تھا اور علی بھی، کیونکہ یہ سب اسفر کی محبت اور دوستی کی بنا پر ہی ہوا تھا ورنہ وہ تو ہمیشہ بمشکل ہی پاسنگ مارکس ہی لے پاتا تھا۔

نئی کلاسز شروع ہونے کی وجہ سے ابھی پڑھائی اتنی خاص نہیں ہو رہی تھی اس لیے وہ تواتر سے اسکول نہیں جا رہے تھے۔ اسفر آج گھر پر ہی تھا اور علی علی کی گردان کر کر کے شگفتہ بی کے کان کھا رہا تھا وہ دھیمے سروں میں گنگنا بھی رہا تھا۔ اماں بی مسکراتے ہوئے اُس کی باتیں سن رہی تھیں۔

''اماں علی بہت خوبصورت ہے۔'' اسفر کا انداز دلکش اور لہجہ محبت سے معمور تھا۔

''سارے بچے ہی پیارے ہوتے ہیں بیٹا۔'' اماں بی نے چکن فرائی کرتے ہوئے کہا۔

''مگر علی بہت پیارا ہے اماں۔'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔

''اچھا بابا اچھا اسفر کا دوست علی سب سے سویٹ ہے ٹھیک۔'' اماں نے اسفر کی بات کو مانا اور تائیدی انداز میں اُس کو دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''اسفر ایسا کرو بیٹا علی کو کل کھانے پر گھر بلا لو اس طرح میں بھی اُس سویٹ لڑکے سے مل لوں گی۔ اور وہ بھی مجھ سے مل لے گا'' اماں بی کی بات پر اسفر خوشی سے اُچھلنے لگا۔

''جی اماں بی یہ ٹھیک ہے اُسے بھی میری اماں بی سے ملنے کا بہت شوق ہے۔'' اسفر اماں بی سے لپٹتے ہوئے بولا۔

''میں صرف تمہاری نہیں علی کی بھی اماں ہوں سمجھے۔''

''سمجھ گیا میم۔'' وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گیا اُس کا ارادہ علی کو فون کرنے کا تھا۔ اسفر نے علی کو فون کیا وہ دونوں بہت دیر باتیں کرتے رہے اور پھر علی نے کل آنے کا وعدہ کر کے کال کاٹ ڈالی۔

☆......☆......☆

آج صبح سے ہی موسم بہت زبردست ہو رہا تھا۔ اسفر بہت خوش تھا پھر کچھ خیال آنے پر اُس نے علی کو کال کر کے ناشتے پر ہی آنے کا کہہ دیا علی سوتے سے جاگا تھا۔

''اسفر اتنی صبح مجھے کون چھوڑ کے آئے گا؟'' اسفر کے گھر جانے اور اماں بی سے ملنے کی خوشی نے اُس کے سوئے سوئے سے اعصاب یک لخت بیدار کر ڈالے۔ مگر اب یہ خوف اُسے ڈرا رہا تھا کہ اُسے اتنی جلدی گھر سے اسفر کے گھر تک کون چھوڑنے جائے گا کیونکہ علی کے ڈیڈی گھر پر نہیں تھے اور ملازم سکون سے سو رہے تھے۔

''علی تم جلدی سے تیار ہو جاؤ میں اور ابو تمہیں لینے آ رہے ہیں۔'' اسفر نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''اوکے......'' علی کہہ کر واش روم میں گھس گیا۔

جب تک وہ تیار ہوا اسفر اپنے ابو کے ساتھ آ چکا تھا۔

گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر علی باہر آیا اسفر کے ابو کو سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا پھر وہ لوگ اسفر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر وہ اسفر کی امی سے ملا۔

شگفتہ بی نے اس کے سلام کا محبت سے جواب دیا اور جلدی جلدی ناشتے کی میز پر آنے کا کہہ کر خود کچن میں غائب ہو گئیں۔ ناشتے کی میز پر وہ لوگ ہنستے بولتے رہے علی کے والدین کے بارے میں

پوچھتے رہے اور انہیں بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ علی کو یہ پُرسکون ماحول بہت اچھا لگا اسے محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسفر کے گھر پہلی دفعہ آیا ہے اتنی اپنائیت اتنا خلوص وہ بہت خوش تھا۔

پھر وہ شام تک اِدھر ہی رہا شام کو اسفر اپنے والد کے ہمراہ اُسے گھر چھوڑ آئے تھے۔ علی رات کو جب بستر پر لیٹا تو نا چاہتے ہوئے بھی اپنے گھر سے اسفر کے گھر کا موازنہ کرنے لگا۔ قیمتی اشیاء سے سجا اسے اپنا گھر اسفر کے گھر کے سامنے ہیچ لگا۔ ہر انسان محبت چاہتا ہے، اپنائیت اور خلوص زندگیوں کو مثبت راستے پر چلنے میں مدد دیتے ہیں مگر یہ بات خود نمائی میں مبتلا لوگ کہاں سمجھ سکتے ہیں۔

علی نے اپنی ماں کو صرف بناوٹی زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ باپ کو صرف اپنے بزنس میں دلچسپی تھی۔ وہ دونوں ملازموں کی فوج اور زندگی کی آسائشیں دے کر اپنے فرائض سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔

اول تو ماں باپ علی کو ساتھ کبھی گھر پر نظر ہی نہ آئے اور اگر بادلِ نخواستہ ساتھ ہوتے تو صرف لڑتے جھگڑتے رہتے۔ لوگوں کے سامنے انتہائی مہذب نظر آنے والے مسٹر اینڈ مسز ارسلان کی حقیقت سے صرف اُن کا بیٹا ہی واقف تھا اور عاجز بھی تھا۔ پھر یہ کمزور سا رشتہ ایک دن ٹوٹ گیا اور علی کی والدہ اُسے باپ کے حوالے کر کے کسی اور کے ساتھ چلتی بنیں...... شاید وہ شخص زیادہ پیسہ والا تھا۔

☆......☆......☆

علی ذہنی طور پر اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اُسے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

''کیا مجھے اسفر اور بھابی کو بتا دینا چاہیے کہ دراصل مسز رافع ہی میری ماں ہیں۔ مگر اس کے لیے مجھے اپنی ساری کہانی بھابی کو سنانا پڑے گی۔''

علی نے ارسلان احمد کو دوائی دیتے ہوئے سوچا علی نے سیرپ کا چمچ خود اُن کے منہ میں ڈالا۔ ارسلان احمد کو عرصہ ہوا سب مستیاں اور رنگینیاں خاک ہو چکی تھیں بہت سالوں سے وہ بہت ساری بیماریوں میں مبتلا ہو کر مسلسل بستر کے ہو کر رہ گئے۔

''جب میں چھوٹا تھا تب مجھے اِن کی ضرورت تھی۔'' علی نے چت لیٹے اپنے بابا کو دیکھ کر سوچا۔

''اور اب......'' علی نے دوائی کی شیشیاں اُٹھا کر فریج میں رکھیں۔

''اگر اماں بی اور اسفر میری زندگی میں نہ آئے ہوتے تو شاید آج بھی اِن کو اِن کے کیے کی سزا خود اپنے ہاتھوں سے دے رہا ہوتا اِن کو میری بے رخی میری بے اعتنائی وقت سے پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیتی۔'' علی نے دیکھا بابا آنکھیں موندے لیٹے تھے علی چپکے سے کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ بہت دیر ٹیرس پر ٹہلنے کے بعد اچانک اس نے فیصلہ کیا اور بہت تیزی سے ٹیرس کی سیڑھیاں پھلانگتا ٹیبل سے گاڑی کی چابی اُٹھا کر اسفر کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

''اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے مجھے بتانا ہو گا سب کچھ۔'' اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

جب وہ اسفر کے گھر پہنچا تو اسفر لاؤنج میں اپنی والدہ اور بچوں کے درمیان گھرا بیٹھا تھا۔ چائے کے برتن سامنے میز پر دھیرے تھے وہ اچانک علی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ارے تُو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں اسفر میں نہیں چاہتا کہ ایک اور علی تیرے گھر میں پلے مجھے بھابی سے بات کرنی ہے۔'' وہ پھولی سانسوں کے درمیان بولا۔

اسفر اس کی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''اچھا بیٹھ چائے تو پی لو، بلکہ کھانا کھا کر جانا،

ردا جب تک آ جائے گی۔'' کھانے کے دوران ہی ردا آ گئی علی کو دیکھ کر اُس کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

''ارے علی بھائی آپ بڑے دنوں بعد آئے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''بھابی آپ جانتی ہیں مسز رافع کون ہیں؟'' علی کے سوال پر ردا کے ساتھ اسفر نے بھی چونک کر علی کو دیکھا۔

''ایک نیک دل خاتون ہیں۔'' ردا نے اچھنبے سے علی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ہونہہ نیک دل، آپ نیک کس کو کہتی ہیں؟'' ایک اور سوال۔

''ظاہری بات ہے جو خدا کی بنائی مخلوق سے محبت کرے وہ نیک دل ہوتا ہے۔'' ردا کے جواب پر علی قہقہہ لگا کر ہنسا ایک دل جلاتی ہنسی جس میں بہت سارے کانچ ٹوٹنے کی سی آواز تھی۔

''آپ بہت معصوم ہیں آپ کچھ نہیں جانتیں، بہت سے حقائق بہت سے سچ آپ کی نظروں سے مخفی ہیں۔'' وہ سلگ کر بولا۔

''آپ جانتی ہیں میں کون ہوں؟''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی بھیا۔'' ردا لاچاری سے اُلجھ کر بولی۔

''میں علی ارسلان مسز رافع کے پہلے شوہر کا اکلوتا بیٹا ہوں۔'' ردا اور اسفر نے تڑپ کر اُسے دیکھا اسفر کو اُس کی زندگی کی ساری کہانی معلوم تھی مگر وہ مسز رافع کا بیٹا ہوسکتا ہے یہ تو اسفر کو گمان بھی نہیں تھا۔

پھر وہ سب بتاتا چلا گیا اپنی محرومیاں اپنی تشنہ آرزوئیں اپنی بے کلی، اپنی ماں کا کردار اپنی ماں کی بے حسی، سب کچھ ہر بات وہ بہت دل شکستہ ہو رہا تھا۔

''بھابی جو عورت اچھی ماں نہیں بن سکی وہ نیک دل نہیں ہو سکتی۔''

''میری تمام حسرتیں آج تک میرے ساتھ ہی پروان چڑھتیں اگر اماں بی اور اسفر میری زندگی میں نہ ہوتے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اُٹھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

ردا نے اسفر اور اماں سے معافی مانگ لی تھی وہ سمجھ گئی تھی کہ عورت کا اصل مقام بہترین ماں اور اچھی تابعدار بیوی کا ہے۔ ورنہ تو وہ کچھ بھی نہیں اور ردا یہ بھی جان گئی تھی کہ اچھا عمل اچھا کام کسی مستحق کی مدد چھپ کر ہی کرنی چاہیے سارے زمانے کو بتا کر نہیں......''

صد شکر کہ اُس کے ذہن پر جو نمایاں ہونے کا خمار چھایا تھا وہ اُتر گیا اُس نے واپسی کا راستہ اپنا لیا ورنہ شاید بہت دیر ہو جاتی۔

ردا کچن میں لنچ کی تیاری کر رہی تھی آج وہ آلو گوشت بنا رہی تھی کیونکہ اسفر کو بہت پسند تھے۔ اماں بی کے لیے کھچڑی اور لائبہ کے لیے دودھ والی سویاں...... مسز رافع سے تعلق توڑنے کے بعد ردا کو احساس ہوا کہ وہ سیراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ گھر کا سکون، شوہر کی توجہ، بچوں کی قلقاریوں سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

ایک ماں اگر اپنے بچوں کی اچھی تربیت ہی کرلے تو وہ معاشرے کے اوپر بہت بڑا احسان کرتی ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اولاد کی اصل تربیت گاہ ماں کی گود ہے۔ اسفر کی گاڑی کا ہارن سن کر وہ مسکراتی ہوئی باہر نکلی دونوں نے ایک دوسرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

ردا نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے اُسے بہترین شوہر، پیارے بچے، سمجھدار اور ماں کی طرح محبت کرنے والی ساس عطا کیے ہیں۔

☆☆......☆☆

افسانہ

ڈاکٹر الماس روحی

قدریں

"آپ کا شکریہ غریب کے پاس ایک عزت ہوتی ہے چند وقتی آسائشوں کی خاطر عزت کی نیلامی کرنا درست نہیں۔ یہ بات ہمارے خاندانی وقار کے منافی ہوگی۔ ہمارے والد احمد حسین صاحب ایک گورنمنٹ ٹیچر تھے۔ انہوں نے ہمیں...

"آپا ابا نے ہمیں یہ تعلیم تو نہیں دی تھی کہ مشکل وقت میں صبر کا دامن چھوڑ دیں۔ ان روایتوں کو پامال کر دیں جن پر ہمارے ماں باپ جان دیتے تھے۔" اس نے بیساکھی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جیا میری بہن حقیقت سے آنکھیں ملاؤ، یہ خوابوں اور کتابوں کی باتیں چھوڑ دو۔ اماں ابا گزر چکے ہیں۔ وہ ہماری مشکلات نہیں دیکھ رہے۔ جن روایتوں پر وہ جان دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے انہیں دیا کیا؟ بھوک، افلاس، غربت اور ذلت انہوں نے ایک سسکتی ہوئی زندگی گزاری اور ہمیں بھی گزارنے پر مجبور کیا۔

ابا ساری زندگی ایک پرائمری اسکول ماسٹر ہی رہے۔ آمدنی کتنی کم تھی۔ کرایہ، بجلی، گیس اور پانی کے بل کے بعد راشن اتنا ڈال سکتے تھے کہ ہر مہینے آخر کے دن میں ہم بھوکے رہتے تھے۔ پاپڑ، پاپے اور چائے سے گزارہ کرنا کتنا مشکل تھا۔ مگر ہم پر انہیں رحم نہیں آتا تھا۔ وہ اُدھار کے قائل نہیں تھے۔

اماں کو کہیں کام کی کیا گھر بیٹھے سلائی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لوگ کیا کہیں گے بیوی کا کھاتا ہے۔ ابا کے خوف سے ہم بھی بس تماشا دیکھتے رہے۔ کیسی حسرتیں تھیں۔ ہمیں اسکول کالج جانے کی۔ سوائے ابتدائی تعلیم کے بعد ہم نے بی اے بھی گھر بیٹھے کیا۔

"زمانہ خراب ہے لڑکیوں کا باہر نکلنا مناسب نہیں۔" یہ کہہ کر ابا ہر قسم کے اخراجات سے بچ گئے۔ ہم اپنی ماں سے اپنی خواہشات کہتے رہے۔ اماں نے تو خاموشی اپنائی۔ اور چپکے سے ہمیں اکیلا چھوڑ گئیں۔ اماں کے مرتے ہی ابا کو بیماریوں نے آگھیرا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جو پیسہ ملا تھا وہ ابا کی بیماری میں صرف ہوگیا۔

چھوٹی! اب تو ہی بتا کیا ہے ہمارے پاس وہ چند ہزار روپے جو ابا کی بیماری سے بچے تھے، چالیسویں تک خرچ ہو چکے ہیں۔ رشتے دار جنہوں نے ابا، اماں کے جیتے جی ہمیں نہیں

پوچھا۔ وہ اب کیا پوچھیں گے؟"
بس چھوٹی! میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ میری
آواز اچھی ہے میں ریڈیو اسٹیشن جاؤں گی۔
کمپئرنگ یا نیوز کاسٹر کے لیے۔" فروا نے اخبار
میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن آپا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپا ابا
کہتے تھے زمانہ خراب ہے۔" ستارہ نے فروا کے
قریب آتے ہوئے گھبرا کر کہا۔
"نہیں چھوٹی تو پریشان مت ہو۔ خراب
اور اچھے ہم خود ہوتے ہیں۔ زمانہ خراب نہیں
ہوتا۔ تم دیکھ لینا ہمارے بھی بہت اچھے دن
آئیں گے۔"
"میں تمہارا علاج کرواؤں گی تمہیں پھر ان
بیساکھیوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کوئی چھوٹا
سا اپارٹمنٹ بک کرواؤں گی کرائے سے بھی
جان چھوٹے گی اور ایک گاڑی لوں گی تاکہ
بسوں میں دھکے نہ کھانے پڑیں۔" فروا نے
یقین سے اُسے دیکھا۔ تو چھوٹی چپ ہوگئی۔
"کاش ایسا ہو جیسے آپا سوچ رہی ہیں۔"
فروا کے والد مرحوم احمد حسین اپنے ماں

باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کے جو دور پرے کے رشتے دار تھے وہ سب انڈیا میں تھے۔ ہجرت کے بعد لالوکھیت کے علاقے غریب آباد میں مہاجروں کے لیے ایک الگ بستی بسی۔ جہاں احمد حسین صاحب اپنے والد کے ساتھ رہائش پذیر ہوئے۔ والدہ اور خالہ تو بلوے کی نظر ہوگئیں تھیں۔ خالہ صابراں کی ایک ہی بیٹی تھی جنہیں خالہ نے شہر یوپی میں بیاہ دیا تھا۔

پاکستان آنے کے کافی عرصے بعد احمد حسین صاحب کو اپنی خالہ زاد بہن زبیدہ آپا بہت یاد آئیں۔ انہوں یوپی کے پتے پر انہیں کئی خط لکھے۔ لیکن کوئی جواب نہ آسکا۔ احمد حسین صاحب انہیں اپنی شادی پر بلوانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ اس وقت اتنا آسان نہ تھا۔ آخر دو تو میں تقسیم کے تلخ تجربے سے گزری تھیں۔ دونوں کو ابھی سنبھلنے میں وقت درکار تھا۔ یہی وجہ تھی ہر جگہ ناکہ بندی تھی۔ یہی سوچ کر احمد حسین نے شادی کرلی۔

شادی کے چند ہی دنوں بعد احمد حسین کے والد فراست حسین کا انتقال ہوگیا۔ فراست حسین کے انتقال کی وجہ ہجرت کا غم تھا۔ اپنا مال متاع شریکِ حیات سب کچھ قربان کرکے وہ یہاں آئے تھے۔ کیسی ہستی بستی زندگی تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ وہ ہندو ملازم چھیدو جو بہت وفادار تھا کیسا اُداس تھا۔

''ہم ای کہت رہن ای جمین، گاؤ، ای حویلی چھوڑ جاوت ہو۔ ہم کا خیرو بتاوت رہن کی پاکستان ما بہوت بُرا حال ہوت۔ ہم ہاتھ جوڑت رہن تم کاہے کو جاوت ہویاں۔ تو ھار گھر بار کا کا ہوئے گا۔''

(ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ زمین، گائیں، حویلی چھوڑ جاتے ہو۔ ہمیں خیرو نے بتایا کہ پاکستان میں بہت بُرا حال ہوتا ہے۔ ہم ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں۔ تم کیوں جاتے ہو۔ یہاں تمہارے گھر بار کا کیا ہوگا۔'' چھیدو زار و قطار رونے لگا۔

''ہم مجبور ہیں چھیدو۔ ہندو مسلم فسادات نے سب کچھ تباہ کردیا ہے۔ اب بس ایک جان باقی ہے۔ اس کا بھی دھڑکا رہے گا۔'' فراست حسین نے اُداس لہجے میں کہا۔

''کا کہوت ہو۔ صاحب تو ھار خاطر تو ہم اپنی جان دیوت ہیں۔''

(کیا کہتے ہو صاحب تمہاری خاطر ہم اپنی جان دیتے ہیں) چھیدو نے فراست حسین کے پیر پکڑ لیے۔ فراست حسین اُسے بے بسی سے دیکھتے رہ گئے۔

ہجرت لاکھوں لوگوں کی طرح ان کی بھی مجبوری بن گئی اور وہ امن آشتی اور انصاف کے بہت خواب سجائے پاکستان آگئے۔ لیکن یہاں خوابوں کو تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کوشش کے باوجود وہ کلیم لینے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اساتذہ بھرتی کیے جانے لگے تو احمد حسین کو ایک پرائمری ماسٹر کی نوکری مل گئی۔ ساری زندگی احمد حسین نے اس نوکری پر اکتفا کیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ جس نے مستقل روزی کا وسیلہ پیدا کیا۔ اپنے علاوہ کسی کا محتاج انہیں نہیں رکھا۔ انہوں نے اپنے گھر میں انہی روایتوں کی پاسداری کی نامساعد اور مشکل حالات کو بھی صبر و تحمل سے گزارا اور اپنے بیوی بچوں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔

ہجرت کے بعد تلخ حالاتِ زندگی نے انہیں زندگی ہی سے دور کردیا۔ بس وہ تو زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں اپنے مکان کی آرزو نہیں تھی۔

زینب بیگم جب بھی اپنا مکان کرنے کا دبے لفظوں میں کہتیں تو احمد حسین اُداسی سے مسکرا دیتے۔

''زینب بیگم سب چیزیں فانی ہیں ہم سب کو کوچ کر جانا ہے۔ پھر یہ دو لے کر کیا کرنا؟ ارے آدھا پاکستان کرائے کے مکانوں میں رہتا ہے ہم آپ رہ رہے ہیں تو کیا ہوا؟'' زینب بیگم خاموش ہو جاتیں۔

فردا اور جیہ دونوں اکیس بائیس برس کی ہو چکی تھیں۔ زینب بیگم کو تو ان کی بہت فکر تھی احمد حسین کی طرح زینب بیگم کا گھرانہ بھی ہندوستان کے شہر دلی سے یہاں ہجرت کر کے آیا تھا۔ دو بھائی اور انہیں اماں ساتھ لانے میں کامیاب ہو سکیں تھیں۔ ابا کے ایک بھائی اور دو بہنیں بچھڑ گئے تھے۔ انہیں بہت تلاش کیا۔ لیکن وہ نہ مل سکے۔

زینب بیگم کے دونوں بھائی کارخندار تھے۔ اپنا کاروبار کیا قدرت نے جہاں انہیں دولت سے نوازا۔ وہاں وہ اور ان کی اولادیں خود غرض ہو چکے تھے۔ انہیں اپنے غریب رشتے دار ایک آنکھ نہ بھاتے تھے یہی وجہ تھی زینب بیگم چاہنے کے باوجود بھی ان کے گھر نہیں گئیں۔ بھابی اور بچے ان کی غربت پر طنز کرتے تھے۔ جب تک ماں رہی بحالتِ مجبوری زینب بیگم کا میکہ جانا رہا۔ مگر ماں کے مرجانے کے بعد اب میکہ نہ رہا۔ جہاں محبتیں اور عزتیں نہ ملے وہاں پیر نہیں اُٹھتے۔ زینب بیگم اور ان کی دونوں بیٹیاں گھر میں ہی رہتے کوئی عزیز رشتے دار نہ تھا۔ جو تھے وہ انہیں ملنے کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ اب بیٹیوں کے رشتے کیونکر ہوتے۔ سلائی، کڑھائی، گھر داری سب انہیں زینب بیگم نے سکھایا تھا۔ اور گھر بیٹھے انہیں تعلیم بھی دلوائی تھی۔ صورت شکل خدا نے دونوں کی خوب بنائی تھی۔ پھر بھی کسی نے دستک نہ دی۔ جب بھی زینب بیگم احمد حسین سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتیں۔ وہ پُر امید ہو کر کہتے۔

''زینب بیگم جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے تو ان کا جوڑ بھی کہیں نہ کہیں اُتارا ہوگا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن خود کوشش تو کرنی چاہیے۔'' زینب بیگم کے کہنے پر احمد حسین صاحب چراغ پا ہو جاتے تھے۔

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ بیٹیوں کا باپ ہو کر لوگوں سے کہتا پھروں مجھے رشتہ چاہیے۔ رشتہ دے دو ٹھیک ہے مجھ پر ایسا بھی ہوا ہے۔ ارد گرد سب کو پتہ ہے۔ احمد حسین کی دو بیٹیاں ہیں۔ اب اپنی زبان سے جتانا مجھے گوارا نہیں۔ میری شرافت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔''

زینب بیگم صدا کی خاموش اور خاموش رہنے لگیں۔ اور آخر اس دنیا سے بیٹیوں کو اپنے گھر کا ہوتا دیکھنے کی حسرت لیے رخصت ہو گئیں۔ فردا نے اپنی ماں کی خاموشی کا راز جان لیا تھا۔ اُسے ابا کے اصولوں سے نفرت تھی۔ ابا کس عزت کس اَنا کی بات کرتے ہیں۔ ان کی اسی انا کی وجہ سے جیا اپاہج رہی کاش اُسے پولیو کے قطرے پلا دیے جاتے۔ کاش اُسے فوراً ابا ڈاکٹر کے لے جاتے۔ آج جیا اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی۔ اُسے بیساکھیوں کا سہارا نہ لینا پڑتا۔ ابا کو ان کے اصولوں نے دیا ہی کیا۔ ایک بے نامی اور بس...... لیکن میں ضرور اس بے نامی سے نکلوں گی اور بہن کو نکالوں گی۔ اس نے بے خبر سوتی جیا کو دیکھا جس کے سرہانے بیساکھیاں رکھی تھیں۔

☆......☆......☆

اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اُسے ریڈیو کا رُخ کرنا پڑا۔ پروڈیوسر نوازش علی نے ریکارڈنگ روم سے نکلتے ہی اچانک اس کے کندھوں پر ہاتھ کی تھپکی دیتے ہوئے کہا تو وہ چونکی۔

"فروا احمد مبارک ہو بھئی سلیکشن ہو گیا۔ کیا آواز پائی ہے۔ آپ ہمارے ریڈیو کی بڑی ضرورت پوری کریں گی۔ اچھی ہوسٹ ہمارے پاس نہیں خوبصورت آواز کے ساتھ کیا لہجہ اور کیا تلفظ ہے آپ کا۔ واہ بھئی واہ مزہ آ گیا۔"

"شکریہ سر......!" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"سر اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔" تھوڑے توقف کے بعد اس نے پھر پوچھا۔ وہ جواب کی منتظر تھی۔ نوازش علی اُسے اپنے روم میں لے آئے۔

"کیا کرنا ہوگا۔ اب جو کچھ کرنا ہوگا ہمیں کرنا ہوگا۔" انہوں نے اُسے دلچسپی سے دیکھا۔

"جی سر......!" وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ ہم آپ سے خبریں پڑھوائیں گے۔ اور علمی ادبی پروگرام کی میزبان بنائیں گے۔"

"ہاں بھئی دو چائے بھیجو۔" نوازش علی نے اگلے ہی لمحے کاؤنٹر پر فون کر کے آرڈر دیا۔

"اچھا سر میں اجازت چاہوں گی۔" فروا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بھئی کمال کرتی ہو۔ بیٹھو دو کپ چائے پینے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔"

"دیکھیے بی بی آپ بننے جا رہی ہیں نیوز کاسٹر، ہوسٹ، یہ برقعہ اُتار دیا کریں۔ یہاں ایک دو خواتین اوڑھ پہن کر آتی ہیں۔ مگر ڈریس روم میں اُتار دیتی ہیں۔ ڈیوٹی روم میں آپ نے دیکھا کچھ تو دوپٹوں سے بے نیاز ہونا چاہتی ہیں۔ وہ توجہ حاصل کرنے کے لیے کرتی ہیں۔ خیر آپ کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں آپ تو پہلے ہی ہمیں متوجہ کر چکی ہیں۔ بس کل سے اس قید سے آزاد ہو کر پہلا خبرنامہ پڑھے گا۔ ٹھیک ہے۔"

"جی سر......!" فروا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ارے میری باتوں پر پریشان مت ہونا تھوڑا بے باک کرنے کے لیے بے باک گفتگو کرنا پڑتی ہے تاکہ اعتماد آئے یہ ریڈیو ہے اور ٹی وی کا تو باقاعدہ اسکرین ٹیسٹ ہوتا ہے۔ اسکرین ٹیسٹ کا مطلب سمجھتی ہو۔ خیر چھوڑو یہ تو قبل از وقت بات ہوگی۔ کل ذرا حلیہ درست کر کے آنا۔"

"لو چائے پیو۔" نوازش علی نے آنے والے لڑکے سے چائے کی ٹرے لیتے ہوئے کہا۔ فروا نے مجبوراً کپ لیا۔ اچانک پروڈیوسر ذوالفقار مرزا آ گئے اور ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور نوازش علی کے سامنے بیٹھ گئے۔

"لو بھئی چائے پیو اچھے موقع پر آئے۔" نوازش علی نے اپنا کپ ذوالفقار مرزا کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو یار چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی۔ تم سے منتھلی پروگرام کی پلاننگ کے سلسلے میں ڈسکشن کرنی تھی۔" ذوالفقار مرزا نے کپ تھامتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے تمہارے روم میں

آنے والا تھا۔ ان سے ملو، یہ ہماری نئی دریافت ہیں۔ فروا احمد حسین کیا آواز پائی ہے، نیو نیوز کاسٹر......'' فروا نے جھجک کر آداب کیا۔ ذوالفقار مرزا نے حیرت سے نوازش علی کو دیکھا۔

''کیا واقعی...... تمہیں یہ نیوز کاسٹر نہیں لگ رہی لیکن کل اپنے ہر انداز سے یہ نیوز کاسٹر لگے گی۔ کیوں فروا کل جیسا میں نے کہا۔ اس انداز سے آؤ گی۔''

''جی ضرور......'' فروا نے شرمندگی سے اٹھتے ہوئے کہا گھر جاتے ہوئے اسے خوشی تھی۔ آج چھوٹی کو ایک اچھی خبر سنائے گی کہ وہ نیوز کاسٹر بننے جا رہی ہے۔ پھر اُسے اُداسی کا غلبہ ہوا۔

''کاش اس کے پاس اچھے کپڑے ہوتے۔ کاش اس حلیہ میں وہ آڈیشن دینے نہ جاتی۔'' چھوٹی تخت پر بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ دروازے کی دستک پر اس نے جلدی سے بیساکھی پکڑیں۔ اور دروازہ کھولا۔

''چھوٹی کیسی ہو، کھانا کھالیا تھا۔'' اس نے اندر آتے ہوئے برقعے اتارا۔

''ہاں آپا کھالیا تھا۔ آپا کیا ہوا نوکری کا۔''

''کیا ہونا تھا تمہاری آپا کا آڈیشن کامیاب ہوا۔ کل سے ریڈیو جانا ہے۔ بارہ بجے ریڈیو سننا فروا احمد حسین خبریں پڑھیں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سچ آپا کل سے۔''

''ہاں ہاں کل اور سناؤ سارا دن کیا کیا کوئی کہانی لکھی۔''

''ہاں آپا میں نے ایک کہانی کا اسکرپٹ تیار کرلیا ہے۔ بچوں کی کہانیاں لکھتے ہوئے میں خود بچی بن جاتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے سارا دن بچپن میں گزرا۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ بچپن بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بڑی لگتی ہیں اب دیکھیں بچپن میں جب بھی ریڈیو سنتی تھی تو سوچتی تھی جن آوازوں کو میں سنتی ہوں جانے وہ کون سی دنیا میں رہتے ہیں اور اب اپنی بہن کی آواز سنوں گی جو میرے سامنے کھڑی ہے۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''تم خوش ہو جیا، میں نے تمہارے لیے بھی کچھ سوچا ہے لیکن ابھی نہیں بتاؤں گی وقت آنے پر۔'' فروا ہنستی ہوئی باورچی خانے میں گئی۔ اُسے بھوک لگی تھی۔ جیا نے کھچڑی بنا رکھی تھی۔

''جیا بہت بہادر ہے کبھی معذوری کو اس نے بہانہ نہ بنایا۔ ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پوری گھر ہستن ہے۔'' وہ یہ سوچ کر مسکرا دی۔ دوسرے روز وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ نوازش علی نے کہا تھا۔ نیوز کاسٹر کو نیوز کاسٹر نظر آنا چاہیے۔ اس نے بالوں کا جوڑا بنایا، لپ اسٹک کا ٹچ دے کر طائرانہ نظر آئینے پر ڈالی ہلکے آسمانی رنگ کے کرتے دوپٹے اور چوڑی دار پاجامے میں وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔

''آپا یہ جھمکے اور پہن لو۔ اچھے لگیں گے۔'' اس نے فروا کو سراہتے ہوئے کہا۔ اور جھمکے کانوں میں پہنانے لگی۔

''جلدی کرو چھوٹی مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اُس نے پرس سنبھالا اور باہر جانے لگی۔

''یہ کیا آپا برقعہ تو پہن لو۔'' جیا نے اُسے ٹوکا۔

''وہ جیا برقعہ ضروری نہیں ہے وہاں لوگوں کو اچھا نہیں لگتا۔''

''آپا ہمیں اپنے آپ کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ دوسروں کی نظر سے نہیں کم از کم سفر تک

کے لیے تو پہن لو۔ راستے میں اچھی بری نظر پڑے گی۔ بس اسٹاپ پر لڑکے آوازیں کسیں گے۔ انہیں کیا معلوم تم کس کام سے جا رہی ہو۔'' جیا کے کہنے پر فروا نے برقعہ اوڑھ لیا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو اپنی گاڑی لے لوں گی تو پھر برقعہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''ہاں ہاں تب ٹھیک رہے گا۔'' جیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ذوالفقار مرزا نے فروا احمد حسین کو خبریں پڑھتے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گئے۔

''کیا حسن ہے اس لڑکی نے اپنے آپ کو چھپا کر رکھا تھا۔'' نوازش علی ذوالفقار مرزا کو جانتے تھے۔

''ذوالفی یہ اور لڑکیوں سے مختلف ہے۔'' نوازش علی کی بات پر ذوالفقار مرزا نے قہقہہ لگایا اور آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''یار تمام لڑکیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔'' فروا نیوز پڑھ چکی تھی۔ جیسے نیوز روم سے باہر آئی۔ ذوالفقار مرزا نے اُسے شولڈر سے پکڑتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا۔ تھپکی دیتے ہوئے۔

''واہ فروا احمد حسین کیا پڑھتی ہے اور کیا دِکھتی ہے۔ دل چاہتا ہے تمہیں سنتے جاؤ اور دیکھتے جاؤ۔'' فروا حیرت زدہ تھی۔ ایک دم اُسے وحشت ہونے لگی اور وہ نوازش علی کو بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد نوازش علی نے اُسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ سہمی ہوئی بیٹھ گئی۔ نیوز پڑھنے کی خوشی کافور ہو چکی تھی۔ اُسے ذوالفقار مرزا کی حرکت نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''دیکھو فروا اس دنیا میں ایسے روز واقعات ہوتے ہیں یہ یہاں کا معمول ہے۔ اِسے تمہیں نظر انداز کرنا پڑے گا تب ہی تم ترقی کر سکو گی۔'' نوازش علی کی بات پر اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''میں سمجھتا ہوں، تم ایک شریف، تہذیب یافتہ لڑکی ہو۔ مگر تم ایک عورت ہو۔ وہ بھی اچھی شکل وصورت کی۔ تمہاری پذیرائی کرنے کے لیے کچھ تمہارے سامنے کہیں گے، سراہیں گے جیسے ذوالفی نے کہا اور کچھ زبان کے ساتھ نظروں سے، تو کچھ صرف نظروں سے کہیں گے۔ اب انداز سب کے الگ الگ ہوں گے۔ بازاری آدمی بازاری انداز میں سراہے گا۔ اور تعلیم یافتہ آدمی خوبصورت لفظیات کا سہارا لے کر اپنے جذبات کا اظہار کرے گا۔ لیکن تمہیں آگے جانا ہے۔ ہر صورت حال کو فیس کرو گی اور آگے بڑھو گی۔ ٹھیک ہے یہ آنسو صاف کرلو۔'' نوازش علی نے اُسے ٹشو پیپر دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ لو ہر روز کنٹریکٹ پر سائن کرنا مت بھولنا چیک اس سے ہی بنے گا۔'' انہوں نے فارم اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے دھڑکتے دل سے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیے۔ آج فروا کی آواز ریڈیو پر سُن کر جیا بہت خوش تھی۔ فروا واقعی بچپن سے تیز طرار اور کھلنڈری تھی اور کبھی میں اگر ''قینچی'' کہتی تھی۔ تو تنگ کر کہتی تھی۔

''ہاں ہاں ہم قینچی ہیں۔ تمہارے تو کان کتریں گے۔'' ٹھک، ٹھک، ٹھک دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک گئی۔

''آپا آئی ہوں گی۔'' اس نے خود سے کہا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک معمر سی خاتون کھڑی تھیں۔ سفید برقعہ ٹوپی والا ہاتھ میں پان دان، دوسرے ہاتھ میں کپڑے کا بٹوہ لٹکا تھا۔ ایک

چھوٹی سی صندوقچی اُن کے پاؤں کے پاس رکھی تھی۔

''ارے بیٹا یہ احمد حسین ہی کا گھر ہے ناں ہم بھارت سے آئے ہیں۔''

''جی ہاں یہ اُن ہی کا گھر ہے۔'' اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''بیٹا تم ہٹو ذرا راستہ دو تم نہیں پہچانو گی ہمیں احمد حسین کہاں ہیں میں اُس کی پھپھوری بہن ہوں۔'' وہ خاتون تخت پر جا کر بیٹھ گئیں۔

''اچھا آپ زبیدہ آپو ہیں، ابا آپ کا بہت ذکر کرتے تھے۔'' وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''بھائی ہے ناں ذکر کیوں نہیں کرے گا۔ ہم ساتھ کھیلے ہیں میں نے اُسے گود میں کھلایا تھا۔ کہاں ہیں احمد حسین گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔'' انہوں نے گھر کی ویرانی کو محسوس کیا۔

''آپو آپ کو آنے میں بہت دیر ہوگئی ایک سال پہلے اماں کا انتقال ہوا۔ چھ ماہ بعد ابا بھی چل بسے۔'' چھوٹی کے لہجے میں اُداسی تھی۔ آواز میں لرزش بھی ضبط سے اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

''کیا احمد حسین دنیا میں نہیں رہے کہہ دو بی بی یہ جھوٹ ہے ہائے احمد حسین' میرے بھائی تمہیں اتنی جلدی دنیا سے جانے کی کیا پڑی تھی۔ ارے انتظار تو کیا ہوتا مجھے تمہارے پاس ہی آنا تھا۔ میرا کون بچا تھا میکے میں، سب تو بلوے کی نظر ہوگئے۔ بس یہی سوچ کر جی کو اطمینان تھا کہ چلو میرا بھائی ہے۔ اللہ اُسے زندگی دے۔'' وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ دروازے کی دستک نے دونوں کو چونکا دیا۔

''جاؤ بی بی دیکھو کون ہے۔'' آپو نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ چھوٹی بیساکھی کے سہارے کھٹ کھٹ کرتی دروازہ کھولنے چلی گئی۔ آپو نے کمرے میں اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پلستر اور رنگ و روغن سے محروم دیواریں کھپریلوں کی بوسیدہ چھت، دیمک کھائی لکڑی کے کواڑ، جگہ جگہ سیمنٹ سے اکھڑا ٹوٹا پھوٹا فرش۔ اس پر ایک بوسیدہ سا صندوق، بہت پرانا تخت اور زنگ آلود ٹین کی الماری، دو لکڑی کی کرسیاں جن پر میلے کچیلے غلاف والی گدیاں رکھی تھیں اور ایک ٹوٹا ہوا پنکھا جس کی کھڑکھڑاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے چھوٹی نے بند کر دیا تھا۔ ٹمٹماتا ہوا بلب اور ایک اپاہج بیساکھیوں سے کھٹ کھٹ کرتی لڑکی تو یہ ہے احمد حسین کے گھر کی کُل کائنات۔'' زبیدہ آپو نے حیرت سے سوچا۔

''آداب آپو.....'' فروا نے جھکتے ہوئے کہا۔

''جیتی رہو، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلوں۔''

''چھوٹی آپو کو کھانا دیا۔'' اُس نے اپنا پرس تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں آپو تو ابھی پہنچی ہیں۔ آپا آپ ہاتھ منہ دھولیں میں کھانا لگاتی ہوں۔'' چھوٹی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ رات فروا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ آپو بے خبر سو رہی تھیں۔ ان کے خراٹے کمرے میں ساز بجا رہے تھے۔ دوسرے فروا کو ایک اور فکر لاحق ہوگئی تھی۔ اُسے چھوٹی کے ساتھ ساتھ اب آپو کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ آپو ہمیشہ کے لیے پاکستان آگئیں تھیں۔ انہوں نے کھانا کھاتے ہوئے بتایا۔

''اب کیا واپس جاؤں گی اور کس واسطے جاؤں اولاد میرے بہت چاہنے کے باد جود نہیں ہوئی۔ ایک شوہر کا دم تھا وہ بھی اللہ کو سدھارے،

مجھ کمزور بیوہ کو ان کے بھائیوں بھتیجوں نے نکال دیا۔ انہیں پتہ تھا اس بڑھیا کے پیچھے کوئی بولنے والا نہیں چار و ناچار مجھے پاکستان آنا پڑا۔ میرا ایک تنہا وجود ایک کھٹیا پر پڑا رہے گا۔ بی بی بوجھ میں نہ بنوں گی۔ کروشیے کی ٹوپیاں بنتی رہی ہوں۔ یہاں بھی بُن لوں گی۔'' انہوں نے بے بسی سے کہا۔

''ارے نہیں آپو آپ بس آرام سے رہیں چھوٹی کے ساتھ میں ہوں نا، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' زبیدہ آپو نے خوش ہوتے ہوئے فروا کو دعا دی۔

''جیتی رہو اللہ تمہیں بہت دے رکھ رکھ کر بھولو۔'' نوازش علی کا اچانک لاہور ریڈیو اسٹیشن تبادلہ ہوگیا۔ ذوالفقار مرزا پروگرام انچارج بن گئے۔ فروا کو نوازش علی کے تبادلے کی وجہ سے پریشانی ہوئی۔ کچھ بھی تھا۔ نوازش علی میں شرافت تھی نہ جانے کیوں ان کا ٹوکنا فروا کو بُرا نہ لگتا تھا۔ لیکن ذوالفقار مرزا کی آنکھوں میں وہ چمک تھی۔ جس کا سامنا کرتے ہوئے فروا پر گھبراہٹ طاری رہتی تھی۔ اس گھبراہٹ کو ذوالفقار مرزا محسوس کرتے تھے اور اُسے پریشان کرنے کے لیے فقرے کسنے اور جملے پھینکنے کا موقع سے نہیں چُوکتے تھے۔

''فروا احمد حسین آپ کا تلفظ درست ہونے کی خاصی گنجائش نکلتی ہے۔ آپ کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھا کریں۔ کچھ ہماری کچھ اپنی کہا اور سنا کریں۔ دل بھی ہلکا ہوگا اور زبان بھی درست ہوگی۔ کیا خیال ہے چائے ہو جائے۔''

''نہیں سر......! پلیز مجھے جانے دیں۔ مجھے ذرا جلدی گھر پہنچنا ہے۔'' اس نے پیچھا چھڑانا چاہا۔

''ارے ارے میں نے آپ کو پکڑا کب ہے جائیں جائیں شوق سے جائیں۔'' وہ جانے کے لیے اٹھنے لگی۔

''لیکن میری اطلاع کے مطابق آپ غیر شادی شدہ ہیں گھر میں کوئی خاص ذمہ داری نہیں۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اگر کوئی بہانہ تراش رہی ہیں تو اور بات ہے۔'' وہ گھبرا گئی۔

''نہیں سر ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''پھر ٹھیک ہے۔ آج آپ جا سکتی ہیں لیکن کل نہیں۔'' دوسرے دن ذوالفقار مرزا کے سامنے بچوں کے پروگرام 'کہانی گھر' کے لیے چھوٹی جیا کا تحریر کردہ اسکرپٹ رکھتے ہوئے فروا نے کہا۔

''سر میری بہن کو کہانی لکھنے کا بہت شوق ہے اکثر بچوں کے رسائل میں کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔'' ذوالفقار مرزا نے عینک لگاتے ہوئے کہا۔

''لائیں ذرا دیکھیں۔'' کچھ دیر خاموشی کے بعد انہوں نے فروا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی بہت دلچسپ تحریر ہے۔ اُسے تو آج ہی ہم اپنے پروگرام میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان سے کہیے گا کا وشِ قلم جاری رکھیں۔ ریڈیو ان کی تحریر کے معاوضے کا پابند رہے گا۔'' فروا اس خبر کو جلد از جلد جیا تک پہنچانا چاہتی تھی۔

''اچھا سر اجازت......'' اس نے اٹھتے ہوئے اجازت لی۔

''نہیں بالکل نہیں۔ کل کی بات بھول گئیں۔ آج بہانہ نہیں چلے گا۔ بیٹھیے مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' انہوں نے اسکرپٹ میز کی سائیڈ دراز میں رکھتے ہوئے کہا، چائے آچکی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےِ راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تھی۔ انہوں نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھا۔

''فروا بہت دنوں سے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

''جی سر......!''

''کبھی آپ نے کسی سے محبت کی ہے۔'' ذوالفقار مرزا کی بات سُن کر اس کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ چھلک گیا۔

''سوری سوری......!''

''ارے کوئی بات نہیں آپ میری بات کا جواب دیں۔''

''سر نہیں زندگی نے کبھی اتنی مہلت نہیں دی۔ ویسے بھی سُنا ہے محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔'' ذوالفقار مرزا مسکرانے لگے۔

''سوری میرا سوال غلط تھا۔ کیا آپ کو کسی سے محبت ہوئی ہے۔'' انہوں نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں جواب دے چکی ہوں سر!'' فروا کا ضرورت سے زیادہ محتاط رویہ ذوالفقار مرزا کو اس کی طرف کھینچ رہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد ذوالفقار مرزا نے کہا۔

''کہتے ہیں جس سے آپ کو محبت ہو جائے تو اُسے بتا دو اس لیے میں تو آپ کے سامنے آج اعترافِ محبت کر رہا ہوں۔ فروا مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ یہ جو تم اتنی اُداس رہتی ہو نہ رہا کرو زندگی بہت خوبصورت ہے اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ لیا کرو۔'' ٹیلی فون کی بیل بجی تو ذوالفقار مرزا پروگرام منیجر سے گفتگو کرنے لگے۔ وہ اشارتاً اجازت لے کر رخصت ہوگئی۔

آج اس کی تنخواہ ملی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے سب سے پہلے کرایہ، بجلی کے بل کے پیسے علیحدہ کیے اور بازار نکل گئی۔ کئی برس بعد اس نے چھوٹی اور اپنے لیے کپڑے خریدے۔ ایک سوٹ اپنی آپو کا خریدا کچھ بھی ہے ان کا وجود ڈھارس تھا۔ ورنہ سارا دن اُسے چھوٹی کی فکر لاحق رہتی تھی۔ کپڑوں کی خریداری کے بعد اس نے پنساری کی دکان کا رُخ کیا۔ اور سارا سامان خریدا۔ دالیں، چاول، بیسن، گھی، آٹا، مرچ، مصالحے کتنا مشکل تھا۔ سارا ہر ماہ سامان لانا اور گھر پہنچانا۔ ابا یہ کام کرتے تھے۔ ان کے کام کی اہمیت اُسے اور اماں کو نظر نہیں آتی تھی۔ مگر آج اُسے احساس ہو رہا تھا۔ ابا آپ کتنا اہم کام کرتے تھے۔ وہ ساز و سامان سے لدی گھر پہنچی کپڑے چھوٹی اور آپو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ رات کو جب فروا آرام کرنے کے لیے بیٹھی تو تھکن کے احساس کے ساتھ کسی کے کہے جملے اُسے یاد آ گئے۔

''فروا مجھے تم سے محبت ہے۔'' ذوالفقار مرزا کے اظہارِ محبت نے خود بخود فروا کو اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ ذوالفقار مرزا کے کمرے میں گھنٹوں بیٹھی رہتی تھی۔ ریکارڈنگ روم کے بعد ان کے ساتھ باہر لنچ کرنے چلی جاتی۔ اُسے ذوالفقار مرزا کے سنگ ہوٹلنگ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ رومانٹک ماحول کو دیکھتے ہوئے بالکل تنہا کونے والی سیٹ لینا پسند کرتے تھے۔ جہاں انہیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ ہلکے ہلکے مدھر گیتوں کے دوران ذوالفقار مرزا اُسے چھونے اور محسوس کرنے کی خواہش کا بارہا ذکر کرتے اور وہ چھوئی موئی بنی سُنتی رہتی تھی۔ جی یہ چاہتا تھا کہ ذوالفقار مرزا کہتے رہیں اور وہ ان کی شدتیں سنتی رہے۔ نہ جانے اُسے ان دنوں کیا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ

کو کسی اور ہی دنیا میں پاتی تھی۔ بیٹنے اور سنورنے کا جی چاہتا تھا۔ کتنے تحائف تھے۔ جو ذوالفقار مرزا نے اُسے دیے جن چیزوں کو وہ حسرت سے کبھی دیکھا کرتی تھی آج اس کی دسترس میں تھیں۔

''آپا اتنے مہنگے کپڑے اور قیمتی جیولری، پرفیوم کہاں سے لاتی ہو۔ تنخواہ میں تو گھر کے اخراجات نکل جائیں بہت ہوتا ہے۔'' جیا نے اسے تیار ہوتے غور سے دیکھا۔

''چھوٹی ایک تو تیری شک کی عادت نہیں جاتی۔ ارے بھئی تم کہانیاں لکھتی ہو نا اس معاوضے سے گھر کا خرچ پورا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ پھر اب میری تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے۔ دوسرے ریڈیو پر کچھ لوگوں سے میری دوستی ہوئی ہے۔ وہ عید اور سالگرہ پر تحفے دیتے ہیں۔'' جاتے ہوئے اس نے پرس اٹھایا۔

''اچھا یہ لو تمہاری اسٹوری اسکرپٹ کا معاوضہ ہے۔ یہ رقم تم رکھ لو۔ تمہارے کام آئے گی۔''

''چلو فروا آج ہم تمہیں ایک اور گفٹ دیتے ہیں۔''

''لیکن سر کہاں چلنا ہوگا؟''

''اب بھی سوال کی گنجائش ہے۔ فروا مجھ پر بھروسہ رکھو میں نے تم سے محبت کی ہے۔'' انہوں نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔

''سوری......!'' وہ شرمندہ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک خوبصورت لگژری اپارٹمنٹ میں کھڑی تھی۔ فرنشڈ تھا۔ فلیٹ کشادہ ہوا دار تھا۔ کیوں پسند آیا۔ انہوں نے خوش ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہ پسند آنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

''گڈ......! فروا میں اگر بادشاہ وقت ہوتا تو ایک اور تاج محل بنواتا۔ میری پہنچ بس یہی تک تھی۔ یہ چابی رکھ لو میری طرف سے ایک حقیر نذرانہ ہے۔''

''ارے یار جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم رہیں گے وہ دوسرے ابھی اپنی فیملی کے ساتھ آنا چاہو تو رہ سکتی ہو۔''

''سچ......!'' وہ خوش ہوگئی۔

''اچھا...... اب جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔ کچن میں سب سامان موجود ہے۔''

بہت رات ہو چکی تھی۔ فروا کی کوئی خبر نہیں تھی، جیا پریشان تھی۔

''ارے جیا بیٹا! فروا آ جائے گی آفس میں دیر ہوگئی ہوگی یا اس کی کوئی پارٹی ہوگی یا وہ خریداری کے لیے بازار نکل گئی ہوگی، ہوسکتا ہے کوئی سہیلی مل گئی ہو اس کے گھر چلی گئی ہو۔ تم کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہو۔'' جیا فروا کی سلامتی کے لیے زیر لب دعا مانگتی رہی نہ جانے کیوں اُسے اتنی فکر لاحق تھی۔

اُدھر فروا احمد حسین تکمیل محبت کی سرخوشی میں بے خبر سو رہی تھی۔ آسودگی اُسے اور خوبصورت بنا رہی تھی۔ ذوالفقار مرزا اپنے پہلو میں لیٹی فروا کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی اُس کی آنکھ کھلی اور وہ مسکرادی۔

''تم نے آج مجھے سرشار کر دیا۔'' وہ شرما گئی۔

☆......☆......☆

رات جب وہ گھر پہنچی تو جیا اور آپو بہت پریشان تھیں۔

''ارے بی بی کہاں رہ گئیں تھیں کافی دیر

ہوگئی۔ مغرب سے پہل پہل آجایا کرو۔ ہمیں تو ہول اٹھ رہی تھی۔"

"آپا ایسا کیا ہوا جو اتنی دیر لگادی۔" جیا نے تجسس سے پوچھا۔

"ارے چھوٹی کچھ نہیں بس وہ ریکارڈنگ تھی۔ اس کے بعد سب نے اچانک ڈنر کا پروگرام بنالیا۔ اس لیے دیر ہوگئی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

چند روز بعد فروا ریڈیو پر جاتے ہوئے جیا سے کہنے لگی۔

"چھوٹی! تم گھر ذرا صاف رکھنا میرے پاس مہمان آئیں گے۔"

"کون آپا کون آنا چاہتا ہے۔ اور کیوں آنا چاہتا ہے۔" جیا کے اس طرح پوچھنے پر فروا چڑ گئی۔

"ارے بھئی جب وہ آئیں گے تم خود دیکھ لینا دوسرے تم سے ملنا چاہتے ہیں تم اب ریڈیو کی مشہور رائٹر ہو معمولی بات تھوڑی ہے۔" فروا کے جانے کے بعد اُس نے گھر کی صفائی صبح ہی سے شروع کردی۔ تخت پر دوسری چادر نکال کر بچھائی۔

میز کرسی کو صاف کرنے لگی۔

"ارے بچی کیوں پریشان ہورہی ہے۔ گھر میں ہے ہی کیا جو تم صاف کروگی احمد حسین نے کہاں آسائشیں اور سہولتیں دیں۔"

"نہیں نہیں ایسی بات مت کریں۔ ابا سے جو ہوسکا انہوں نے ہمارے لیے کیا۔ ابا کہتے تھے خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ یہ چھوٹا سا کوارٹر ضرور ہے لیکن میرے ابا اور اماں کی یادیں اس گھر کے کونے کونے میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس نے اُداسی سے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

فروا اپنی سوچوں میں گھری بیٹھی تھی

"کیا بات ہے؟ کیوں خاموش بیٹھی ہو؟"

ذوالفقار مرزا نے اُس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کوئی بات نہیں بس ایسے ہی سوچ رہی تھی نہ جانے میری آپا اور جیا کا آپ سے مل کر کیا تاثر ہو۔"

"ارے پریشان مت ہو ان کے اچھے ہی تاثرات ہوں گے۔ مجھے آتا ہے ہر قسم کی خواتین کو متاثر کرنا۔" ذوالفقار مرزا نے شرارت سے کہا۔ تھوڑے توقف کے بعد ذوالفقار مرزا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"اور اگر وہ اچھا تاثر نہ دیں تو کیا تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دوگی۔" اس نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"یہ اب میرے بس میں کب رہا ہے۔ میں تو بہت پہلے سارے اختیار کھوچکی ہوں۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اور ذوالفقار مرزا اپنی فتح پر متبسم ہوئے۔ جیا اور آپو کو ذوالفقار مرزا عمر سے بہت بڑے لگے۔ آپو ایک زمانہ شناس خاتون تھیں۔ انہیں تو ذوالفقار مرزا کے چہرے پر عیاری کھل رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"تو آپ ہیں جیا احمد حسین بھئی آپ کیا لکھتی ہیں کہانی کو جس ڈگر پر آپ لے چلتی ہیں ذہن حیران رہ جاتا ہے۔ آپ کی تحریروں کو ہمارے سامعین بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ لیجیے آپ کی پچھلی تحریروں کا نذرانہ....." انہوں نے چند چیک اُسے دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ.....!" جیا کا لہجہ سپاٹ تھا۔ فروا

نے جیا کو چونک کر دیکھا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ سب کے لیے ایک آپشن ہے۔'' انہوں نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس ڈیفنس میں ایک فلیٹ ہے ویل فرنشڈ...... وہاں آپ تینوں رہ سکتی ہیں۔ میں نے فروا کو فلیٹ دکھایا ہے انہیں بہت پسند آیا...... کیوں فروا......؟'' انہوں نے فروا کی رائے اپنی تائید میں چاہی۔

''ہاں بہت خوبصورت ہے بالکل خوابوں کی طرح۔'' فروا نے مسکراتے ہوئے شرما کر کہا۔

''پھر کیا خیال ہے فروا کے ساتھ آپ دونوں بھی شفٹ ہو جائیں۔'' انہوں نے جیا اور آپو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ آپو تو ہکا بکا دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کا شکریہ غریب کے پاس ایک عزت ہوتی ہے چند وقتی آسائشوں کی خاطر عزت کی نیلامی کرنا درست نہیں۔ یہ بات ہمارے خاندانی وقار کے منافی ہوگی۔ ہمارے والد احمد حسین صاحب ایک گورنمنٹ ٹیچر تھے۔ انہوں نے ہمیں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کی تربیت دی ہے۔ جس گھر کا کرایہ ہم نہیں دے سکتے اس گھر کے خواب کیوں دیکھیں؟''

''ارے کرایہ کیوں بھئی میں آپ کی بہن کو گفٹ کر رہا ہوں۔'' ذوالفقار مرزا ایک اپاہج لڑکی کا اعتماد دیکھ کر حیران تھے۔

آپ کس حیثیت، کس رشتے سے اتنا مہنگا تحفہ دے رہے ہیں۔ ہماری حیثیت نہیں اتنے بڑے تحفے لینے کی۔'' جیا نے ناگواری سے کہا۔

''زولفی آپ چائے لیجیے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' فروا نے بات کا رُخ موڑنا چاہا۔

''محترمہ آپ ضرورت سے زیادہ حساس ہیں حساس ہونا اچھی بات ہے لیکن حساسیت بہت بُری ہوتی ہے انسان محرومی میں رہنا پسند کرتے ہوئے نعمتوں کو ٹھکراتا چلا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میرا آپ کی بہن سے خاص دوستی کا رشتہ ہے۔

میں پروڈیوسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زمیندار کا بیٹا ہوں۔ میری اپنی زمینیں ہیں۔ یہ تو ایک معمولی سا تحفہ ہے جو میں نے فروا کی نذر کیا ہے۔'' ذوالفقار مرزا کے بدلتے تیور دیکھتے ہوئے آپو نے بات سنبھالی۔

''ارے بیٹا ناراض مت ہو بچی ہے یہ بتاؤ تم بارات کب لاؤ گے؟'' آپو ذوالفقار مرزا کی آمد کا جو مطلب سمجھ رہی تھیں وہ ان کے سوال ہی سے ظاہر تھا۔ ذوالفقار مرزا نے چونکتے ہوئے انہیں دیکھا۔ یہ ان کے لیے غیر متوقع سوال تھا۔

''دیکھیے جوڑے آسمان پر بنتے ہیں اگر نصیب میں ہوگا تو ضرور ہماری شادی ہو جائے گی۔''

''اچھا...... فروا مجھے ضروری کام ہے میں جا رہا ہوں۔'' فروا انہیں باہر چھوڑنے چلی گئی۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی جیا اور آپو خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

''چھوٹی کیا ضرورت پڑی تھی اتنا بولنے کی وہ میرے مہمان تھے۔ تم نے میرے مہمان کی بے عزتی کی ہے۔ ذرا نہیں خیال آیا تمہیں میرا۔''

''آپا میں نے کچھ غلط نہیں کہا تم اس شخص کی چالاکی نہیں سمجھ رہی ہو یہ تمہیں نہیں اپنائے گا۔ دیکھا نہیں شادی کے موضوع پر کیسے کترا نکلا۔'' جیا نے اُسے سمجھانا چاہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم نے یہ کہاں دیکھا ہے جسے آپ پسند کریں جس سے دوستی کریں اسی سے آپ کی شادی ہو۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں محبت کرتے ہیں۔ ابھی شادی تک بات نہیں پہنچی ہے۔'' فروا کی بات پر جیا حیران ہوئی۔

''آپا ایک مرد اور ایک عورت کی دوستی کیا رنگ لاتی ہے اس بات کو سمجھو۔ ابا اماں یہ سب تمہیں کیا کرنے کی اجازت دیتے ہمارے خاندان کی کچھ روایات ہیں۔''

''پلیز ماضی کو لے کر نہ بیٹھی رہا کرو ایسا لگتا ہے تمہارے جسم میں نانی دادی کی روح بسی ہے۔ وقت اور زمانہ بدل چکا ہے۔ بہر حال میں تم سے بحث نہیں کر رہی۔''

اس نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ اچانک قے آنے پر وہ غسل خانے کی طرف دوڑی۔ کچھ دیر بعد وہ ہلکان تخت پر لیٹی تھی۔ جیا خاموش بیٹھی اُسے تک رہی تھی۔

''بیٹا تم نے یہ کیا کیا، تمہیں معلوم ہے تم جس بچے کی ماں بننے جا رہی ہو۔ اگر اس نے شادی نہ کی تو اس بچے کا کیا ہوگا؟'' آپو نے اُسے آنے والے وقت کا احساس دلایا۔

''آپو پلیز خاموش ہو جائیں ضروری نہیں ہے مجھے کمزوری سے بھی چکر آسکتے ہیں۔ قے ہو سکتی ہے اُف خدایا میں کہاں پھنس گئی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا۔

دوسرے روز ڈاکٹر کی تصدیق کے بعد وہ ذوالفقار مرزا کے کمرے میں تھی۔

''آیئے میں احتشام ملک ہوں۔ ذوالفقار مرزا کا ٹرانسفر ہوگیا۔'' یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ اعتماد اور اعتبار کے جس حصار میں وہ تھی وہ حصار کانچ کی طرح چکنا چور ہو کر اُس کے قدموں میں گرا ہوا تھا۔ وہ بکھر چکی تھی ہر صبح اس آس پر ریڈیو کے لیے نکلتی کہ شاید ذوالفقار مرزا کو اس کی یاد آجائے اور وہ اس سے رابطہ کرے۔ اس روز بھی وہ ریڈیو کے لیے جا رہی تھی۔ جب آپو نے اس سے کہا۔

''بیٹا یہ محمد فضل کا بیٹا دین محمد ہے۔ اپنے بال بچوں کے ساتھ ہندوستان سے آیا ہے اُس کا یہاں کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اگر تم اُسے نوکری دلوا دو تو بڑا پُن کا کام ہوگا۔'' اس نے ہاتھ باندھے دبلے آدمی کو دیکھا۔

''دیدی دیا کرو سکھ پاؤ گی یہاں بہت پریشانی ہے۔ دوسری گلی میں، میں نے جھگی ڈالی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سات بچے ہیں بھوک سے تڑپتے ہیں۔''

''آپا آپ کوشش تو کرنا، شاید اس کا کام ہو جائے۔'' جیا کو اس پر ترس آرہا تھا۔ فروا نے اسٹیشن ماسٹر سے ذکر کیا۔

دین محمد کا نصیب تھا اُسے ریڈیو پر چپڑاسی کی نوکری مل گئی۔

وہ بہت خوش تھا۔ اکثر اپنے بیوی بچوں کو لیے جیا اور آپو کے پاس آجاتا تھا۔ جیا بچوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیتی دین محمد اور اس کی بیوی ہنس دیتے۔

''باجی یہاں کھانے کے لیے پورا ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے تعلیم پر کہاں سے پیسہ لگائیں۔'' آخر جیا نے فیصلہ کیا وہ ان بچوں کو پڑھائے گی۔ فروا اکثر جیا کو ان بچوں کے ساتھ مصروف دیکھتی دیکھتے ہی دیکھتے جیا کے پاس محلے کے اور بچے بھی آنے لگے۔

شام کے وقت گھر میں رونق رہتی۔ فروا

اپنے فلیٹ میں شفٹ ہوگئی۔ اس کی مجبوری تھی۔ پھر جس بچے کو دنیا میں آنا تھا۔ اس کا نہ آنا وقت کی سب سے بڑی مصلحت بنا۔ وہ اپنی محبت کی اس نشانی کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی تھی۔ مگر ذوالفقار مرزا کی بے وفائی نے اُسے صدمہ سے دوچار رکھا۔ یہ بھی وقتی احساس تھا وہ بہت جلد احتشام ملک سے دوستی میں سب کچھ بھول گئی۔

احتشام ملک نے اُسے اداکاری پر اُکسایا۔ فلموں میں آنے کے لیے اُسے صلاح دی۔ احتشام ملک کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے لاہور جا کر فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ احتشام ملک ہر مہینے لاہور جاتے اور اس کی کوٹھی پر قیام کرتے رہے۔

جہاں فلمی دنیا سے وابستہ بڑے بڑے موسیقار، شاعر، گائیک اور پروڈیوسر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس دنیا کی چکاچوند میں وہ اپنے وجود کو بھلا چکی تھی۔ پیسہ کمانا تھا، دولت کی طلب نے اُسے ہر اچھائی برائی کی تمیز ختم کر دی تھی۔ وہ تو بس اس ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ یہی وجہ ہے اُس کے قرب کا دعویدار مرد اُس سے محبت کرتا تھا مگر شک کے ساتھ، احتشام ملک نے جی بھرنے کے بعد اس سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اس کی ترجیحات بدل چکی تھیں۔

اُسے ہمدردی، محبت اور خلوص درکار تھا۔ جو اس کے مصنوعی ماحول میں اردگرد کہیں نہیں تھا۔ وہ روز پلاسٹک کی سی مسکراہٹ کے ساتھ پروڈیوسرز کے روم میں بیٹھی رہتی تھی چھوٹے موٹے کردار اُسے چاہیے تھے جانتی تھی گزرتے وقت نے چہرے پر جھریاں ظاہر کر دی تھیں۔

میک اپ کی دبیز تہہ اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتی۔ عمر تو ظاہر ہو کر رہتی ہے۔

پروڈیوسرز کو نئے چہرے چاہیے تھے دیکھتے ہی دیکھتے اُسے اب کسی بھی کردار کے لیے کاسٹ نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگ اُس سے کترا کر چلتے تھے۔

اپنی بے قدری کا احساس اس پر غالب آرہا تھا۔ صحت اور عمر کے ساتھ اس کی لڑائی جاری تھی۔ کون کس کو جیت رہا تھا۔ یہ بتانے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔

دیواریں تھیں لگژری زندگی نے اُسے صرف تنہائیاں دی تھیں۔ اُسے اپنی بہن کی شدت سے یاد آئی۔ ایک وہی تو رشتہ تھا جسے وہ پکار سکتی تھی۔ اس نے اس سمت واپسی کا سفر کیا جہاں سے وہ آئی تھی۔

سب کچھ بدل چکا تھا۔ تنگ گلیوں کی جگہ کشادہ سڑکیں تھیں کچے مکان اب بنگلے بن چکے تھے۔ اسکولوں نے کالج کا درجہ پا لیا تھا۔ معمولی ہوٹل فائیو اسٹار بنے اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ اس کا علاقہ جو بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

روشنیوں چ سے جگمگا رہا تھا۔ اس کے گھر کی جگہ 'کڈز حسین اکیڈمی' کے نام بچوں کا اسکول بنا ہوا تھا۔ اس نے حیرت سے دیکھا اور بیل دی یہ دین محمد تھا۔ جسے اس نے چپڑاسی ریڈیو پر لگایا تھا۔

''آپ کے چلے جانے کا جیا بہن کو بہت صدمہ تھا۔ انہوں نے اپنی الگ ہی دنیا بنالی تھی کہانیاں لکھتی رہیں میگزین و رسائل میں ان کی تحریریں آتی رہیں گھر بیٹھے جو معاوضہ ملتا تھا اس سے گزارا مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے بچوں کو

ٹیوشن پڑھانا شروع کیا۔ آپو کی دعائیں رنگ لائیں اور ٹیوشن سینٹر چل نکلا اس دوران آپو کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصہ وہ بہت تنہا رہیں میں اکثر ان کے پاس آتا تھا۔

انہوں نے میرے بیوی بچوں کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا جیا بہن کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ معذوری اور پھر تنہائی، ہم میاں بیوی سے جو ممکن ہوسکا ان کے لیے کیا اور انہوں نے میرے بچوں کی کفالت اور تربیت کی۔ اللہ نے ان کا بڑا ساتھ دیا۔

یہ اسکول اس علاقے کا بہترین اسکول ہے۔ ریڈیو کی نوکری میں نے چھوڑ دی تھی۔ اس اسکول کی دیکھ بھال جو کرنی تھی وہ اپنی ہر کامیابی پر آپ کو بہت یاد کرتی تھیں پھر وہ اچانک بیمار رہنے لگیں۔ میں نے آپ کو بہت تلاش کیا لاہور بھی گیا مگر میں آپ تک نہیں پہنچ سکا۔

اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ یہ خط آپ کے لیے انہوں نے مجھے دیا تھا۔ بڑا یقین تھا جی انہیں کہ آپ ضرور لوٹیں گی اور یہ سب کچھ آپ کا ہوگا۔

دین محمد کمرے سے جا چکا تھا۔ فردا پچھتاوے اور ندامت سے بے حال تھی آنسوؤں نے نظر کو دھندلا کر دیا تھا۔ اُس نے آنکھوں سے آنسو صاف کر کے تحریر پر نظر جمائی۔

"اپیا مجھے معلوم تھا تم ایک روز لوٹو گی لیکن لوٹنے میں تم نے ذرا دیر کر دی۔ زندگی بار بار تو نہیں ملتی اور نہ ہی مکمل ہوتی ہے۔ میں معذور تھی اکثر سوچتی تھی تم بہت ترقی کرو گی اور میں بہت پیچھے رہ جاؤں گی۔

تمہیں بنتے سنورتے دیکھتی۔ تو دل ہی دل میں تمہاری حفاظت کے لیے دعا مانگتی، بہن تھی ناں۔ پھر اماں ابا کا ساتھ نہ رہا۔ خود کو اماں سمجھنے لگی تم سے خوف آتا تھا۔ کہیں تم بے خوف نہ ہو جاؤ۔ تم نے جو رستہ اختیار کیا۔

ان رستوں میں خود کو گم کر دیا۔ یہ اچھا نہیں کیا اب تمہیں ضرور دکھ ہوگا۔ مجھے یہ دکھ تمہارے آغازِ سفر سے تھا۔ تمہیں وفاداری اور ریا کاری میں فرق کرنا نہیں آیا ورنہ قطعی چوٹ نہ کھاتیں۔ تمہیں جبراً روکنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی تم نے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھانا تھا سو اٹھا لیا۔

میں نے ابا کی تربیت کا پاس رکھا۔ خودداری، ایمانداری اور محنت کو زندگی کا شعار بنایا۔ قدرت مجھ پر مہربان ہوتی گئی۔ جس گھر کا ہم کرایہ دے کر رہتے تھے۔ وہ اپنا ہوا۔

اس روز میں بہت خوش تھی۔ جس روز میں نے اسے خریدا۔ آخر یہاں اماں ابا کی یادیں جو تھیں۔ میں اس گھر سے کیسے جا سکتی تھی۔ ایک تمہاری کمی تھی۔ اب تم آ گئی ہو۔ اب اس اسکول کو کالج تم بنانا، آپا علم کے رستے ہمیں عزت وقار دیتے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔ کیونکہ یہ بھی اب تمہیں خود کرنا ہے۔ تمہاری معذور بہن جیا......"

میری بہن تم اپاہج کہاں تھیں تمہاری خودداری اور انا نے تمہارے اردگرد روشنیاں کیے رکھیں انہی روشنیوں کو تم نے اس ادارے کی صورت یکجا کر دیا۔

کاش ان رستوں کی مجھے قدر ہوتی جس پر تم چلیں۔ اس نے روتے ہوئے سوچا اور کچھ توقف کے بعد ایک نئے عزم کے ساتھ دین محمد کو آواز دی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

"چلائیں مت..... آپ کو واقعی احساس ہی نہیں میرا میں یہاں آپ کے لئے ہوں لیکن بیوی کی حیثیت سے، لیکن جب سے شادی کر کے آئی ہوں مجھے آپ نے ایک خانساماں کی طرح سمجھ رکھا ہے، یہ بھی نہیں سوچ آتی کہ بیوی جو گھر میں اکیلی ہے، اس نے.....

"آج آپ پھر سے لیٹ آئے؟" ہما نے ظفر کے گھر آتے ہی منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"یار تم روز یہی سوال کرتی ہو اور کوئی کام نہیں کیا؟" ظفر نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور فریج سے پانی کی بوتل نکالنا چاہی۔

"آپ کو احساس ہے میں دن بھر اکیلی ہوتی ہوں گھر میں، روز آپ کا انتظار کرتی ہوں اور آپ روز لیٹ کیوں؟" ہما بے دلی سے کھانا لگانے لگی۔

"کھانا مت لگاؤ میں، میں کھا کر آیا ہوں" ظفر نے جیسے ہی کہا ہما نے غصے گلاس توڑ ڈالا۔

"ہما"

"چلائیں مت..... آپ کو واقعی احساس ہی نہیں میرا میں یہاں آپ کے لئے ہوں لیکن بیوی کی حیثیت سے، لیکن جب سے شادی کر کے آئی ہوں مجھے آپ نے ایک خانساماں کی طرح سمجھ رکھا ہے، یہ بھی نہیں سوچ آتی کہ بیوی جو گھر میں اکیلی ہے، اس نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں؟ اپنے کھانے کی فکر ہے میری نہیں؟" ہما ڈائننگ ٹیبل کی چیئر پر بیٹھی اور زار و قطار رونے لگی۔

"میرا سر کھانا بند کرو گی تم؟ بیوی ہو بیوی بن کر رہو۔ میں جب چاہے گھر آؤں، کھانا باہر کھاؤں، تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں" ظفر کو شاید واقعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔

"میں کمرے میں جا رہا ہوں، آ کر سر دبا دینا، تمہارے باتوں نے تو سر درد دے دیا ہے" تحکم انداز میں وہ اٹھا اور حقارت بھری نگاہ ہما پر ڈالی اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

ہما بے دلی سے اٹھی، برتن سمیٹے ظفر کی بے اعتنائی پر آنسو بہا رہی تھی، خود بخار میں گھری ہوئی تھی لیکن اپنی طبیعت کا رتی بھر احساس نہیں دلایا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن ہر دفعہ ایسا ہونا ہما کے غصے کو تجاوز کر گیا تھا وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی، وہ صرف ظفر کو اس کی غیر موجودگی کا احساس دلانا چاہتی تھی لیکن سومنہ سو باتیں۔

☆......☆......☆

"تمہارا موبائل اتنا مصروف کیوں رہتا ہے

جب بھی کوئی ضروری کام ہو فون کروں تو مصروف۔ کتنی باتیں کرتی ہو تم؟'' اختر نے اپنی بیوی ''ربیعہ'' سے باز پرس کی۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، ایسا کم ہی ہوا ہوگا۔ اور میں ہر وقت کہاں بات کرتی ہوں؟ سارا وقت کو کام کرتی رہتی ہوں وہ آپ کو کیوں نہیں دکھتا۔ پھر اگر میں کچھ دیر فون پر بات کر بھی لوں تو کیا ہے؟''

''کام ہی کرتی ہو؟ واقعی میں تو جب گھر آتا ہوں مجھے کوئی صفائی تو دکھتی نہیں، بچوں کا رونا دھونا الگ۔ پھر ایسا کون سا کام ہے جس کو تم جتا رہی ہو؟'' اختر نے غصے بھرے لہجے میں کہا

''میں اکیلی کتنا کام کروں؟ بچے ہیں، میں جتنا چیزوں کو سمیٹوں وہ اتنا ہی بکھیر دیتے ہیں۔ انسان ہوں میں بھی، ہر وقت تو یہ سب نہیں کیا جاتا کہ کچن کو بھی دیکھوں بچوں کو بھی، مجھے بھی آرام کی ضرورت ہو سکتی ہے'' ربیعہ نے بھی اختر کے انداز میں جواب دیا

''تو اب مجھ سے زبان لڑاؤ گی تم ہاں؟ چاہتی کیا

ہوا آخر؟''
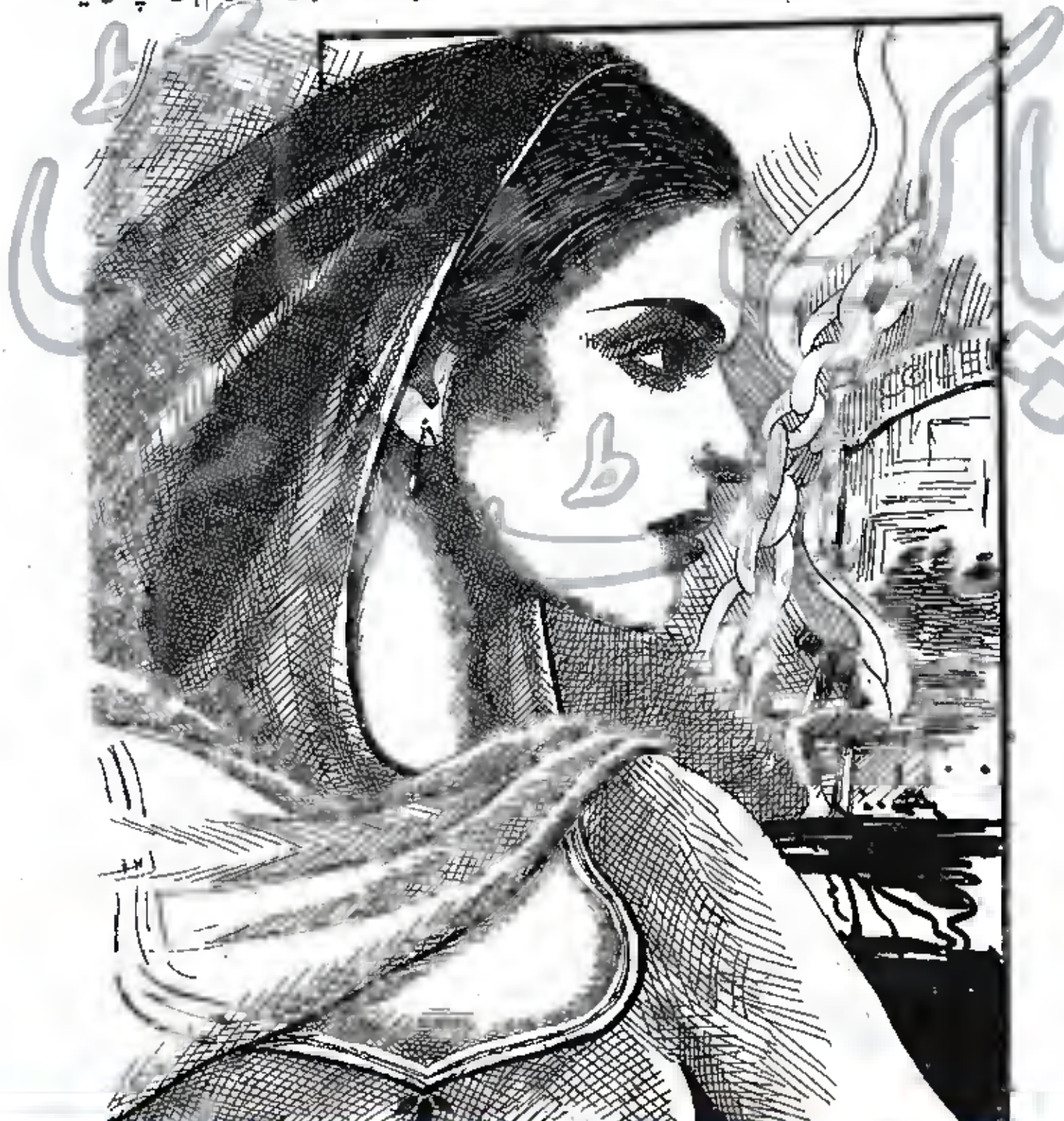
''میں کب سے کہہ رہی ہوں مجھے ایک کام والی رکھنے دیں آدھا کام ہو کرلے گھر کے آدھے میں تو کچھ سکون ملے گا'' ربیعہ نے اب منمنائی آواز میں بولا۔

''تم عورتوں کو بس یہی دکھتا ہے کہ کام والی رکھ دو وہ کام کرلے گی اور تم لوگ میم صاحب بن کر بس بیٹھی رہو اور حکم چلاتی رہو، میرے پاس فالتو پیسے نہیں تمہاری اس فضول عیاشی کے لیے۔ تم ہو ناں ان سب کاموں کے لئے تو پھر کام والی کی کیا ضرورت؟ پرانے زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوتا تھا لیکن یہاں تو میری بیوی کے نخرے ہیں!'' اختر نے بیوی کے رتبے پر اسے کام والی کا طعنہ دے دیا تھا۔

''اور ہاں، موبائل مجھے دے دو، اب جب میں گھر آیا کروں گا تب ہی موبائل ملے گا تمہیں'' ربیعہ اپنے نصف بہتر کو اتنے سالوں سے جتنا سمجھ سکی تھی شاید اختر نہیں سمجھا تھا۔ اس کے نزدیک گھر کی ذمے داری صرف بیوی کی تھی لیکن اس کے سکون کی ذمے داری خود شوہر کی نہیں!

☆......☆......☆

''بھئی یہ میٹھا تو بہت مزے کا بنا ہے ضرور تم نے بنایا ہوگا'' ثناء نے افشین کی تعریف کی۔ ان کے ہاں دعوت تھی۔ اصغر بیٹھک میں موجود تھے جب کہ ثناء اور دیگر خواتین لاؤنج میں۔

''تم لوگ خواہ مخواہ میری تعریف کرتے ہو جب کہ اچھے سے جانتے بھی ہو کہ میں میٹھے میں ایکسپرٹ نہیں ہوں'' افشین نے شرم گیں ہوتے ہوئے کہا

''اوہو یعنی یہ بھی بھائی صاحب کا کمال ہے؟'' علینہ نے شرارتی انداز میں کہا

''ہاں تو اور کیا۔ میں تھوڑی نہ کرتی ہوں یہ کام، انہی کو شوق ہے!'' افشین نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا

''یار تم واقعی خوش نصیب ہو، شوہر بھی ایسا ملا ہے ہر فن مولا!'' ثناء میٹھے سے خوب انصاف کر رہی تھی

''الحمدللہ۔ اصغر بہت اچھے ہیں، اتنا خیال رکھتے ہیں میرا، میرا ہر کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ واقعی اور کیا چاہیے؟؟'' اصغر کسی کام سے باہر آیا تھا اس نے اپنی بیوی کی یہ کہی ہوئی بات سنی اور مسکرا دیا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا اپنی بیوی کی خوشی بس..!

☆......☆......☆

''ارے وہ ظفر کی بیوی کا کیا ہوا؟'' دفتر میں ہم سب فارغ وقت میں ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول تھے کہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے ظفر کا ذکر ہمایوں نے چھالیہ بھرے منہ سے کیا۔

''ارے ہونا کیا تھا بھاگ گئی.........!'' ہمایوں کی بات کا جواب قدرے ناگواری سے اختر نے دیا اور ہاتھ میں جو پانی کا گلاس تھا ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''مجھے تو سمجھ نہیں آتا آخر ان بیویوں کے کام ہیں کیا جو ان سے جان چھڑاتی ہیں؟ بس جھاڑو پونچا کرنا اور کھانا پکانا وہ بھی کھڑے کھڑے اور کیا؟ چلو بس بچوں کو دیکھنا اور کیا اس کے باوجود کہتیں کہ ہم پر کام زیادہ ہوتا ہم بے آرام کا شکار ہیں کبھی مدد کروالیا کریں یعنی کے حد ہوگئی نان" اختر اور ہمایوں کے بعد یہ ہمارے شہزادے سلیم میاں نے بھی ٹکرا جوڑا وہ کیوں پیچھے رہتے......

''قسمے یار میں تو اپنی بیوی کو موبائل بھی اب اس لیئے نہیں دیتا ایک دفعہ دیا تھا'' اختر کی بات پر مجھ سمیت سب نے پوچھا ''کیوں''؟

''بس سارا دن باتیں کرنا کام بھی آدھے ادھورے چھوڑ دینا اور گھر نہیں لنڈا بازار لگتا تھا اور پھر وہی ہانک کہ کام والی لگوا دیں'' اختر نے اپنا دکھڑا

سنایا جو کہ غلط تھا لیکن ہائے رہے مرو ذات شیر تو بننا ہے ناں

"بس یار... سارا دن گھر میں مزے سے بیٹھی ہوتی ہیں یہ قوم! ٹی وی دیکھ لیا، بچوں کو دیکھ لیا اور کھانا بنا دیا تو اب احسان جتاتی ہیں۔ کیوں ہم ان کی بات کیوں کر سنیں؟" ہمایوں نے باقاعدہ میز پر مکا جڑتے ہوئے کہا لیکن پھر مسکین سی شکل بنالی۔

"بیویوں کو کیا پتا ہم یہاں کتنا جھک مارتے ،باس کی باتیں, لعن طعن سنتے پر یہ ساسوں کو بھی برداشت نہیں کرتیں' ہمایوں جو اپنی بیوی کو لے کر الگ ہو گیا تھا اماں کی یاد میں بیوی کو ہی کوس رہا تھا

"کھانا بھی اچھا نہیں بناتی بس کہہ دیتی کہ میں تھک جاتی ہوں مجھ سے کام نہیں ہوتا کم از کم کام والی ہی لگوا دو لو جب بیوی ہے تو کام والی کیوں لگواؤں خواہ مخواہ پیسے برباد کرنے کا شوق ہے" سلیم نے ہنکارتے ہوئے پھر سے بولا

ان سب کی باتیں سن کر مجھ سے رہا ہی نہیں گیا۔

"بات سنو تم سب.......... جب ہماری ماں ہمارے لیے یہ سب کام کرتی ہے تو کتنا ہم لوگ خوش ہوتے ہیں پھر جب وہ بیمار ہوتی ہیں تو ہمیں بھی فکر لگ جاتی ہے ناں؟ پر کیا ہے ناں، وہ خوش ہوتی ہے کہ بیٹے کے لیے کھانا پکایا کبھی جو اچھا نہیں بن پاتا ہو یا وہ بیمار ہو جاتیں تو تم لوگوں کو احساس ہوتا ہے ناں؟" سب ٹکٹکی باندھے اب مجھے دیکھنے لگے۔

"تو بھی آخر بیوی کے سکھ کا کیوں نہیں سوچتے ہو؟ اگر وہ کہہ رہی ہے بیمار ہے یا تھک گئی ہے یا اس سے زیادہ کام نہیں ہوتا تو اس کی مدد نہیں کر سکتے؟ ماں کے لیے کر سکتے ہو ناں تو یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تمہاری بیوی بھی تمہارے بچوں کی ماں ہے اور تمہاری نصف بہتر کم از کم کچھ تو ان کا بھی سوچ لیا کرو"

"جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کام خود کر سکتے تھے, حتیٰ کہ وہ اپنی ازواج کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے تو تم لوگ کیوں چاہتے ہو کہ بیوی بس غلام بن کر رہ جائے , کبھی تعریفی الفاظ بول کر اپنی بیوی کو خوش نہیں کر سکتے؟ اپنی خوشی کی پرواہ ہے اپنے کام کی تھکان کا احساس ہے تو کیوں اپنی بیویوں کا احساس نہیں؟ تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک تعریفی لفظ اسے خوش کر سکتا ہے، اسے احساس دلا سکتا ہے کہ شوہر کو اچھا لگا، فکر ہے، محنت وصول ہو جاتی ہے بے شک ایک لفظ..!"

میں یعنی اصغر بلا تکان بولتا رہا مجھے دکھ ہوا تھا کہ یہ کیسے شوہر ہیں جو شادی تو کر لیتے ہیں، ان کی بیویاں اپنے "میاؤں" کے لیے سب کچھ کر لیتی ہیں کہ بس وہ خوش ہو جائیں، پر مجال ہے کہ وہ واقعی خوش ہوں اور ایک اچھا لفظ بول کر اپنی بیوی کو خوش کر دیں؟ بیوی کو سمجھتے ہی نہیں ناں اور ہمارے معاشرے کا دوغلا پن ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے محبت کی خاطر خیر خواہی کر جائے تو اسے یہ دوغلا معاشرہ زن مرید کہہ دیتا ہے اور پرائی عورت کی خوشنودی کے لیے مردوں کا مقابلہ لگا ہوتا ہے۔

میں وہاں سے اٹھ گیا وہ سب سر جھکائے ہوئے تھے... میرے جانے کے بعد چے مگوئیاں تو ضرور ہوئی ہونگی پر مجھے پرواہ نہیں...... مجھے تو انتظار رہتا ہے میں کب گھر کے لیے نکلوں کیا کیا نہیں لے کر جاؤں اپنی زوجہ محترمہ کے لیے اور پتا ہے جب وہ بے شک ایک پھول دیکھ کر بھی خوش ہو جاتی ہے تو میرا دل کرتا ہے .... کہ وہ ایسے ہی کھلکھلاتی ہی رہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے؟ کیونکہ ہر شوہر برا نہیں ہوتا جتنی بیوی اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ اپنی نصف بہتر سے محبت کرتا ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

فرزانہ نگہت

روشن راستہ

''محبت تو تم اس سے بڑی جتاتے ہو۔ لیکن اس کا خیال رکھنا تمہیں آج تک نہیں آیا۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت تمہاری نانی کے گھر بھجوائے دیتی ہوں۔ تم اب وہیں رہا کرو، میں ہرگز ہرگز تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتی۔'' فیضان اسے دکھی نظروں سے...

ننھی کی چیخ سارہ کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور بے تابانہ باہر بھاگ اٹھی۔ جانے اس کی لخت جگر کو کیا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ یہ فیضان کم بخت جانے کہاں ہوگا۔

ذرا بھی بہن کا خیال نہیں رکھتا۔ ننھی اب چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے مالی بابا کو اسے گود میں اٹھائے اس کی ٹانگ سہلاتے اسے بہلاتے دیکھا۔

''کیا ہوا میری بچی کو؟'' اس نے جھپٹ کر ننھی کو مالی بابا سے لے لیا اور اسے سینے سے لگائے بے تحاشہ چومنے لگی۔

''بیگم صاحب، ننھی بٹیا سیڑھیاں اترنے کی کوشش کر رہی تھیں، گر گئیں۔'' مالی بابا نے بتایا۔

سارہ کو ایک دم ہی بے تحاشہ غصہ آ گیا۔

''اور یہ فیضان کا بچہ کہاں تھا؟ اس سے کیا اپنی بہن کا خیال نہیں رکھا گیا؟''

''فیضان میاں تو بیگم صاحب باہر پارک میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ وہ اگر گھر ہوتے تو ننھی بٹیا کا خیال رکھتے۔'' مالی بابا جو فیضان سے ہمدردی رکھتے تھے اس کی صفائی میں بولے۔ سارہ کو اور بھی پتنگے لگ گئے۔

''آپ بھی بابا ہر دم اس کی طرف داریاں کرتے رہتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی برے کام کیوں نہ کرے۔ جائیں اپنا کام کیجیے۔'' مالی بابا نے دکھ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور زمین پر رکھا آب پاش اٹھا کر سر جھکائے کیاریوں کو پانی دینے لگے۔

سارہ ننھی کو تھپکتی ہوئی اندر چلی آئی۔ وہ اب سسکیاں بھر رہی تھی۔ جانے اسے کہاں کہاں چوٹیں لگی تھیں۔

وہ سیڑھیاں کم بخت تھیں بھی تو بہت اونچی...... وہ اسے لیے صوفے پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ اس کی ٹانگیں اور بازو دبانے لگی۔ اسی وقت دروازے کا پردہ ہٹا اور فیضان اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں تازہ کھلے ہوئے رنگا

رنگ پھولوں کا گلدستہ تھا۔

''بھا...... ای......'' ننھی اسے دیکھتے ہی بازو پھیلائے اس کی طرف ہمکنے لگی۔

''دیکھو ننھی میں تمہارے لیے کتنے پیارے پھول لایا ہوں۔'' فیضان نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گلدستہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''سنبھولیا......!'' سارہ نے گلدستہ اس کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دیا۔ ساتھ ہی ایک زور کا چانٹا بھی اس کے رخسار پر جڑ دیا۔

''کہاں غارت ہو گئے تھے کمینے، تمہیں نہیں معلوم تھا کہ ننھی ابھی ٹھیک طرح سے چل نہیں سکتی۔ سیڑھیوں کی طرف چلی گئی تو اپنا سر یا ہڈیاں تڑوا لے گی۔

یہ سیڑھیوں سے گری ضرور ہے مگر شکر ہے محفوظ رہی ہے۔ تمہاری لاپروائی ضرور کسی دن اس کی جان لے کر رہے گی۔''

فیضان کی نیلی نیلی معصوم آنکھوں میں آنسو

بھر آئے۔ وہ اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے بڑی مظلومیت سے اسے دیکھنے لگا۔

''ننھی اس وقت اپنے کمرے میں سو رہی تھی ماما۔ اس لیے میں پارک میں کھیلنے چلا گیا۔'' وہ کانپتی سی آواز میں بولا۔

''ارے دفعان ہو یہاں سے......!'' سارہ نے اسے زور سے دھکا دیا۔

''محبت تو تم اس سے بڑی جتاتے ہو۔ لیکن اس کا خیال رکھنا تمہیں آج تک نہیں آیا۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت تمہاری نانی کے گھر بھجوائے دیتی ہوں۔

تم اب وہیں رہا کرو، میں ہرگز ہرگز تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتی۔'' فیضان اسے دکھی نظروں سے دیکھتا آنسو بہاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈیڑھ سالہ ننھی جو اپنے بھائی سے بے حد محبت رکھتی تھی اور ہر دم اس کے ساتھ لگے رہنے کی عادی تھی اسے یوں کمرے سے جاتا دیکھ کر مچل مچل کر رونے اور اسے پکارنے لگی۔ سارہ نے اسے بہلانے پھسلانے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس کا رونا چلانا اور بھا...... ای...... بھا...... ای کا الاپ بند نہ ہوا تو اس نے بھنا کر اسے ایک چانٹا جڑ دیا۔

''کم بخت! جانے اس سپولیے نے کیا جادو کر دیا کہ ہر دم اس کی دیوانی بنی رہتی ہے۔ بے وقوف! وہ تیرا سگا بھائی نہیں! سوتیلا ہے سوتیلا، اور سوتیلا ہر رشتہ سانپ اور بچھو ہوا کرتا ہے۔''

ننھی کے دماغ میں بھلا یہ منطق کیونکر سماتی؟ وہ اور بھی زور و شور سے رونے اور بھا...... ای، بھا...... ای کی گردان کرنے لگی۔ سارہ کا غصہ اور بھی بھڑکا۔

''چپ......!'' اس نے ننھی کو زور سے

''خبردار جو آواز نکالی۔'' ننھی بے تحاشہ ڈر گئی۔ اس کی آواز گلے میں گھٹ گئی۔ وہ بسورتے منہ کے ساتھ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''خبردار جو آواز نکالی......'' سارہ نے پھر اسے گھرکا۔ ننھی بے چاری ٹھٹھر کر رہ گئی۔

فیضان سے چھٹکارہ پانے کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کے لیے آج کا حادثہ ایک معقول بہانہ تھا۔

سارہ نے ملازمہ کی مدد سے فیضان کے کپڑے جوتے کتابیں اور دوسری چیزیں سوٹ کیس اور بیگوں میں ٹھونسیں اور ڈرائیور کے ہمراہ فیضان کو اس کی نانی کے ہاں بھجوا دیا۔ ننھی اس وقت سو چکی تھی۔ فیضان نے جاتے جاتے اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن سارہ نے اسے بری طرح سے جھڑک دیا تھا۔

جس پر وہ اپنے آنسو نہ روک سکا تھا۔ کار میں بیٹھ کر وہاں سے جاتے ہوئے بھی وہ کار کی کھڑکی سے اسے ملتجی نظروں سے دیکھتا رہا تھا کہ شاید وہ اسے جانے سے روک لے۔ لیکن وہ منہ پھیر کر اندر چلی آئی تھی۔

اس کے لاؤنج میں پہنچتے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کی امی تھیں۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے اسے بڑے بھائی شفیق کی بمعہ بیوی بچوں امارات سے متوقع آمد کی اطلاع دی۔ پھر پوچھا۔

''ہاں ننھی کیسی ہے؟ اور فیضان بیٹا......؟''

فیضان کے ذکر پر سارہ نے بے حد ناخوشگواری محسوس کی۔

''اس لڑکے کو میں نے اس کی نانی کے گھر

بھجوا دیا ہے۔ اس کی حرکتیں ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو سارہ؟'' امی کے لہجے سے لگتا تھا انہیں اس خبر نے شدید دکھ پہنچایا تھا۔

''اس کی آخر کوئی ایسی حرکتیں تھیں جو تم نے اس پر اتنا بڑا ظلم کر ڈالا۔'' سارہ بری طرح سے بھنا گئی۔ اس کی امی بھی اسی طرح ہی اس کے سوتیلے بیٹے کی جا بے جا حمایتیں اور طرف داریاں کیا کرتی تھیں۔

اس نے آج کے حادثے کو خوب حاشیئے چڑھا کر ان کے گوش گزار کیا اور حتمی لہجے میں بولی۔

''بس میں اب ہرگز اس سنپولیے کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی' عمر بھر اب رہے اپنی نانی کے گھر......!''

''اس میں فیضان بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے سارہ۔'' امی رسان سے بولیں۔

''تم نے تو اس پر ظلم کی حد کردی۔ وہ بے چارہ کتنی محبت کرتا ہے تم سے، ننھی پر تو وہ فدا ہے۔ ننھی بھی اس سے کتنا پیار کرتی ہے۔ وہ کیا اس کی جدائی برداشت کرلے گی۔

پھر عثمان وہ کیا سوچیں گے؟ وہ اب تک بڑے صبر و تحمل سے کام لیتے آرہے ہیں۔ کہیں شدید ردِ عمل کا مظاہرہ نہ کر بیٹھیں۔''

سارہ کچھ گڑبڑائی۔ پھر لاپرواہی سے بولی۔

''وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ انہیں اس لڑکے کی حرکتوں کا علم رہتا ہے۔''

''تم کچھ بھی کہہ لو سارہ...... فیضان اُن کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ان کی محبوب مرحومہ بیوی کی عزیز ترین نشانی...... تمہاری یہ حرکت وہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ میں تمہیں پہلے بھی سمجھاتی بجھاتی رہی ہوں۔ لیکن تم نے کبھی ہوش مندی سے کام نہ لیا۔ آج تو تم نے ظلم کی حد ہی کردی۔'' سارہ بری طرح سے جھنجلا گئی۔

''چھوڑیئے امی! کچھ نہیں ہوگا۔ فیضان کو ویسے بھی اپنی نانی کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ وہ تنہا رہتی ہیں ان کی تنہائی ذرا دور ہوجائے گی۔'' دوسری طرف سے امی کے گہری سانس لینے کی آواز سنائی دی۔

''تم سے کون بحث کرے، لیکن پھر بھی میں کہتی ہوں تم نے اتنے معصوم اور پیارے سے بن ماں کے بچے پر بے حد ظلم کیا۔

تمہارا رویہ اس کے ساتھ آج تک روایتی سوتیلی ماں جیسا ہی رہا ہے۔ ذرا سوچو۔ ننھی تو بیاہ کر اپنے گھر چلی جائے گی۔

تم اکیلے میاں بیوی کا ساتھ بھی کب تک؟ ایسے میں فیضان ہی تمہارا بڑا سہارا اور سائبان ثابت ہوگا۔'' سارہ چڑ گئی۔

''رہنے دیں امی یہ پرانی باتیں...... میں جانتی ہوں مجھے زندگی کیسے گزارنی ہے۔ مجھے اس فیضان کے سہارے یا سائبانی کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور لاؤنج سے باہر نکل آئی۔ اس کا موڈ خراب ہوچکا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔

پانچ بجنے کو آرہے تھے۔ عثمان آنے ہی والے تھے۔ وہ ان کے استقبال کے لیے تیار ہوکر باہر برآمدے میں آگئی۔ اسی وقت لاؤنج میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''جانے کون ہوگا اب؟'' اس نے ناگواری سے سوچا۔

لاؤنج میں پہنچ کر اس نے ریسیور کریڈل سے اٹھایا۔ دوسری طرف مسز حشمت تھیں، فیضان کی

نانی۔

''سارہ بیٹی...... فیضان سے آخر ایسا کون سا قصور سرزد ہو گیا جو تم نے اسے یہاں بھیج دیا؟ وہ جب سے یہاں آیا ہے روئے ہی جا رہا ہے، کچھ بتاتا بھی نہیں......'' ان کی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔

''بس آنٹی میں اس لڑکے سے تنگ آ چکی ہوں...... آج تو اس کی وجہ سے منھی مرتے مرتے بچی۔'' سارہ نے خوب مبالغہ آرائی کر کے آج کا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ اور حتمی لہجے میں بولی۔

''بس اب اسے رکھیے اپنے پاس عمر بھر...... میں اسے ہرگز اپنے گھر میں نہیں برداشت کر سکتی۔'' اس نے شعور میں مسز حشمت کے شفیق و بردبار چہرے پر بے پناہ رنج و ملال کی گھٹائیں پھیلتی دیکھیں۔

اسی وقت پورچ میں کار رکنے کی آواز سنائی دی۔ شاید عثمان آن پہنچے تھے۔ وہ فون رکھ کر کوریڈور میں چلی آئی۔ چند لمحوں بعد عثمان اندر داخل ہو گئے۔ اسے یوں بنے سنورے اپنے استقبال کے لیے کھڑے دیکھ کر ان کے چہرے پر چمکتی دمکتی سی مسکراہٹ کوندگئی۔

''ہیلو سارہ! کہو کیسا دن گزرا۔''

''بہت اچھا...... چلیے آپ اندر......'' اس نے بریف کیس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''فیضان کہاں ہے اور منھی، دونوں نظر نہیں آ رہے؟''

''آ جائیں گے، چلیے آپ فریش ہو کر لاؤنج میں آ جائیں، چائے تیار ہے۔'' عثمان نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن پھر کمرے کی طرف ہو لیے۔

جب وہ فریش ہو کر لاؤنج میں داخل ہوئے تو سارہ وہاں چائے کی ٹرالی سامنے رکھے ان کی منتظر تھی۔ ان کے صوفے پر بیٹھتے ہی وہ پیالیوں میں چائے بنانے لگی۔ عثمان کے چائے سے فارغ ہو جانے تک وہ انہیں ہرگز آج کا واقعہ نہ سنانا چاہتی تھی۔

''عجیب بات ہے بھئی، آج چائے پر ہم دو ہی ہیں۔ نہ فیضان ہے نہ منھی۔ کیا ان دونوں کو تم نے کہیں سیر کے لیے بھیجا ہوا ہے؟''

عثمان نے اپنی پلیٹ میں سموسہ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

''بچوں کو گھر سے باہر سیر کرنا سب سے زیادہ پسند ہے۔ ہاں آپ کے وہ دوست احمد صاحب کیا امریکہ سے واپس آ گئے؟'' سارہ نے بڑی خوبی سے ان کی توجہ دوسری طرف موڑ دی۔

''ابھی تو نہیں۔ شاید اگلے ہفتے تک آ جائیں۔

اس وقت وہ ٹوکیو میں ہیں، انہوں نے وہاں سے مجھے فون کیا تھا۔ ایک بزنس مین کی بھی کیا زندگی ہے۔ بہت کم گھر ٹکنا نصیب ہوتا ہے۔'' عثمان اسے احمد صاحب کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگے۔

انہی باتوں کے دوران وہ چائے وغیرہ سے فارغ ہو گئے۔ شام گہری ہونے لگی تھی۔ سارہ نے اُٹھ کر لاؤنج کی بتیاں روشن کیں۔ اسی وقت ملازمہ منھی کو لیے اندر چلی آئی۔

''پاپا......!'' منھی دوڑ کر عثمان سے لپٹ گئی۔

''میری گڑیا......!'' عثمان نے اسے لپٹا لیا۔

''آپ اکیلی ہی آئی ہو؟ بھائی کہاں ہیں؟'' منھی نے بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

پھر فیضان کو آوازیں دینے لگی۔

''بھا......ای! بھا......ای......!'' عثمان متحیر سے ہو گئے۔

''بھائی تو ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے ہیں ننھی...... آج کہاں غائب ہو گئے؟'' سارہ نے پہلو بدلا۔

''وہ کہیں غائب نہیں ہوا۔ بلکہ میں نے اسے اس کی نانی کے ہاں بھجوا دیا ہے۔'' عثمان چونکے۔

''نانی کے گھر؟ کیوں؟''

''اس کی حرکتیں، ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں عثمان...... آج تو اس کی وجہ سے ننھی مرتے مرتے بچی۔''

''کیسے؟......'' عثمان پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ناقابلِ فہم سے تاثرات بکھر گئے تھے۔

سارہ نے خوب بڑھا چڑھا کر انہیں اس حادثے کی تفصیلات سنائیں۔

''بس اب میں ہرگز اسے اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اب رہے عمر بھر اپنی نانی جان کے گھر، آپ اس سلسلے میں مجھے کوئی پند و نصائح نہ کیجیے۔'' عثمان کے چہرے پر شدید رنج و کرب کے تاثرات منجمد تھے۔

''سارہ......'' ان کی آواز جھرجھراتی ہوئی سی تھی۔

''یہ تم نے کیا کر دیا سارہ، مجھے تو اس میں فیضان کا کوئی قصور نہیں دکھائی دیتا۔ تم نے ناحق اسے اتنی بڑی سزا دے دی۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے سارہ۔ ننھی پر تو وہ فدا ہے۔ وہ بھی اپنے بھائی کو کتنا چاہتی ہے۔ دیکھو وہ کیسے اسے باہر ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

باہر برآمدے میں ننھی برابر بھا......ای......

بھا......ای کی آوازیں لگا رہی تھی۔ جس پر سارہ کو شدید چڑ کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا۔

''بے وقوف ہے، تھوڑی دیر میں اسے بھول جائے گی۔''

''وہ اپنے بھائی سے بے پناہ پیار کرتی ہے سارہ، جب تک وہ اسکول رہتا ہے وہ برابر اسے یاد کرتی رہتی ہے۔

نہ اپنے کھلونوں سے کھیلتی ہے نہ گھر آنے والے بچوں کے ساتھ، کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں، پھر جب وہ آتا ہے تو اسے دیکھتے ہی کیسے پھول کی طرح کھل اٹھتی ہے۔ فیضان تو گویا اس کی زندگی بنا ہوا ہے۔ اب جب وہ اسے نہ پائے گی تو اس پر کیا گزرے گی؟ اس کا ننھا سا معصوم دل ٹوٹ جائے گا۔''

لمحہ بھر کے لیے سارہ نے اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کیا۔ پھر نخوت سے سر جھٹکا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ ننھی ابھی ناسمجھ اور معصوم ہے۔ اسے فیضان تھوڑے ہی عرصہ تک یاد آتا رہے گا پھر وہ اسے بھول جائے گی۔''

''لیکن فیضان......؟ اس کا تو خیال کرو۔ ننھی کی جدائی تو اسے مار ڈالے گی۔ وہ کتنا فدا ہے اپنی اس ننھی بہن پر...... یہ تم بھی بخوبی جانتی ہو۔''

سارہ نے متنفرانہ ہاتھ جھٹکا۔

''کچھ نہیں ہوگا عثمان...... نانی کے گھر اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے اس کے ماموؤں اور خالاؤں کے بچے ہیں ان میں مگن ہو کر وہ جلد ہی ننھی کو بھلا دے گا۔''

''تم کچھ بھی کہہ لو فیضان ایسا نہیں۔ وہ ہرگز اپنی بہن کو نہیں بھول سکتا۔

ننھی بھی اسے بھلا نہ پائے گی۔ تمہارا یہ ظلم ان معصوم بچوں پر کیا قیامت ڈھائے گا سارہ، تم

نے یہ تو سوچ لینا تھا......"

باہر ننھی کے فیضان کو پکارنے کی آواز میں اب رونے کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ عثمان نے دکھی نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا۔

"وہ فیضان کو یاد کرکے رورہی ہے وہ بھی شاید اس کی یاد میں اسی طرح رورہا ہوگا۔" اسی وقت ننھی اونچی آواز میں روتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔

"پاپا، بھا...... ای......" عثمان نے آگے بڑھ کر اسے گود میں لے لیا۔

"آجائیں گے بیٹے...... آپ روئیں نہیں، وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔" وہ اسے تھپکتے ہوئے تسلیاں دلانے لگے۔

لیکن لگتا تھا ننھی کو ان کی باتوں کا یقین نہ آرہا تھا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے برابر فیضان کو پکارے جارہی تھی۔ عثمان نے شاکی نظروں سے سارہ کو دیکھا۔

"فیضان جب اسکول میں ہوتا ہے تو یہ اسے ایسا نہیں محسوس کرتی۔ لیکن اس کے اس طرح غائب ہوجانے کو یہ کیسا محسوس کررہی ہے۔ شاید یہ بخوبی سمجھ رہی ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔"

سارہ نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عثمان نے ریسیور اٹھایا۔

السلام علیکم! میں عثمان ترمذی بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے جانے کیا کہا جانے لگا کہ ان کے چہرے پر دکھ، اضطراب اور تشویش کے سائے بکھرتے چلے گئے۔ سارہ کے انداز کے مطابق دوسری طرف مسز حشمت ہی ہوسکتی تھیں۔

"ٹھیک ہے چچی...... میں ننھی کو فیضان سے ملانے لارہا ہوں۔

وہ بھی اس کی یاد میں رو رو کر ہلکان ہورہی ہے۔" عثمان نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور صوفے پر سے اٹھ گئے۔

"آؤ ننھی بھائی سے ملنے چلیں۔" انہوں نے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام لیا۔ ننھی کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر ایک دم ہی گلاب کھل گئے۔

"بھا...... ای......!" اس کی چہکار میں بے پناہ خوشی، اشتیاق، وارفتگی اور بچپن کے معصوم پیار کا ایسا رنگ تھا کہ لمحہ بھر کے لیے سارہ کو اپنا دل پگھلتا ہوا سا محسوس ہوا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے سفاکی اور کٹھورپن اپنی جگہ واپس آگئے۔

"دیکھیے...... آپ اسے فیضان سے ملانے ضرور لے جائیں۔ لیکن فیضان کو ہرگز واپس نہ لائیں۔" اس کا لہجہ اٹل ہی تھا۔

"بے فکر رہو۔ فیضان اب کبھی اس گھر میں نہیں آئے گا۔" عثمان کے لہجے میں بے پناہ تلخی اور سختی گھلی ہوئی تھی۔ انہوں نے ننھی کو گود میں اٹھایا اور بغیر کچھ کہے پردہ ہٹا کر لاؤنج سے باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد سارہ نے کار کے جانے کی آواز سنی۔ اس نے متنفرانہ سر جھٹکا اور لاؤنج سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئی۔

☆......☆......☆

وہ چار بہنوں اور تین بھائیوں میں پانچویں نمبر پر تھی۔ اس کے والد سیٹھ افتخار احمد شہر کے معروف بزنس مین اور میدان سیاست میں بھی کچھ کمل دخل رکھتے تھے۔ اس کے تمام چھوٹے بڑے بہن بھائیوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ خود اس کی شادی اس لیے بروقت نہ ہوسکی تھی کہ ایک تو اسے غرورِ حسن تھا۔

دوسرے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق، اس

شوق کے پیچھے اس نے کئی اونچے درجے کی تعلیمی ڈگریاں حاصل کر لی تھیں۔ اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئی تھی۔ یوں تو اس کے سب بہن بھائی حسن و وجاہت میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ لیکن جو حسن وجمال، وقار و تمکنت اس کے حصے میں آئے تھے وہ ان میں نہیں تھے۔

اس سبب زمانۂ طالب علمی ہی سے اس کے لیے رشتوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ جنہیں وہ بڑی نخوت و حقارت سے مسترد کرتی رہی تھی۔ حالانکہ ان میں بہت سے رشتے اس کے لیے ہر لحاظ سے مناسب و موزوں تھے۔ اس وقت چونکہ وہ زیرِ تعلیم تھی اس کی عمر بھی کم تھی اس لیے اس کے گھر والوں کو اس کی اتنی فکر نہیں تھی۔ لیکن جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک اونچے عہدے پر فائز ہو گئی اور اس کی عمر بھی بڑھنے لگی تو گھر والوں کو اس کی فکر ستانے لگی۔

اس کا دماغ اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ عہدے کے سبب اتنا اونچا جا پہنچا تھا کہ اسے کوئی رشتہ پسند ہی نہ آ رہا تھا۔ گھر والے، ملنے جلنے والے، اس کی سہیلیاں سب اسے بہتیرا سمجھاتے بجھاتے رہتے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن جب اس کے بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے اور حسن و جمال کی تابانی رختِ سفر باندھنے لگی تو اسے ایک دم ہی شدید قسم کے احساسِ عدم تحفظ نے آن گھیرا۔ اپنے لیے کسی سہارے، سائبان کی ضرورت اسے شدت سے محسوس ہونے لگی۔

وہ ہر دم بے چین و مضطرب رہنے لگی۔ اس کے لیے رشتوں کی اب بھی کمی نہیں تھی۔ لیکن ان کی نوعیت اب بدل چکی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر، سنِ رسیدہ، دوسری تیسری شادی کے خواہش مندوں کے رشتے تھے۔ جن کی بیویاں یا تو مر چکی تھیں، یا وہ انہیں طلاق دے چکے تھے یا ان کی موجودگی میں نئی شادی رچانا چاہتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اب یہی راہ باقی رہ گئی تھی۔ موزوں ترین اور بہترین تمام رشتوں کے مواقع وہ غرورِ حسن و جوانی میں ضائع کر چکی تھی۔ اسے شادی پر آمادہ دیکھ کر اس کے گھر والوں نے دیر نہ کی اور فوراً ہی عثمان ترمذی سے اس کی شادی کر دی۔

عثمان ترمذی، سارہ کے والد کے مرحوم دوست سلیمان ترمذی کے بیٹے اور انہی کی مانند ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ ان کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔

ان کی بیوی انتقال کر چکی تھی جس سے ان کا ایک بیٹا فیضان تھا جو سات سال کا تھا۔ عثمان بے حد وجیہہ و شاندار پرسنالٹی کے مالک اور بہترین اخلاق و کردار کے حامل تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ گھر والوں کو سارہ کے لیے یہ رشتہ ہر لحاظ سے موزوں معلوم ہوا تھا۔

اس نے بھی عثمان کو پسند کیا تھا۔ فیضان پر البتہ وہ معترض ہوئی تھی لیکن گھر والوں کے سمجھانے بجھانے پر خاموش ہو رہی تھی۔

عثمان اس کے لیے واقعی ایک مثالی رفیقِ حیات ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے بھرپور محبت اور پیار دیا تھا۔ دنیا کی تمام خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ ان کے مزاج میں مسکان اور ٹھہراؤ تھا، ضبط و تحمل تھا۔

اس لیے وہ اس کے فیضان کی جانب سخت بلکہ ظالمانہ رویے پر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے اس سے سختی سے پیش آنے کی بجائے اسے نرمی سے سمجھاتے بجھاتے۔ اس کے دل میں اس بن ماں کے معصوم بچے کے لیے محبت و شفقت کے

جذبات جگانے کی کوشش کرتے۔ لیکن ان کی یہ کوششیں آج تک نقش بر آب ہی ثابت ہوتی چلی آرہی تھیں۔

سارہ کو فیضان سے شروع دن سے جو نفرت محسوس ہوئی تھی وہ ویسی کی ویسی ہی چلی آرہی تھی۔ بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا آرہا تھا۔ پھر جب اس کی گود میں ننھی آگئی تو اسے اپنے گھر میں فیضان کا وجود انتہائی گراں گزرنے لگا۔ وہ اب اسے ڈانٹنے جھڑکنے کے ساتھ ساتھ اس پر ہاتھ بھی چھوڑنے لگی تھی۔

لیکن فیضان کبھی اس کی شکایت عثمان یا کسی اور سے نہ کرتا تھا۔ وہ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ اس کا بے حد ادب و احترام کرتا تھا۔ اس کا ہر حکم مانتا تھا۔ ننھی پر تو وہ فدا تھا۔ اس کی ننھی سے بے پناہ محبت پر سب رشک کرتے تھے۔ بڑے ہوتے ہوتے ننھی بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے لگی تھی۔

ان بہن بھائی کی محبت واقعی مثالی تھی۔ لیکن سارہ تھی کہ اسے ان کی محبت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ ننھی کو ڈانٹ ڈپٹ کر، سختی سے کام لیتے، ڈراتے دھمکاتے فیضان سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن اسے ناکامی ہی ہوتی تھی۔ وہ 'بھا...... امی' کی دیوانی تھی۔

اپنی ناکامی کا احساس سارہ کی فیضان سے نفرت اور چڑ میں اضافہ ہی کرتا چلا جارہا تھا۔ اب وہ چاہنے لگی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس سے چھٹکارا پالے۔ فیضان کی نانی مسز حشمت کا گھر اسے اس مقصد کے لیے موزوں ترین دکھائی دیتا تھا۔

مسز حشمت بیوہ تھیں۔ لیکن اپنے شوہر کے گھر میں وہ اپنے بیٹوں سے الگ ایک پورشن میں رہتی تھیں۔ جہاں ان کی دیکھ بھال کے لیے دو ملازمائیں موجود تھیں۔ سارہ کے خیال میں فیضان کے ان کے پاس جاکر رہنے سے ان کی تنہائی دور ہو سکتی ہے۔

ساتھ ہی ان سے فیضان کو ماں جیسی محبت بھی مل سکتی تھی۔ جو وہ خود فیضان کو دینے کی ذرا بھی روادار نہ تھی۔

رات ہوتے ہوتے عثمان اور ننھی گھر آگئے۔ عثمان کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور تفکر کی پرچھائیں رقصاں تھیں۔

''فیضان کی حالت کچھ اچھی نہیں سارہ۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں بیمار ہی نہ پڑ جائے۔''

''چھوڑیے عثمان...... وقتی جذباتیت ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' سارہ نے ننھی کو اپنی گود میں لے لیا۔

''ماما...... بھا...... امی۔'' وہ بسوری۔ سارہ کو ایک دم ہی اس پر شدید غصہ آگیا۔

''چپ! ابھی تو تم اس سے مل کر آرہی ہو پھر بسورنے لگی ہو۔'' ننھی سہم گئی۔

عثمان دکھی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''فیضان تم سے بے حد محبت کرتا ہے سارہ۔ جب تک میں وہاں رہا ہوں وہ تمہیں یاد کرتا رہا ہے۔ وہ ماں کی محبت کا ترسا ہوا بچہ ہے۔ وہ بے چارہ بمشکل تین سال کا ہی تھا کہ اس کی ماں اس سے جدا ہوگئی تھی۔

اس کے بعد وہ اپنی خالاؤں اور ممانیوں میں ممتا تلاش کرتا رہا۔ بوڑھی نانی کے دامن میں پناہ لیتا رہا۔ پھر جب تم آئیں تو وہ بے پناہ خوش ہوگیا کہ اس کی امی آگئی ہیں۔ وہ اسے خوب پیار دیں گی۔ اس سے خوب محبت کریں گی۔ لیکن......'' عثمان نے رک کر گہری سانس لی۔

''ماں کی محبت شاید اس بے چارے کی

قسمت میں نہیں۔" سارہ نے اکتاہٹ سے گردن کو جھٹکا۔

"چھوڑیے عثمان..... شادی کے وقت کیا یہ مجھ سے لکھوایا گیا تھا کہ میں اس لڑکے کو ماں کا پیار دوں گی؟" اس کڑوے سے جواب پر عثمان اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

اپنے اکلوتے بیٹے سے انہیں بے پناہ پیار تھا۔ وہ ان کی محبوب مرحوم بیوی کی نشانی تھا۔ اس کی خاطر وہ شاید کبھی دوبارہ شادی نہ کرتے، لیکن وہ اب اپنے اتنے بڑے سے گھر میں تنہا تھے۔ پھر اپنی بزنس کی مصروفیات کے سبب انہیں اکثر بیرونِ ملک سفروں پر جانا پڑتا رہتا تھا۔

ان مواقع پر وہ فیضان کو اس کی نانی مسز حشمت کے پاس چھوڑ جاتے تھے۔ ورنہ وہ گھر میں ملازموں کے ساتھ تنہا ہوتا تھا۔ وہ ماں کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا اور ان سے اپنے لیے امی لانے پر اصرار کرتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ اسے بہلاوے دیتے رہتے تھے اور بڑی خوبی سے ٹال دیا کرتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بھی تنہائی اور اکیلا پن محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کے دل میں دوبارہ گھر بسا لینے کی خواہش سر اٹھانے لگی تھی۔

وہ اگر شادی کر لیتے تو ان کی تنہائی اور اکیلا پن دور ہو جاتا۔ فیضان کو بھی ماں کا پیار مل جاتا۔ یہی سوچ کر انہوں نے دوبارہ شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سارہ کو انہوں نے ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ اس کے حسن و جمال، پُروقار و پُر تمکنت انداز و اطوار نے انہیں اپنا متاثر کیا تھا کہ انہوں نے اسے اپنی شریکِ سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہیں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔ وہ ان کے مرحوم والد کے دوست سیٹھ افتخار احمد کی بیٹی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔ یوں سارہ سے ان کی شادی ہو گئی تھی۔ سارہ ان کے لیے واقعی بہترین رفیقہ حیات ثابت ہوئی تھی۔ اس نے ان کے کہنے پر ملازمت چھوڑ دی تھی اور اپنے آپ کو ان کی خدمت اور گھر کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ لیکن ان کی امیدوں اور توقعات کے بالکل برعکس وہ فیضان کے لیے روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی تھی۔ اس کی سرد مہری، بیگانگی اور درشت مزاجی نے اس کا ننھا سا دل توڑ دیا تھا۔

عثمان فطرتاً دھیمے مزاج اور ٹھنڈی طبیعت کے مالک تھے۔ انہیں سارہ کے فیضان کے ساتھ اس ظالمانہ رویے پر دکھ ہوتا تھا۔ لیکن وہ بے پناہ صبر و تحمل کی تصویر بنے رہتے۔ سمجھانے بجھانے نصائح و تنبیہات کا تو سارہ پر اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ آج تو حد ہو گئی تھی۔ سارہ نے بلاقصور و خطا فیضان کو گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ پھر بھی چپ تھے۔ ان کے دل میں دکھ و کرب کا طوفان برپا تھا۔ شدید طیش و برہمی کی تیز و تند لہریں ان کے وجود کو ہلائے دے رہی تھیں۔ برسوں کا اندر ہی اندر کھولتا ہوا لاوا پھٹ پڑنے کو بے تاب ہوا جا رہا تھا۔

لیکن وہ بے پناہ ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے چہرے مہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہ ہونے دے رہے تھے۔ پھر رات کو جب وہ بیڈ روم میں پہنچے تو انہوں نے سارہ سے صرف اتنا کہا۔

"منھی اب ہر شام کو فیضان سے ملنے جایا کرے گی۔" اور سارہ کو کم از کم اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اگلی شام عثمان کچھ جلد ہی گھر آ گئے۔ سارہ کو اس پر خاصی حیرت ہوئی۔

''آج شام کو سیٹھ عمر کے گھر پارٹی ہے۔ ان کا بیٹا حارث انگلینڈ سے آ چکا ہے۔ اس خوشی میں انہوں نے اپنے رشتہ داروں اور تمام ملنے جلنے والوں کو اس پارٹی میں مدعو کیا ہے۔ مجھے شمولیت کی دعوت دینے وہ خود میرے دفتر آئے تھے۔''

سیٹھ عمر عثمان کے مرحوم والد کے دوست تھے۔ جن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے حارث کو Adopt کر کے بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا اور انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ سارہ نے عثمان کی زبانی حارث کے بارے میں سب کچھ سن تو رکھا تھا لیکن اسے دیکھا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت انگلینڈ میں زیر تعلیم تھا۔ اسے اس کو دیکھنے کا اشتیاق بھی تھا اور دلچسپی بھی..... عثمان نے اس کے بارے میں اسے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں کہ اس میں اس کے متعلق تجسس پیدا ہو گیا تھا۔

''کب آیا حارث؟''

''ہفتہ بھر ہوا ہے۔ وہ اب باقاعدہ اپنے دفتر میں بیٹھتا ہے اور سیٹھ عمر کے کاروبار کو دیکھتا بھالتا ہے۔ سیٹھ عمر اس پر بے حد خوش ہیں۔ حارث نے بڑا تیز کاروباری دماغ پایا ہے۔''

''شاید حارث ہی سیٹھ صاحب کی تمام جائیداد کا وارث ہو گا۔ ان کے کوئی بہن بھائی یا قریبی رشتہ دار نہیں ہیں نا؟''

''ہاں..... لگتا تو یہی ہے۔''

☆......☆......☆

سیٹھ عمر کی بقعۂ نور بنی کوٹھی میں پارٹی کی رونقیں اپنے شباب پر پہنچی ہوئی تھیں۔ مدعوئین بڑی بھاری تعداد میں وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ سیٹھ عمر اور ان کی بیگم اور اپنے شناساؤں سے علیک سلیک اور احوال پرسی کے دوران سارہ کی نظریں برابر مہمانوں کے انبوہِ کثیر میں حارث کو کھوجتی رہیں۔ پھر جب اسے اس کو دیکھنے کا موقع ملا تو اسے تحیر و بے یقینی کا ایک شدید دھچکا سا لگا۔ وہ بالکل سیٹھ عمر کی دوسری تصویر تھا۔ صرف اس کا رنگ بے حد گورا اور بال سنہری مائل بھورے تھے۔ اس کا قد و قامت حتیٰ کے چلنے اور باتیں کرنے کا انداز بھی سیٹھ عمر جیسا تھا۔ آواز بھی حیرت ناک طور پر انہی کے جیسی تھی۔

''عثمان..... کیا حارث واقعی سیٹھ صاحب کا لے پالک بیٹا ہے؟'' جب وہ لان میں بچھی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے تو سارہ نے دھیمی آواز میں عثمان سے استفہام کیا۔

''ہاں کیوں؟''

''مجھے تو وہ ان کا حقیقی بیٹا معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے کیا نہیں دیکھا کہ ان میں اور حارث میں کتنی مشابہت ہے۔''

''یہ اتفاقی بات ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سیٹھ عمر کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ نہ ہی وہ کوئی ایسے آدمی ہیں کہ ان کی کوئی مشکوک اولاد ہو۔''

سارہ خاموش ہو رہی۔ لیکن اس کے دل کی خلش ویسی ہی برقرار رہی۔ اسے حارث ایک پُراسرار راز معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ موقع پا کر ضرور سیٹھ عمر کی بیگم سے اس کے بارے میں کھوج کرید کرے گی۔

پھر جب رات ہوتے ہوتے پارٹی کی رونقیں دم توڑنے لگیں اور مہمان رخصت ہونے لگے تو سیٹھ عمر نے عثمان کو روک لیا۔ وہ ان کے ساتھ کچھ اہم کاروباری امور پر تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد

وہ انہیں اپنے اسٹڈی روم میں لے گئے۔ بیگم عمر سارہ کو ساتھ لیے اندر لاؤنج میں چلی آئیں۔ وہ ادھیڑ عمر قدرے فربہ انداز پر وقار اور شائستہ اطوار خاتون تھیں جن کے چہرے پر ہر دم ایک نرم نرم سی مسکراہٹ رقصاں رہتی تھی۔ انہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں وہ خاصی حسین خاتون رہی ہوں گی۔

انہوں نے ملازمہ سے چائے لانے کو کہا اور سارہ کے قریب صوفے پر آ بیٹھیں۔

''جب تک وہ لوگ اپنی باتوں سے فارغ ہوں ہمارے درمیان چائے کا ایک اور دور چل جائے۔''

''اچھا خیال ہے......'' سارہ ان سے حارث کے بارے میں پوچھنے کے لیے بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن انہوں نے بیٹھتے ہی پارٹی کی باتیں چھیڑ دیں۔ جو بڑی شاندار رہی تھی اور بڑی آن بان سے اختتام کو پہنچی تھی۔ چائے کے دوران بھی ان کی یہی باتیں جاری تھیں۔ پھر جب وہ دونوں چائے سے فارغ ہولیں اور ملازمہ ٹرالی واپس لے گئی تو سارہ نے ان سے پوچھ ڈالا۔

''آنٹی...... حارث کیا واقعی آپ کا بیٹا ہے۔ اس کی رنگت گوری اور بال سنہرے سے ضرور ہیں لیکن ناک نقشہ سب سیٹھ صاحب جیسا ہے۔''

بیگم عمر کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ کچھ اضطراب کے تاثرات ابھرے لیکن وہ فوراً ہی انہیں چھپا گئیں۔

''وہم ہے تمہارا...... ان کے درمیان کوئی ایسی مشابہت نہیں ورنہ یہاں آئے لوگ ضرور اس بارے میں تجسس میں مبتلا ہو جاتے۔''

''نہیں آنٹی ایسی بات نہیں۔ حارث اور سیٹھ صاحب میں واقعی بے حد قریبی مشابہت ہے۔ دیکھیے آنٹی۔ آپ مجھ پر ہر طرح سے اعتماد کر سکتی ہیں۔ میں ہر طرح سے اس راز کی پاسداری کروں گی۔''

بیگم عمر نے مختلف حیلوں بہانوں سے اسے ٹالنا چاہا۔ لیکن جب سارہ کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو انہوں نے تھک ہار کر ایک گہری سانس لی۔

''یہ ایک راز ہی ہے بیٹی...... ایک بڑا اور گھناؤنا سا راز...... جسے میں نے آج تک افشاں نہیں کیا کہ یہ میرے شوہر کی عزت کا سوال تھا اور ان کے نیک نام خاندان کی عزت کا بھی...... میں بھی پہلے اس راز سے واقف نہیں تھی۔ لیکن جب میں اس سے واقف ہوئی تو باوجود یہ کہ میرے اعتماد کی دھجیاں اڑ چکی تھیں۔ شدید دکھ اور صدمے سے میں تقریباً مخبوط الحواس سی ہو چکی تھی میں نے اس راز کی پاسداری کا فیصلہ کر لیا اور اس پر سختی سے قائم رہی۔

''سیٹھ عمر میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ ہماری شادی پسند کی بھی تھی ارینجڈ بھی۔ شادی کے کئی سال گزرنے کے بعد جب ہماری کوئی اولاد نہ ہو سکی تو میں نے سیٹھ صاحب کے سامنے تجویز رکھی کہ یا تو ہم کوئی بچہ گود لے لیں یا سیٹھ صاحب دوسری شادی کر لیں۔ دوسری شادی کے لیے وہ قطعاً آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن بچہ گود لینے کی تجویز انہوں نے پسند کی اور کہا کہ ایک بچہ ان کی نظروں میں تھا۔ وہ جلد ہی اسے گھر لے آئیں گے۔ پھر جب میں نے اس بچے کو دیکھا تو تمہاری طرح میں بھی شدید حیرت کا شکار ہو گئی۔ اس کا رنگ بے حد گورا تھا جیسے کسی یورپی نسل کے بچے کا ہوتا ہے۔ بال بھی بھورے سنہرے تھے۔ لیکن چہرے کے نقوش و نگار بالکل سیٹھ صاحب جیسے تھے۔ میں

نے جب اس بارے میں سیٹھ صاحب سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے مجھ سے کچھ چھپا کر نہ رکھا اور مجھے صاف صاف سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنے کسی بزنس ٹور پر انگلینڈ گئے تھے۔ وہاں بے تکلف دوستوں کی ایک پارٹی میں ایک انگریز حسینہ ان سے آن ٹکرائی تھی۔ شراب اور شباب کے نشے میں وہ اس کے ساتھ ایسی حرکت کر بیٹھے تھے جس پر انہیں بعد میں انتہائی شرمندگی اور ندامت ہوئی تھی۔ اس لغزش کا نتیجہ حارث کی صورت میں نکلا تھا۔ جسے دیکھنے وہ اکثر انگلینڈ جاتے رہتے تھے۔ وہ بچہ اب پانچ چھ سال کا ہو چکا تھا۔ اس کی انگریز ماں اب اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ تاکہ خود شادی کر کے اپنا گھر بسا سکے۔ سیٹھ صاحب خود بھی حارث کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے خیال سے متذبذب اور ہچکچاہٹ میں مبتلا تھے۔

''سیٹھ صاحب کے اس اعترافِ جرم یا گناہ کی داستان نے مجھے جتنا دکھ اور صدمہ پہنچایا تھا سو پہنچایا۔ لیکن میں نے جذباتیت کی بجائے ہوش مندی سے کام لیا۔''

''پھر آپ نے کیا کیا؟ آپ نے سیٹھ صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ بچے کو گھر لے آئیں؟''

''ہاں میں نے یہ کیا...... سارہ بیٹی فرض کرو تمہارے پاس ایک بڑا قیمتی دوپٹہ موجود ہے۔ لیکن اس میں بدقسمتی سے ایک بدنما سا سوراخ بھی موجود ہے تو تم اس دوپٹے کا کیا کرو گی؟ تم یا تو اسے پھینک دو گی یا اسے رفو کر لو گی۔ میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا یعنی دوپٹے کو رفو کر لیا اور سیٹھ صاحب سے کہہ دیا کہ وہ اس بچے کو لے آئیں۔ ہم لوگوں میں اسے اپنا لے پالک بیٹا مشہور کر دیں گے۔ اور حقیقی بیٹے کی طرح اس کی پرورش کریں گے۔ اس پر سیٹھ صاحب بے پناہ خوش ہو گئے۔ وہ انگلینڈ جا کر حارث کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ہم نے اسے لوگوں میں اپنا لے پالک بیٹا مشہور کیا مگر حقیقی بیٹے کی طرح اس کی بڑے ناز و نعم سے پرورش کرنے لگے۔ سیٹھ صاحب تو اس کے حقیقی باپ تھے ہی۔ مجھ سے تو اسے ایسی محبت، پیار اور ممتا ملی کہ وہ جلد ہی اپنی انگریز ماں کو بھول گیا اور مجھے ہی اپنی حقیقی ماں سمجھنے لگا۔

سارہ کی آنکھوں کے سامنے سے سیاہ پردے ہٹتے جا رہے تھے۔ اس کے دل و دماغ پر چھائی تاریکیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب تک اندھیروں اور سیاہیوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اب ایک دم ہی روشنیوں میں نکل آئی تھی۔ ان روشنیوں میں اسے ایک سیدھا اور ہموار روشن راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ صراطِ مستقیم!

پھر جب وہ اور عثمان سیٹھ عمر اور ان کی بیگم سے رخصت ہو کر گھر جانے لگے تو گاڑی کے سڑک کا موڑ مڑتے ہی سارہ نے عثمان کے اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''گھر نہیں عثمان...... مسز حشمت کی طرف چلیے۔ ہم وہاں سے فیضان کو اپنے ساتھ گھر واپس لے آتے ہیں۔ وہ اب میرا بے حد پیارا بیٹا بن کر ہمارے ساتھ رہے گا۔''

عثمان کو تحیر و بے یقینی کا ایسا شدید دھچکا لگا کہ اسٹیرنگ پر ان کا ہاتھ بہک گیا۔ انہوں نے فوراً ہی گاڑی کو سنبھالا اور تشکرانہ نظریں آسمان کی طرف اٹھا دیں۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

☆☆......☆☆

بڑی تلاش اور چھان بین کے بعد آخر وہ دنیا کے گہرے سمندر سے ایک بیش قیمت اور آب دار موتی ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جوہی کی اُجلی اُجلی کلیوں جیسی نازک مہربانو جن کی بڑی بڑی سرمئی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے دکھائی دیتے اور سیاہ بال گھنگھور گھٹاؤں کو......

کھڑکی کی ریلنگ سے سر ٹکائے ہوئے مہربانو نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں دوپہر سے ہی سرمئی بادلوں کی چادر سی تنی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے راستے آنیوالی ہوا کے نم جھونکوں میں رچی مٹی کی سوندھی خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ بادل کسی اور پیاسی دھرتی کو سیراب کرکے اب یہاں برسنے کے لیے تلے کھڑے ہیں۔ وہ دیر تک کھڑی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھاتی رہیں مگر جب سوئی کی نوکوں جیسی مہین پھوار چہرہ بھگونے لگی تب وہ پردہ برابر کرکے وہاں سے پلٹ آئیں۔

سامنے بیڈ پر حیدر علی ہاتھ میں موٹی سی کتاب لیے ہوئے لیٹے تھے۔ بظاہر تو وہ مطالعہ میں مشغول تھے لیکن یہ بات صرف بانو جانتی تھیں کہ ان کی نظریں کتاب کے بجائے اس وقت سامنے والی دیوار پر گڑی ہوئی ہیں۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی آہستہ سے آکر ان کے قریب بیٹھ گئیں۔

''آؤ مہر تم کہاں تھیں۔'' حیدر علی نے چونکتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

''میں تو اس وقت سے ہی اس کمرے میں موجود ہوں جب آپ خیالوں کی دنیا میں کہیں دور پہنچے ہوئے تھے۔'' مہربانو نے دبی دبی چوٹ کی تو وہ سنبھل کر بولے۔

''میری دنیا تو تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہو جاتی ہے مہر تم اب اور نہ جانے کون سی دنیا کی بات کر رہی ہو۔'' حیدر علی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئیں۔ حیدر علی کو ان پر ترس آنے لگا۔ میری یہ خاموشی اور خود فراموشی مہر کے دل پر کتنی گراں گزر رہی ہے۔ وہ میری صورت پر کھوجتی نگاہیں ڈال کر دل کا بھید جاننا چاہتی ہے مگر میں اس کی آنکھوں میں مچلتے ہوئے سوالات کا جواب دے کر یہ تلخ حقیقت اس کو کیسے بتا سکتا ہوں کہ اب اس کی کوکھ سدا کے لیے ویران ہو چکی ہے۔ وہ میرے لیے کبھی بیٹا پیدا نہیں کر سکتی۔ اب ساری زندگی مجھے اسی طرح دشت تنہائی میں بھٹکتے ہوئے عمر کا باقی حصہ گزارنا پڑے گا۔ ان کے سینے میں درد کا طوفان مچل رہا تھا۔

☆......☆......☆

سیٹھ حیدر علی کو یہ دولت اپنے والد سے ملی تھی۔ سکندر علی نے ہجرت کے بعد جب پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو وادئ مہران کے اس چھوٹے سے شہر نے ان کے استقبال کے لیے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ ان دنوں یہ خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہر قسم کی جدید بنیادی

سہولتوں سے محروم تھا۔ نہ آسمان سے باتیں کرتی بلڈنگیں تھیں نہ جگمگاتے پُر رونق بازار تھے اور نہ بڑے بڑے ہوٹلز۔ لیکن اس کے باوجود ہر چہرے پر آسودگی اور طمانیت کی جھلک تھی۔ ان دنوں لوگوں کے دلوں میں کھوٹ کپٹ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ سب لوگ زبان اور قومیت سے بالاتر ہو کر ایک دوسرے کی مدد کرتے اور مصیبت میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

سکندر علی یہاں اپنے ایک عزیز کے بلانے پر آئے تھے اس لیے ان کو اجنبیت کا بھی کوئی احساس نہ تھا۔ بنیادی طور پر وہ تجارت پیشہ آدمی تھے یہاں آ کر بھی انہوں نے چھوٹے پیمانے پر جائیداد اور زمینوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دولت عزت اور شہرت حاصل کر لی۔ بڑے لوگوں میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ سکندر علی کی جان اپنے تینوں بچوں میں بستی تھی۔ بیوی تو بہت عرصہ پہلے ہی داغِ مفارقت دے کر اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں۔ بیٹیاں جوانی کی سرحد پر پہنچ گئی تھیں۔ بیٹا ابھی چھوٹا تھا اور ابتدائی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ تینوں بچوں کو آپس میں جوڑ کر رکھنے کے لیے سکندر علی نے جو حویلی تعمیر کرائی تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔

سنگ سرخ کی بنی ہوئی یہ خوبصورت عمارت جدید اور قدیم تہذیب کا سنگم تھی اس کی اندرونی سجاوٹ میں سندھ کی ثقافت کا رنگ جھلکتا تھا۔ بڑے سے لان میں طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے بکثرت درخت موجود تھے اور ہری ہری گھاس پر روئی کے گالوں جیسے خرگوش اچھلتے پھرتے ایک طرف بہت بڑے بڑے پنجرے میں دنیا بھر کے نایاب پرندے میٹھی بولیوں سے گھر سر پر اٹھائے رکھتے، حویلی کے پچھلے حصے میں کھجوروں کے جھنڈ کے قریب ملازمین کے رہائشی کوارٹرز موجود تھے۔ بیٹیوں کی شادی کے بعد بھی سکندر علی نے انہیں اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا تھا۔ وہ بھی اپنے شوہروں کے ساتھ حویلی ہی میں مقیم تھیں۔ اور اب باپ کی تمام تر توجہ حیدر علی پر مرکوز تھی وہ اُن کو پھولتا پھلتا دیکھنے کے شدید آرزومند تھے۔ لیکن انسان کی ہر تمنا کہاں پوری ہوتی ہے ابھی حیدر علی گریجویشن سے فارغ ہوئے تھے کہ سکندر علی کا اوپر سے بلاوا آ گیا اور وہ بیٹے کا سہرا دیکھنے کا ارمان دل میں لے کر سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

حویلی کی تمام رونقیں درہم برہم ہو گئیں اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ دلوں سے غم کی گرد چھٹنے لگی تو حیدر علی نے باپ کے کاروبار کو وسعت دینے کا ارادہ کر لیا۔ اس کوشش میں انہوں نے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات ہر وقت بس کاروباری داؤ پیچ میں اُلجھے رہتے۔

پھر ان کی محنت کا خدا نے ان کو صلہ بھی بہت اچھا دیا۔ بہت جلد وہ ترقی اور کامیابی کی منزلیں طے کر کے عزت اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچ گئے کچھ تعلیم اور دیانت داری کے ساتھ خوش مزاجی نے بھی بامِ عروج پر پہنچنے میں ان کا ساتھ دیا تھا اور کچھ قسمت بھی بھرپور ساتھ دینے پر تلی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی مختلف کمپنیوں کے حصے دار بن گئے۔ اپنی کاٹن مل کے علاوہ دوسری پروڈکٹ کمپنیوں میں بھی ان کا ساجھا تھا جائیداد تو سندھ سے کراچی تک پھیلی ہوئی تھی اور آموں کے باغات کا سلسلہ بھی کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اب دونوں بہنوں کے دل میں اپنے نیک سیرت وجیہہ و شکیل بھائی کا گھر بسنے کی تمنا کروٹیں لے رہی تھی۔

بڑی تلاش اور چھان بین کے بعد آخر وہ دنیا کے گہرے سمندر سے ایک بیش قیمت اور آب دار موتی ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جو ہی کی اُجلی اُجلی کلیوں جیسی نازک مہر بانو جن کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے دکھائی دیتے اور سیاہ بال گھنگھور گھٹاؤں کو شرماتے تھے حسن کے جلوے بکھیرتی سکندر ہاؤس میں آ گئیں۔ ان کی شادی اس زمانے کی یادگار شادی تھی جسے مدتوں تک لوگ فراموش نہ کر سکے تھے۔

مہر بانو کو پا کر حیدر علی کے چہرے اور آنکھوں میں ہمہ وقت خوشیاں رقصاں رہتیں جب وہ نین کٹوروں میں کاجل کی دھار سجا کر سیاہ لمبی سی چوٹی میں موتیا کی کلیوں کا مہکتا گجرا سجا کر گورے گورے مہندی لگے پاؤں میں پائل چھنکاتی اِدھر سے اُدھر گزرتیں تو حیدر علی سے دل کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر موقع پاتے ہی انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتے ان کی محبت

کا جوش اور اُبلتے جذبات مہر بانو کی گلابی رنگت کو اور دہکا دیتی پنکھڑی سے لبوں پر کھلی حیا آلود مسکراہٹ حیدر علی کے دل میں ہلچل مچا دیتی۔

وہ تو خیر مہر بانو کے بے دام کے غلام تھے ہی مگر گھر کے باقی لوگوں کے دلوں پر بھی وہ اپنے حسن سلوک سے قبضہ جما چکی تھیں۔ ایک اتفاق یہ بھی تھا کہ دونوں میاں بیوی کے دلوں کی طرح ان کے حالات بھی ملتے جلتے ہوئے تھے۔ حیدر علی کی پُروقار شخصیت اور مردانہ وجاہت اگر اپنے مقابل کو چند لمحوں میں اسیر کر لیتی تو مہر بانو کا ملکوتی حُسن دیکھ کر بھی لوگ پلکیں تک جھپکانا بھول جاتے وہ اگر اپنی اس چھوٹی سی سلطنت کے بے تاج بادشاہ تھے تو مہر بانو کا بھی سندھ کے نامی گرامی خاندان سے تعلق تھا۔

دولت گھر کی لونڈی تھی گھی دودھ کی نہریں بہا کرتیں نوکر چاکر ادب سے ہاتھ باندھے حکم کے منتظر کھڑے رہتے۔ ذرا چہرہ اتر جاتا تو جانوں پر بن جاتی صدقے اتارے جاتے سہیلیاں ان کی قسمت دیکھ کر رشک سے ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں میکے میں بھی جھولیاں بھر بھر کے محبتیں سمیٹتی رہیں اور شوہر ملا تو وہ بھی پروانوں کی طرح نثار ہونے والا۔ ایک سال بعد ثانیہ کی معصوم کلکاریوں سے حویلی کا صحن گونجنے لگا تو محبت کا بندھن اور بھی مضبوط ہو گیا۔

دو برس بعد ثانیہ کا استقبال بھی ہنستے مسکراتے کیا گیا۔ نادیہ کی دفعہ بھی کسی کی پیشانی پر بل نہ پڑے لیکن چوتھی بار جب مہر بانو کا پیر بھاری ہوا تو حیدر علی سمیت سب ہی بیٹے کی آرزو دل میں لیے بیٹھے تھے۔ دونوں پھوپیوں نے تو ارمان میں بچے کے لیے کپڑے تک لڑکوں والے ہی سلوا کر رکھ لیے تھے۔ سب کو پکا یقین تھا کہ اس دفعہ اللہ میاں سے بھول چوک نہیں ہو سکتی۔ مگر بیٹی کی خبر سنتے ہی سب کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی چہرے لٹک گئے۔ اس پر ستم یہ کہ لیڈی ڈاکٹر نے سب کے منہ پر یہ بھی کہہ دیا کہ کسی پیچیدگی کے سبب مہر بانو ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہیں۔ حیدر علی تڑپ کر بولے۔

''ایسا نہ کہیں ڈاکٹر...... اس شاداب چمن کو کسی خزاں کا خطرہ نہیں لاحق ہو سکتا۔'' ان کے لہجے سے کرب جھلک رہا تھا۔

''میرے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے مسٹر حیدر علی یہ قدرت کا فیصلہ ہے جس کے سامنے ہم لوگ بھی بے بس ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر انہیں ہمدردی کی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ حیدر علی شاک کی حالت میں وہیں کھڑے رہ گئے۔

انہیں اپنا دھن دولت جائیداد اور باغ باغیچے بھی کچھ مٹی کا ڈھیر معلوم ہو رہا تھا اس دولت کا کیا فائدہ جس کا والی وارث ہی نہ ہو وہ اس دن کے بعد سے بجھ سے گئے تھے۔ آنکھوں کی چمک چہرے کی شگفتگی سب افسردگی میں ڈھل چکی تھی۔ حالانکہ مہر بانو کے سامنے جاتے ہوئے وہ خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھا لیتے مگر آنکھوں سے جھلکتی اُداسی کو کس طرح چھپا لیتے ویسے بھی شادی کے بعد اس چھ سالہ رفاقت میں وہ حیدر علی کے مزاج کے سبھی موسموں سے آشنا ہو چکی تھیں۔ وہ سمجھ چکی تھیں کہ حیدر سائیں لاکھ چھپائیں لیکن ان کی سمندروں جیسی گہری اور پُرسکون شخصیت میں ضرور کوئی طوفان مچل رہا ہے وہ کئی بار یہ بھید جاننے کے لیے حیدر علی کو ٹٹول چکی تھیں مگر ہر دفعہ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ٹال جایا کرتے۔

مہر بانو مطمئن تو نہ ہوتیں مگر خاموش ہو جاتیں انہیں معلوم تھا کہ حیدر علی کو بحث میں اُلجھنا سخت ناپسند تھا۔ مہر بانو کو حیرت تو اس بات پر تھی کہ پہلے تو وہ ان کی آنکھوں میں جھانک کر ان کے دل کے سارے بھید خود بخود جان لیتی تھیں مگر اب تو حیدر سائیں نے اپنے احساسات نہ جانے دل کے کن خفیہ گوشوں میں چھپا کر رکھے تھے کہ ان کو ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ مہر بانو کی تلاش و جستجو زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ اور آخر ایک دن اُلجھن کی اس ڈور کا سرا ان کے ہاتھ لگ گیا جس نے انہیں مطمئن کرنے کے بجائے ہوش و حواس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

وہ کسی کام سے بڑی نند خدیجہ کے کمرے میں جا رہی تھیں۔ حیدر علی بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے جیسے ہی کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا اندر سے خدیجہ کے غصے میں زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سن کر وہ وہیں

ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں اور کان اس طرف لگا کر سننے لگیں۔

''میں کہتی ہوں تم آخر کب تک گھٹ گھٹ کر جیتے رہو گے۔ حیدر ہم نے تمہیں بہن نہیں ماں بن کر پالا ہے ہم سے تمہارا اُداس چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ خدیجہ کی آواز میں غصہ کے ساتھ دکھ بھی جھلک رہا تھا۔

مگر آپا تقدیر کے فیصلے تو نہیں بدلے جا سکتے۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا کہ میں بیٹے جیسی نعمت سے محروم رہوں۔ حیدر علی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا ان کے لہجے میں افسردگی اور یاسیت پوشیدہ تھی۔

تقدیر کو الزام نہ دو حیدر وہ قادر مطلق جو تقدیر لکھنے پر قادر ہے وہی تقدیر کا رُخ بھی پلٹ سکتا ہے۔ خدیجہ نے جذباتی انداز میں اونچی آواز سے کہا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' حیدر علی کے لہجے سے حیرت امنڈ پڑی۔

''مطلب یہ کہ اگر مہربانو اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تو کیا ہوا تم دوسری شادی بھی تو کر سکتے ہو۔'' خدیجہ نے بڑی سفاکی سے کہا۔ مہربانو کو لگا جیسے کسی نے ان کے کانوں میں لوہے کی گرم سلاخ پیوست کر دی ہو۔ سنہری رنگت زرد پڑ گئی ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔

اس لرزا دینے والے انکشاف نے ان کو اندر تک دہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے چینی سے حیدر علی کا جواب سننے کی منتظر تھیں۔

''خدا کے لیے آپا اب آپ دوبارہ یہ بات کبھی اپنی زبان پر نہ لایئے گا۔ مجھے ایسی اولاد نہیں چاہیے جو مہر کی خوشیاں اُجاڑ کر دنیا میں آئے۔'' حیدر نے اپنا ہونٹ کچلتے ہوئے غصے سے جواب دیا۔

''ہماری خوشیوں کی تمہاری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں ہے بیوی کی محبت میں تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ ہماری نسل تم پر آ کر ختم ہو جائے گی کوئی ہماری قبروں پر فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔'' خدیجہ نے بے حد طیش میں آ کر کہا۔

''آپ جو چاہیں سمجھیں۔ لیکن میں آپ کی یہ خواہش پوری کرنے سے مجبور ہوں۔'' حیدر علی نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا اور وہاں سے اٹھنے لگے۔

قدموں کی آہٹ پا کر وہ اپنا کانپتا وجود گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئیں۔ اور بے جان سی ہو کر بستر پر گر پڑیں۔ ان کے دل سے ہوکیں اُٹھ رہی تھیں گرم گرم آنسو تکیے میں نہ جانے کتنی دیر تک جذب ہوتے رہے۔

میں نے تو سائیں حیدر کو دائمی خوشیاں بخش دینے کا عہد کیا تھا اور انجانے میں خود ہی ان کی ذات کو دکھ پہنچانے کا سبب بن گئی یہ احساس دل پر چرکے لگا رہا تھا۔

حیدر علی کمرے میں داخل ہوئے تو مہربانو کو دیکھ کر ان کے دل کو زوردار جھٹکا لگا۔

اجڑا ہوا چہرہ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اُلجھے بال کانپتے ہونٹ انہیں دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں اور مسکرانے لگیں۔ اُداسی میں لپٹی ہوئی یہ مسکراہٹ اس وقت ان کے چہرے پر ذرا بھی نہیں سوٹ کر رہی تھی۔

''خیر تو ہے مہر یہ تمہاری اچانک کیا حالت ہو گئی ہے۔'' حیدر علی نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ مگر مہربانو نے جواب دینے کے بجائے خود الٹا سوال کر دیا۔

''حیدر سائیں آخر میری وفا میں آپ کو ایسا کون سا کھوٹ نظر آیا تھا جو آپ نے مجھے اعتبار کے قابل بھی نہ سمجھا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو مہر.....'' حیدر علی نے حیران پریشان ہو کر کہا۔

''تو پھر آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے اب تک مجھ سے یہ بات کیوں چھپا کر رکھی کہ آپ کو بیٹے کی تمنا نے بے چین کر رکھا ہے جو میں آپ کو کبھی نہیں دے سکتی۔''

مہربانو کی آواز دکھ اور صدمے سے لرز رہی تھی۔

میری محبت کو غلط رنگ نہ دو مہر اب اگر تمہیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے تو میری بات کا یقین کرو میں نے یہ بات صرف اس لیے پوشیدہ رکھی تھی کہ تمہارے آبگینے جیسے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

حیدر علی نے نرم لہجے میں اپنی بات کی وضاحت کی۔

مہربانو کے دل پر ایک لمحے کے لیے پشیمانی کے احساس نے تسلط جمالیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سر اٹھا کر آہستہ سے بولیں۔

سائیں حیدر آپ خدیجہ آپا کا کہنا مان کر دوسری شادی کر لیجیے۔

حیدر علی کا دل تڑپ اٹھا وہ بے یقینی سے مہر بانو کو دیکھتے ہوئے بولے یہ تم کیا کہہ رہی ہو مہر...... کیا تم بھی میری محبت کو امتحان میں ڈالنا چاہتی ہو۔ ان کا لہجہ شکایتی ہو گیا تھا۔

''نہیں سائیں حیدر میں تو آپ کو اس حقیقت کا احساس دلانا چاہ رہی ہوں کہ اپنی آرزوؤں کو بے دردی سے کچل کر زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ لینا خود کشی کے برابر ہے آپ نے مجھ سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ عقل عمر تجربے ہر لحاظ سے آپ کو برتری حاصل ہے۔ آپ مجھے ایک بات کا جواب دیجیے کہ کیا ایک جنون کو سر پر سوار کر کے دنیا بھر کی خوشیوں کو ٹھکرا دینا محبت ہے۔ کیا ایسا کر کے آپ ان لوگوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کر رہے ہیں جن کی خوشیاں آپ کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ یہ سراسر ظلم ہے جو اپنے ساتھ ہی نہیں اپنے خاندان کے ساتھ بھی کر رہے ہیں۔''

وہ بے حد جذباتی ہو کر بول رہی تھیں مگر اپنے ہی خلاف شوہر کی عدالت میں آواز اٹھاتے ہوئے وہ اندر سے جس طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ اس کو تو ان کے دل کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

لیکن مہر میں نے آج تک تمہارے علاوہ کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا میں اپنی ساری چاہتیں تو تم پر لٹا چکا ہوں۔ کسی دوسری عورت کو کیا دے سکتا ہوں۔ حیدر علی نے کمزور اور دھیمی آواز سے کہا۔

''وقت سب سے بڑا استاد ہے حیدر سائیں وہ سب کچھ سکھا دیتا ہے۔'' مہر بانو کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔ دیر تک دونوں کے درمیان بحث چلتی رہی اور پھر کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

آہستہ آہستہ اترتے اندھیرے کھڑکی سے باہر بارش کی ہلکی سی ٹپ ٹپ دلوں پر اداسیوں کی مہر لگا رہی تھی۔ کیا واقعی مجھے مہر بانو کا کہنا مان لینا چاہیے۔

حیدر علی کا دل سینے میں پھڑ پھڑانے لگا۔ ان کو لگا جیسے خوشیاں انہیں آواز دے کر بلا رہی ہوں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے پیچھے کیوں ہٹ رہے ہیں۔ دل و دماغ میں مستقل جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے آخر حیدر علی کے حوصلوں کی دیواروں میں شگاف پڑنے لگا۔ اور وہ تکیہ سے سر اٹھا کر آہستہ سے بولے۔

''ٹھیک ہے میں تمہارا مشورہ قبول کرنے کو تیار ہوں مگر کل مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو مجھے الزام نہ دینا۔'' مہر بانو کے ہونٹوں پر ایک کرب ناک تبسم ابھر آیا۔

''آپ مطمئن رہیں حیدر سائیں میرے اندر بہت حوصلہ ہے آپ کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

حیدر علی نے مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں ذرا دیر بعد وہ گہری نیند میں کھو گئے۔ لیکن مہر بانو کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ نیند تو اب تمام عمر کے لیے ان کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ حیدر علی کے اقرار کے بعد انہیں اب لگ رہا تھا جیسے روشن تقدیر کی لائن ان کی ہتھیلیوں سے مٹ گئی ہو۔ بھرم کا ہلکا شیشہ ٹوٹ جانے کے بعد دل میں چبھن کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی پھانس کھٹک رہی ہو۔ شاید انہیں حیدر علی کے اتنی جلد رضا مند ہو جانے کی امید نہ تھی۔

صبح حیدر علی نے جا کر بہنوں کو یہ خبر سنائی کہ مہر بانو نے صرف انہیں دوسری شادی کرنے کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ بڑے اصرار سے انہیں یہ قدم اٹھانے پر تیار بھی کر لیا ہے۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اس لڑکی کا ظرف بہت بلند ہے۔ ان کے لہجے کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ فوراً ہی کراچی میں فیضان احمد سے رابطہ کیا گیا جو حیدر علی کے بچپن کے دوست بھی تھے اور کلاس فیلو بھی اس کے علاوہ دور کے رشتے سے بھائی بھی ہوتے تھے۔

''ٹھیک ہے تم فوراً کراچی آ جاؤ میری نگاہوں میں ایک معزز فیملی کی لڑکی موجود ہے۔ تم دیکھ لو......''

مہر بانو نے حیدر علی کو فیضان سے باتیں کرتے ہوئے سنا تو ایک سنسناتا ہوا احساس ان کو دماغ میں سرایت کرتا محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں اپنے مقدر میں اندھیرے رقم کر بیٹھی تھیں اور ساری زندگی کے لیے یہ کسک ان کے نام لکھ دی گئی تھی جس سے پیچھا چھڑانا ان کے بس سے باہر تھا۔

''مہر! میں آج شام کو کراچی جارہا ہوں۔'' حیدر علی

نے نظریں چراتے ہوئے مہربانو سے کہا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ لب تھرتھرا کر خاموش ہوگئے۔ بس زخمی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔ کہنے سننے کے لیے ویسے بھی ان کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ مگر اتنا ضرور سمجھ گئیں کہ وقت کا دھارا ان کے سر سے سائبان کھینچ کر پاتال کی گہرائیوں میں لیے جارہا تھا۔

تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میرے دل سے تمہاری چاہت ختم ہوگئی ہے تمہاری محبت مان اور مرتبے میں کبھی کوئی فرق نہیں آسکتا۔ وہ سر جھکا کر آہستہ سے دوبارہ کہنے لگے۔

مہربانو کا دل ڈوبنے لگا۔ چاہت عزت مان مرتبہ کس قدر خوبصورت الفاظ ہیں لیکن جب سر اُٹھا کر جینے کا فخر ہی چھن رہا تھا تو وہ الفاظ سے کس طرح بہل جاتیں۔

حیدر علی دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے ہوئے جیپ میں جاکر بیٹھ گئے اور ان کی جیپ مہربانو کی زندگی کی ساری خوشیاں سمیٹ کر انجانی منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ ان کے جاتے ہی مہربانو کا دل برداشت کی سیڑھی سے پھسل گیا۔

''کیا کیا نہ یاد آتا تھا۔ کیسی کیسی باتیں یاد آکر انہیں تڑپا رہی تھیں۔

جدائی کی یہ دھندلی شام دل پر کس طرح چرکے لگا رہی تھی۔ کمرے میں ہر طرف یادیں بکھری پڑی تھیں۔ حیدر علی کے مخصوص کولون کی مہک ابھی تک کمرے کی فضا میں رچی ہوئی تھی جواب کسی اور آنچل میں جذب ہونے والی تھی۔

''خدایا مجھے حوصلہ دے تاکہ میں یہ درد آسانی سے سہہ سکوں۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے زیرلب کہہ رہی تھیں۔

حیدر علی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ زرد دوپہر اب گلابی شام میں تبدیل ہوچکی تھی۔ مہربانو کا افسردہ چہرہ بار بار نگاہوں میں ابھر رہا تھا بے ربط سوچیں انہیں رہ رہ کر بے چین کر رہی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو حیدر اُٹھ کر جلدی سے شاور لے لو۔ ٹھیک پانچ بجے ہمیں توقیر حسن سے ملنے کے لیے جانا ہے۔'' فیضان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے

یار میں سوچ رہا ہوں کہیں جلد بازی میں یہ قدم اُٹھا کر میں کوئی غلطی تو نہیں کر رہا ہوں۔'' حیدر علی نے اپنے خدشات فیضان کے سامنے بیان کرتے ہوئے کہا۔

''حیدر کچھ باتیں وقت سے پہلے اس طرح انسان کو اُلجھاتی ہیں لیکن وقت آنے پر سلجھ جاتی ہیں تم بلاوجہ اپنے ذہن کو مت اُلجھاؤ اور ماضی کے اُداس لمحوں کو بھول کر ایک نئی اور سہانی صبح کو خوش آمدید کہو جو اپنے دامن میں خوشیوں کا پیغام لیے تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ فیضان نے ان کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے سمجھایا۔ اور حیدر علی کو تیار ہونے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔

بعض اوقات انسان انہیں اجنبی راہوں پر چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن پر چلتے ہوئے اس کے قدم مانوس نہیں ہوتے۔ وہ سوچتے ہوئے اُٹھ کر باتھ روم کی طرف چل دیے۔ ونگ کمانڈر توقیر حسن ہمدانی سے فیضان کے تعلقات بہت پرانے اور برادرانہ تھے۔ توقیر حسن کے گھر کی کوئی بات فیضان سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ برسوں پہلے توقیر حسن کے والدین ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہوچکے تھے اور دو لڑکیوں کی ذمے داری کا بوجھ توقیر حسن کے سر آپڑا تھا جس کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی اور ذمے داری کے ساتھ نبھایا۔ اعلیٰ تعلیم دلا کر انہیں معاشرے میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل بنادیا اور اب وہ ان کے بہتر مستقبل کے لیے اچھے اور معیاری لڑکوں کی تلاش میں تھے۔ ویسے تو مغرب زدہ ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے دونوں بہنوں کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹی بہن حمیرا نے تو ایک سال پہلے ہی کسی پولیس آفیسر سے لو میرج کر لی تھی۔ لیکن سمیرا کو اپنے معیار اور پسند کے مطابق کوئی نوجوان نظر نہیں آیا تھا۔ اچھے سے اچھے لڑکوں میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر ریجیکٹ کر دیتیں۔ اس کھینچا تانی میں وقت گزرتا جارہا تھا اور اس کے ساتھ توقیر حسن کی تشویش میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔

وہ اپنی اس پریشانی کا تذکرہ اکثر فیضان سے بھی کیا کرتے تھے جو انہیں تسلی دیتے رہتے اور خدا پر بھروسا

رکھنے کی تلقین کرتے حیدر علی کی طرف سے اشارہ ملتے ہی فیضان کے ذہن میں توقیر حسن کی بہن کا تصور ابھر آیا لیکن توقیر نے اُداس ہو کر کہا مجھے امید نہیں کہ وہ سر پھری لڑکی چار بچوں کے باپ سے شادی پر راضی ہو گی پھر بھی انہوں نے فیضان کی بات ٹالنا مناسب نہ سمجھا اور فیضان سے کہا کہ وہ جب چاہیں حیدر صاحب کو ان کے گھر لا سکتے ہیں۔

توقیر حسن نے جس پُر تپاک انداز میں حیدر علی کا خیر مقدم کیا تھا اس نے حیدر علی کو بہت متاثر کیا تھا۔ خود انہیں بھی براؤن آنکھوں اور بھوری مونچھوں والا یہ فوجی بے حد پسند آیا تھا جس میں فوجیوں والا اکھڑ پن اور روڈ انداز نام کو بھی نہ تھا۔ دونوں اس طرح آپس میں گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ حیدر علی کی گفتگو کا دلکش انداز ان کی قابلیت اور معلومات کا وسیع دائرہ توقیر حسن کے دل میں گھر کر چکا تھا اور ان کے دل میں بے اختیار یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ کاش سمیرا تنگ نظری چھوڑ کر اس رشتے پر رضامند ہو جائے تو زندگی کی رعنائی اور خوشی میں اس کا بھی برابر کا حصہ ہو سکتا ہے۔

ملازم چائے کی ٹرالی لے کر آیا تو توقیر کی بیگم وجیہہ کے ساتھ سمیرا بھی آ گئیں۔ توقیر حسن نے حیدر علی سے اپنی بیگم اور سمیرا کا تعارف کرایا تو حیدر علی سمیرا پر ایک سرسری نظر ڈال کر دوبارہ بات چیت کرنے میں مشغول ہو گئے مگر نہ جانے اس ایک اچٹتی نگاہ میں کون سا جادو تھا کہ جس نے سمیرا کے دل کو ایک عجیب اور لطیف سے احساس سے روشناس کر دیا تھا وہ حیدر علی کی خوبرو شخصیت کے سحر میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ کتنی خود اعتمادی ہے ان ہوس سے پاک شفاف آنکھوں میں بھلا ان جھیل سی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب کر کس کا ابھرنے کو دل چاہے گا اپنی اس سوچ پر وہ خود ہی شرما گئیں اور گال تمتمانے لگے۔ پیالی میں چائے انڈیلتے وقت ان کے ہاتھوں کی لرزش وجیہہ سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

"شاید ہمارے گھر بھی شادیانے بجنے کا وقت آ گیا ہے۔" وہ سوچ کر زیر لب مسکرا رہی تھیں۔ سمیرا کچھ دیر تک وہاں اس امید پر بیٹھی رہیں کہ شاید حیدر ان کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور کچھ نہیں تو کم از کم ایجوکیشن ہی کے بارے میں کچھ سوالات کریں لیکن ان کی بات تو بس ہیلو ہائے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس ستم گر شخص کو جاتے جاتے بھی دیکھنے سے خود کو نہ روک پائی تھیں جو ان کی موجودگی سے یکسر بے نیاز بس توقیر حسن کے ساتھ گپ شپ میں لگا ہوا تھا۔

فیضان نے حیدر علی سے ان کی رائے معلوم کی تو انہوں نے کہ مجھے تو وہ لڑکی خاصی ماڈرن اور آزاد خیال معلوم ہوتی ہے۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے تمہیں کون سا اس کو گاؤں میں لے جا کر چکی پسوانا ہے۔" فیضان نے مسکرا کر کہا۔

"تم یہ بتاؤ کہ لڑکی کی شکل وصورت وغیرہ کیسی ہے میرا مطلب ہے کہ تمہیں پسند آ گئی ہو۔ تو باقاعدہ طور پر توقیر کو تمہارا پرپوزل دے دیا جائے۔"

حیدر علی نے ایک بوجھل سانس لے کر فیضان کی طرف دیکھا اور بے حد سنجیدہ ہو کر بولے۔ فیضان تم کو تو اس نکاح کے اصل مقصد کا علم ہے۔ میرے لیے چوائس کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن بات شروع کرنے سے پہلے میری دو باتیں ضرور توقیر صاحب کے کانوں میں ڈال دینا میں یہ نکاح بالکل سادگی سے کرنا چاہتا ہوں۔ فضول بے تکی رسمیں اور سکڑوں لوگوں کا مجمع میری برداشت سے باہر ہو گا اس کے علاوہ مجھے اپنے بیوی بچوں سے ملنے پر کسی قسم کی پابندی ہرگز گوارا نہیں ہو گی۔ میں جب اور جس وقت بھی چاہوں گا ان کے پاس جاؤں گا اگر اس پر کوئی اعتراض نہ ہو تو بات آگے بڑھانا۔

"بس بس میں تمہارا مطلب سمجھ گیا توقیر سلجھے اور سمجھدار آدمی ہیں انہیں تمہاری شرطوں پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" فیضان نے جاتے ہوئے کہا۔

سمیرا تمہارے لیے حیدر صاحب کا پرپوزل ہے تمہارے بھائی نے تمہاری مرضی دریافت کی ہے انہیں کیا جواب دیا جائے۔ وجیہہ نے سمیرا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اور وجیہہ کی باتیں سنتے ہی سمیرا کا دل تیزی بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مہر و وفا سے ناآشنا نگاہوں میں محبت کی گلابی روشنیاں چھلک پڑیں۔ اور چہرے پر گلال بکھر گیا۔ کہہ دیجیے کہ مجھے اس رشتے پر کوئی

اعتراض نہیں ہے۔ سمیرا نے یہ کہہ کر وجیہہ کی مشکل آسان کردی۔

''خدا تمہیں نئی زندگی کی خوشیاں نصیب کرے۔'' وجیہہ نے سمیرا کو گلے لگا کر کہا۔ تو قیر حسن نے سنا تو ان کے دل میں بھی ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔ لیکن حمیرا اکھڑ کر کہنے لگی۔

''یہ شادی ہوگی یا سوئم کی محفل نہ جانے آپ لوگوں کو اس چار بچوں کے باپ میں ایسی کیا خوبی نظر آ گئی کہ اس کی ہر شرط ماننے کو تیار ہیں۔''

''یہ تم جا کر اپنی بہن سے پوچھو ہم نے اس کی مرضی کے بغیر یہ قدم نہیں اٹھایا ہے۔'' وجیہہ نے ناگواری سے جواب دیا تو وہ جا کر سمیرا پر برس پڑی۔

''میں پوچھتی ہوں آخر وہ ایسا کون سا یوسف ثانی ہے جس کا بتا ہوا وجود بھی تم نے نظر انداز کر دیا۔

''کیا اسی شخص کی خاطر تم نے اپنی آدھی عمر گنوادی ہے تم سے مجھے اس حماقت کی بالکل توقع نہیں تھی۔'' سمیرا کو بہن کی محبت بھری خفگی پر ہنسی آ گئی۔ اس کے ذہن میں بے اختیار وہ پل ابھر آیا جب اس نے ڈرائنگ روم میں پہلی بار حیدر علی کو دیکھا تھا اور پھر ایک عجیب فرحت بخش احساس نگاہوں سے وجود میں سرایت کرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

''سچ پوچھو تو میں ان کی خوبیاں گنوانے سے قاصر ہوں کوئی ایک خوبی ہو تو بتاؤں۔ شریف، با اخلاق ہینڈسم تعلیم یافتہ اور دولت مند کسی لڑکی کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔ سمیرا کا چہرہ خوشی کے رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ حمیرا نے حیرانی سے بہن کی طرف دیکھا اور شانے اچکاتے ہوئے بولی ٹھیک ہے بھئی جب تمہیں خود ہی ڈوبنے کا شوق ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے یہ ہر حال میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ یہ بیوی بچوں والے مرد کبھی بھی قابلِ اعتبار نہیں ہوتے اور ایک دن اپنی منزلوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

مگر سمیرا کا دل حیدر علی کے خلاف کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر ساری دنیا مل کر بھی زور لگاتی تب بھی کوئی ان کا ارادہ بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ انہیں برسوں سے ایسے ہی میچور اور دولت مند شخص کی ہمراہی کی تمنا تھی۔ جو حیدر علی کی صورت میں ان کے سامنے آ چکی تھی۔ وہ پھولوں جیسا شگفتہ لب ولہجہ انہیں ہر وقت کانوں میں رس گھولتا ہوا محسوس ہوتا اور اب اسی لہجے نے انہیں پکارا تھا ان کا ہاتھ تھام کر زندگی کی روشن شاہراہوں پر چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ بھلا کیسے اپنے قدم پیچھے ہٹا سکتی تھیں۔

حمیرا کے جاتے ہی وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیتی رہیں۔

''آخر مجھ میں کس بات کی ہے جو وہ مجھے ناپسند کرتے.....'' وہ کاجل اور مسکارے سے لتھڑی ہوئی آنکھیں آئینے پر جما کر سوچ رہی تھیں۔ چست جینز پر کھلے گریبان کا کرتا گردن میں مفلر کی طرح جھولتا ہوا دوپٹہ اور بھورے بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بھرے بھرے ہونٹوں کو لائٹ پنک لپ اسٹک نے اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ حالانکہ وہ حسین کہلائے جانے کی ہرگز مستحق نہیں تھیں مگر خود کو ہر وقت بنا سنوار کر رکھنے کی وجہ سے پرکشش ضرور لگتی تھی۔ ان کی آنکھوں سے ہر وقت غرور جھلکتا دکھائی دیتا ضد اور خودسری فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ شعر بالکل ان کے حسب حال تھا۔

وہ تو کچھ ہو ہی گئی تم سے محبت ورنہ
ہم وہ خودسر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں

جلد ہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی مثال سامنے آ گئی۔ اور وہ سمیرا توصیف ہمدانی سے سمیرا حیدر شاہ بخاری بن کر حیدر علی کی ڈیفنس والی کوٹھی میں آ گئیں۔

لمبے چوڑے بیڈ پر اپنا خوب صورت راجستھانی لہنگا پھیلائے وہ حیدر علی کی بے چینی سے منتظر تھیں۔ دل میں کنوارے ارمانوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ رہ رہ کر حیدر علی کا خوب صورت سراپا نظروں کے سامنے ابھر رہا تھا۔ زندگی بھر جس شے کی خواہش کی وہ حاصل ہوگئی بھلا مرضی کا ہم سفر کیسے نہ ملتا۔ اپنی خوش بختی پر انہیں بے حد ناز ہو رہا تھا۔

انتظار کے کچھ اور پل سمٹے اور حیدر علی آہستہ سے پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئے اسٹیل گرے راسلک کی قمیض اور سفید شلوار میں ان کی دراز قامت شخصیت

بے حد نکھری سی لگ رہی تھی ان کے اندر آتے ہی کمرے میں ایک مسحور کن مہک پھیل گئی تھی۔ سمیرا کی دھڑکنوں میں طلاطم برپا تھا پلکوں پر سنہری خواب اترنے لگے۔ وہ ہاتھ مخملی گفٹ باکس تھامے بیڈ کے قریب آ گئے۔ سمیرا کے ہوش وحواس منتشر ہونے لگے۔

"یہ تمہاری رونمائی کا گفٹ ہے۔" وہ باکس کو سمیرا کی گود میں رکھتے ہوئے بولے۔ سمیرا نے تھینکس کہہ کر بڑی بے صبری سے باکس کھول کر دیکھنے لگی۔

ڈائمنڈ کی خوب صورت جیولری پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں کی چمک میں اور اضافہ ہو گیا۔

"واؤ بیوٹی فل......" ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اور پھر جھلملاتی آنکھوں سے حیدر علی کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ مجھے ڈائمنڈ کی جیولری اٹریکٹ کرتی ہے۔"

"نہیں میں نے تو بس ویسے ہی لے لیا تھا۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔" حیدر علی نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا اور بیٹھ کر پیشانی کو انگلیوں سے مسلنے لگے۔

"کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" سمیرا نے پریشانی سے سوال کیا۔

"کوئی خاص بات نہیں بس سر میں ہلکا سا درد محسوس ہو رہا ہے، لیٹ جاؤں گا تو ریلیکس مل جائے گا۔"

حیدر علی نے سرد وسپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ سمیرا او کے کہہ کر ایک طرف کھسک گئیں وہ بیڈ کے ایک سائیڈ پر سکڑ کر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں مگر فوراً آنکھیں کھول کر کہنے لگے۔

"میرے خیال میں تم بھی اپنے یہ وزنی کپڑے چینج کر کے ایزی ہو جاؤ۔"

سمیرا کا دل کہیں پاتال میں گرنے لگا۔ حیدر علی کا بے تاثر چہرہ اور ٹھنڈا ٹھار لب ولہجہ پہلے ہی انہیں پریشان کر رہا تھا اس جملے نے اور بھی رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ وہ بے زار ہو کر دونوں چٹکیوں میں لہنگا سنبھالے بیڈ سے نیچے اتر گئیں۔ شہر کی ساری مارکیٹیں چھان کر انہوں نے ایک فیشن ایبل شاپ سے آرڈر پر یہ ڈریس تیار کرایا تھا جسے حیدر علی نے نظر بھر کے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور وزنی کہہ کر ان کی قدر وقیمت ختم کر دی تھی شاید لہنگا خود بھی اس ناقدری پر رو پڑا ہوگا۔

وہ ڈریسنگ روم میں جا کر جھنجلاتے ہوئے ایک ایک چیز کو نوچ کھسوٹ کر اتارنے لگیں۔ ہاتھ منہ دھو کر میک اپ اتارنے کے بعد آسمانی لیس کی نائٹی پہن کر بالوں کو بینڈ میں جکڑتی ہوئی جب وہ کمرے میں آئیں تو ان کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ کمرے میں جھکا جھک کرتی دودھیا روشنی کے بجائے ہلکے نیلے رنگ کا غبار پھیلا ہوا تھا اور حیدر علی آنکھوں پر بازو موڑ کر رکھے بے خبر سو رہے تھے۔ سمیرا تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں ان کا دل حیدر علی کی اس حرکت پر غصے کی وجہ سے سلگ رہا تھا۔ آنکھوں میں نفرت اور بے زاری کی پرچھائیاں لیے وہ خود اپنے آپ سے بھی خفا لگ رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار ایک اجنبی پر بھروسہ کرنے کی انہیں کتنی بڑی قیمت چکانی پڑی تھی۔ حالانکہ میں نے اس شخص کو اپنی ذات کا مان تک بخش دیا لیکن اس نے تو میری ذات ہی کی دھجیاں بکھیر ڈالیں۔ آخر اس آدمی کو اس طرح میری زندگی سے کھیلنے کا کیا حق تھا۔ وہ نفرت سے حیدر علی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ آنکھوں میں غصہ اور بے بسی کی وجہ سے آنسو امنڈ رہے تھے۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ان کے سہاگ کی سیج پر شب خون مارنے والی ان کی سوکن مہربانو تھیں جو ان کے کمرے سے باہر جاتے ہی حیدر علی کے تصور میں آ دھمکی تھیں۔ سائیں حیدر لائیں میں آپ کا سر دبا دوں انہیں قریب کہیں سے ان کی میٹھی سرگوشی ابھرتی ہوئی سنائی دی اور پھر ان کی نرم و ملائم انگلیوں کا لمس ماتھے پر محسوس کرتے ہی ان پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی اور وہ نیند کی وادیوں میں پہنچ گئے۔ سوتے ہوئے ان کی روشن پیشانی ہلکی روشنی میں دمک رہی تھی وہ پیشانی جو کردار کی عظمت اور بلندی کی گواہ تھی مگر ایسے باکردار شخص کو کسی کی زندگی کے ساتھ ایسا بھیانک مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بے قرار ہو کر صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

خیر میرا نام بھی سمیرا توصیف ہمدانی ہے میں کوئی

جاہل گنوار لڑکی نہیں ہوں کہ اس بے حس انسان کے ساتھ اپنی زندگی گزار دوں گی۔ میرے لیے نہ پہلے رشتوں کی کوئی کمی تھی اور نہ اب ہوگی۔ وہ بیٹھے بیٹھے فیصلوں کے منازل طے کر رہی تھیں اور قطرہ قطرہ پگھلتی ہوئی سیاہ رات ان کی بے بسی پر قہقہے لگاتی ہوئی گزرتی جا رہی تھی۔

حیدر علی نے سوتے میں کروٹ بدلی تو اچانک ان کی آنکھ کھل گئی رات کا سارا منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ سامنے صوفے پر سمیرا کو بیٹھے دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھ گئے۔ اور اٹھ کر تیزی سے لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔ سمیرا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ان کی آنکھوں سے نفرت برس رہی تھی۔

آخر میں اپنی محرومیوں کی سزا اس بے چاری کو کیوں دے رہا ہوں۔ وہ ضمیر کی ملامت سے پریشان ہو کر کھڑے ہوگئے اور سمیرا کے قریب جا کر ان کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

''آئی ایم سوری سمیرا میں بہت شرمندہ ہوں۔'' ان کے لہجے سے لجاجت ٹپک رہی تھی مگر سمیرا نے نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹک کر ڈوپٹہ سنبھالتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئیں۔ ہلکی ہلکی روشنی میں باہر کا منظر بھیگا بھیگا لگ رہا تھا۔ سمیرا کو لگا جیسے درخت پھول پودے آسمان پر ٹمٹماتے ستارے کائنات کی ہر چیز ان کی قسمت پر آنسو بہا رہی ہو۔

''سمیرا پلیز میرا یقین کرو مجھے واقعی بڑی تکلیف تھی۔ حیدر علی نے ایک بار پھر اپنی تمام تر کوششوں بروئے کار لاتے ہوئے سمیرا سے معذرت کرنے لگیں لیکن وہ غصے سے منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑی ہوگئیں۔

حیدر علی نے ان کے غصے کی پروانہ کرتے ہوئے انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھالیا اور لا کر بیڈ پر لٹا دیا چھوڑیں مجھے۔ وہ ان کے وجود پر جھک کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے کیسے چھوڑ دوں کیا چھوڑنے کے لیے اپنایا تھا۔

سمیرا ان کی گرفت سے باہر نکلنے کے لیے بری طرح مچل رہی تھیں مگر حیدر علی کی مضبوط گرفت سے نہ نکل سکیں اور بے دم ہو کر بیڈ پر گر پڑیں۔ آخر آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔

مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننا ہے۔ سمیرا نے تلخی سے کہا۔

مگر حیدر علی نے ان کی پوری بات نہ سنی اور اپنے ہاتھ سے ان کا منہ بند کر دیا۔ حیدر علی کی نگاہوں کی تپش چہرے پر محسوس کرتے ہوئے سمیرا اس بے پناہ مضبوط شخص پر برستے برستے خاموش ہوگئیں۔ ان کے ضبط کی طنابیں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ قربت کی مدھم مدھم آنچ ان کو موم کی طرح پگھلانے لگی اور پھر ان کی ساری مزاحمتیں دم توڑ گئیں ضبط کے کڑے مراحل ان کا چہرہ سرخ انگارہ کیے دے رہے تھے۔ انہوں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ حیدر علی کے بازوؤں میں اپنا منہ چھپالیا۔ کچھ دیر پہلے کا غصہ کوفت اور اذیت سب کچھ تحلیل ہو چکی تھی۔

صبح چڑیوں کی چہکار کے ساتھ سمیرا کی آنکھ کھل گئی حیدر علی بستر پر نہیں تھے وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گئیں۔ پردہ کھسکاتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کا ننھا سا جھونکا ان کے چہرے کو چھونے لگا۔ سورج کی سنہری کرنوں میں عجیب سی سرشاری تھی۔ کیاریوں میں جھومتے ہوئے خوش رنگ پھول صبح کی تازہ ہوا سینہ تان کر کھڑے اونچے اونچے درخت اور شفاف نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے سفید پرندے سب کچھ انہیں بے حد نیا لگ رہا تھا یا کسی خمار آگیں احساس سے ان کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں اور پھر دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔

شادی کو ایک ماہ گزر چکا تھا۔ سمیرا کو اس عرصے میں حیدر علی کی فطرت کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا وہ چاہتی تھیں کہ حیدر علی اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے ان کے ساتھ پیار بھری باتیں کریں۔ فطرت کے نظاروں کو ان کے آنچل میں سمو دیں۔ رم جھم برستی بارش میں ان کے ساتھ لان میں جا کر اس خوبصورت موسم کا لطف اٹھائیں۔

چاندنی راتوں میں ان کا ہاتھ تھام کر انہیں لانگ ڈرائیو پر لے جائیں مگر حیدر علی کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ حالانکہ اپنی طرف سے وہ سمیرا کا خیال بھی رکھتے ان سے محبت جتانے میں بھی کوئی کنجوسی نہ برتتے لیکن سمیرا کی بچکانہ خواہشوں کے لیے وقت نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

سمیرا کا سوشل سرکل بھی خاصا وسیع تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی سہیلی یا کزن کے گھر پارٹیز اور فنکشن ہوا کرتے وہ چاہتی تھیں کہ حیدر علی بھی ان کے ساتھ چل کر انجوائے کریں مگر وہ ان کے ساتھ جانے کے بجائے ان کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا لفافہ پکڑا کر مصروفیت کا عذر پیش کرتے ہوئے جان چھڑا لیتے اور وہ حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہ جاتیں۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتیں کہ ہر وقت اپنی کاروباری مصروفیات کا تذکرہ کرنے والے اس شخص کے پاس بیوی بچوں سے ملنے کے لیے جانے کو وقت کہاں سے نکل آتا تھا۔ اس وقت کوئی مصروفیت کیوں ان کا راستہ روک کر نہیں کھڑی ہوتی تھی، اکثر موقع بے موقع وہ حیدر علی کو یہ طعنہ دینے سے نہیں چوکتی تھیں۔ حیدر علی کے پاس ان کی ان شکایتوں کا کوئی جواب نہ تھا بس مسکرا کر خاموش ہو جایا کرتے۔ اکثر وہ ان کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے طرح طرح کے ڈیزائنوں کے کپڑے پہن کر ان کے سامنے آتیں لیکن وہ جھوٹے منہ تعریف کرنا تو ایک طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔ اور نہ ہی ان کی آنکھوں میں کوئی ستائشی جذبہ ابھرتا۔ ان کی اس بے حسی اور سرد مہری پر سمیرا کا دل جل جل کر خاک ہو جاتا اور پچھتاوے کا احساس ان کے وجود میں پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتا۔ انہیں اپنے گرد پھیلے ہوئے سناٹوں سے وحشت ہونے لگتی۔ ان کا دل چاہتا کہ اس عالی شان گھر کے در و دیوار زندگی کے بھاگتے دوڑتے لمحوں سے آشنا ہو جائیں۔ خود ترسی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ دل ہی دل میں اپنے حوصلوں کو داد دینے لگتیں نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے اس آہنی مرد کا انتخاب کیا تھا۔

اور پھر انہیں اندھیروں میں امید کا جگنو چمکنے لگا۔ سمیرا نے اس دن پہلی بار حیدر علی کو کھل کر مسکراتے دیکھا تھا۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے ٹوٹ کر خوشیاں برس رہی تھیں۔ اچانک سمیرا کی قدر و قیمت ان کی نگاہوں میں بڑھ گئی وہ ان کی اول جلول باتوں کو نظر انداز کرنے لگے۔ اس طرح ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے بٹھاتے جیسے وہ کوئی چینی کی گڑیا ہوں جو ذرا سی بد احتیاطی سے ٹوٹ کر چکنا چور ہو جائے گی۔ ان دلداریوں نے سمیرا کا مزاج اور بھی ساتویں فلک پر پہنچا دیا اس طرح اکڑ اکڑ کر چلتیں جیسے زمین پر کوئی احسان کر رہی ہوں۔ وقت نے ایک جست لگائی اور آگے نکل گیا۔

ایک روشن اور چمکیلی صبح کو کراچی کے ایک بڑے اسپتال میں سمیرا نے ایک تندرست اور خوب صورت بیٹے کو جنم دے کر حیدر علی کی تشنہ آرزوؤں کو سیراب کر دیا تھا۔ حیدر علی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بچے کو گود میں لے کر کانوں میں اذان دیتے وقت ان کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ سب سے پہلے یہ خوش خبری مہربانو کو سنانا چاہتے تھے جس کے جذبہ ایثار کی بدولت یہ انمول تحفہ ان کے ہاتھ آیا تھا۔ خوشی کا بھرپور احساس ان کی روح میں سرایت کرتا جا رہا تھا اور سمیرا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک سال بعد ان کے اندر کسی بہار نے قدم دھرے تھے۔ ان کے دل میں اندر تک ٹھنڈک اترتی چلی گئی۔ حیدر علی کی وارفتگی دیکھ کر انہیں پورا یقین ہو چلا تھا کہ وہ بہت جلد ان کے ذہن سے ماضی کے تمام نقوش مٹا کر بس اپنی اور اپنے بیٹے کی تصویر فٹ کر دیں گی۔

ان کی خوش فہمی کی ایک اور یہ بھی وجہ تھی کہ حیدر علی نے ان کی پریگنینسی کے دوران اپنے شہر کی یاترا کے لیے بار بار جانا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اس بات کی بالکل خبر نہ تھی کہ یہ قدم حیدر علی نے بحالت مجبوری اٹھایا تھا۔ دراصل ان کا بلڈ پریشر ان دنوں کافی شوٹ کر گیا تھا جس سے ماں اور بچے دونوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا اور ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اس وقت ذرا سی بد احتیاطی اور معمولی سی ٹینشن بھی ان کے لیے نقصان دہ تھی۔ سمیرا اس بات سے لاعلم ہو کر اپنی جیت پر بے حد نازاں تھیں۔ لیکن ان کی ساری خوشی اس روز بھک سے اڑ گئی جب حیدر علی ان کے گھر آنے کے دوسرے ہی دن اپنی گم گشتہ منزلوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ اتنی منتوں مرادوں کا بیٹا بھی پاؤں کی زنجیر نہ بن سکا۔ ایک کسک تھی جو سمیرا کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔ جو نہ جانے کب تک ان کی خوشیوں اور مسکراہٹ کے رنگوں کو پھیکا کرنے والی تھی۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھیں۔

دو روز بعد حیدر علی واپس لوٹے تو سمیرا کا موڈ آف

دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے کس طرح نمٹیں گے۔ سمیرا نے ان کو زندگی کی سب سے بڑی خوشی ضرور دی تھی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اتنے خود غرض بن جاتے اور اپنا سکون برقرار رکھنے کے لیے مہربانو کو ایک نئی سزا اور نئے امتحان میں ڈال دیتے۔ شاید کاتب تقدیر نے ان کے حصے میں ادھوری خوشیاں ہی لکھی تھیں۔ جو ہر موقع پر ان کا دل سچی خوشی سے محروم رہتا تھا۔

منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والے اس بیٹے کا نام مراد حیدر تجویز کیا گیا تھا۔ وہ شکل وصورت میں حیدر علی کا پرتو تھا ڈی براؤن آنکھیں کشادہ روشن پیشانی اور لمبے لمبے مضبوط ہاتھ پاؤں۔ حیدر علی جب بھی اس کی طرف دیکھتے ان کا دل انوکھی مسرت سے لبریز ہو جاتا اور وہ اس کے روشن مستقبل کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنانے لگتے۔

اس دن سمیرا غسل سے فارغ ہو کر شیشے کے سامنے کھڑی ڈرائیر سے بال خشک کر رہی تھیں۔ اچانک وہ دو اجنبی عورتوں کے ساتھ ایک مرد کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر زور سے چیخ کر بولیں۔

''ارے بھئی آپ لوگ کون ہیں اور اس طرح منہ اٹھائے میرے کمرے میں کیسے گھستے چلے آرہے ہیں۔ آپ کو چوکیدار نے اندر کیسے آنے دیا۔'' ان کا لہجہ اس قدر کرخت تھا کہ آنیوالوں کے چہرے ایک دم سے پھیکے پڑ گئے اور قدم اسی جگہ گڑ کر رہ گئے۔ حیدر علی نے دور سے انہیں آتے ہوئے دیکھ لیا وہ تیزی سے بھاگ کر کمرے میں آگئے۔ حیدر علی کو دیکھ کر ان لوگوں کے چہروں کی رنگت بحال ہوگئی اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

''ارے حمید بھائی آپ لوگ اس طرح اچانک بغیر اطلاع کے کیسے آگئے فون کر دیتے تو میں آپ لوگوں کے لیے گاڑی بھیج دیتا۔'' حیدر علی کے لہجے سے حیرت کے ساتھ خوشی بھی جھلک رہی تھی۔

''ارے میاں یہ تمہاری بہنوں کی ضد تھی کہ ہم اچانک وہاں پہنچ کر حیدر کو حیران کر دیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آئندہ کے لیے ان لوگوں نے اس قسم کا سرپرائز دینے سے توبہ کر لی ہوگی۔'' حیدر علی کے بہنوئی نے دبی دبی چوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔ حیدر علی خفیف ہو کر بات ٹالتے ہوئے سمیرا سے کہنے لگے۔

''سمیرا یہ میری بہنیں ہیں یہ بڑی خدیجہ آپا ہیں اور یہ زلیخا آپی ہیں۔ یہ زلیخا آپی کے شوہر حمید بھائی ہیں جو مجھے حقیقی بھائی کی طرح مانتے ہیں۔''

سمیرا کو اس تفصیلی تعارف سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بڑے خشک انداز میں سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہوگئیں اور دونوں بہنوں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں جن کے وجود پر گنوار پن کی چھاپ جھلک رہی تھی۔ دونوں نے شوخ پھولدار پرنٹ کے سوٹ پہن رکھے تھے۔ سر میں ڈھیروں تیل چمک رہا تھا اور خوب کسی چوٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں گولڈ کے موٹے موٹے کڑے تھے۔ آنکھوں میں دنبالے دار کاجل لگا ہوا تھا اور ہونٹ پان کی سرخی سے رنگے ہوئے تھے۔

''حیدر کہاں ہے ہمارے خاندان کا چراغ میری تو اسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس رہی ہیں بس چلتا تو اڑ کر آجاتی اور اسے اپنے سینے سے لگا کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی مگر تمہارے بہنوئی کی بیماری نے مجھے مہلت ہی نہ دی۔'' خدیجہ نے کہا۔

سمیرا کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھر آئے گھبرا کر بولیں۔

''حیدر آپ کو یاد ہے نا ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کسی باہر سے آنے والے کی گود میں بابا کو نہ دیا جائے۔''

حیدر علی نے گھور کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر کی ایسی تیسی۔'' دھپ دھپ کرتے اندر چلے گئے اور آیا کی گود سے بچے کو لے کر آگئے۔

''لیجیے سنبھالیے اپنے خاندان کے چشم و چراغ کو.....'' وہ خدیجہ کی گود میں اس کو ڈالتے ہوئے بولے۔

''ارے میں قربان جاؤں بالکل باپ پر گیا ہے۔'' وہ چٹاچٹ بچے کی بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔ زلیخا نے بھی بہن کی تقلید میں بلائیں لے ڈالیں۔ حمید نے پھولا ہوا لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''حیدر میاں یہ ہم تینوں کی طرف سے تمہارے بیٹے کے لیے ہے۔''

"اس کی کیا ضرورت تھی حمید بھائی آپ لوگ یہاں آ گئے میرے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعائیں دیں میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔"

حیدر علی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سمیرا کو ان لوگوں کی موجودگی سے بے حد کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھیں کہ اگر کسی سہیلی نے یہاں ان کو دیکھ لیا تو وہ شرمندگی کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ انہوں نے تو شادی کے وقت سب جگہ یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ بڑے گریڈ فیملی میں بیاہ کر جا رہی ہیں جو بے حد آزاد خیال اور فیشن ایبل ہے۔ آخر ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ روکھے پن سے کہنے لگیں۔

"حیدر آپ ان لوگوں کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھائیں میں قاسم سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔"

خدیجہ کو ان کے بات کرنے کا انداز اچھا نہیں لگا وہ تیوریاں چڑھا کر کہنے لگیں۔

"چھوٹی دلہن ہم لوگ اپنے بھائی کے گھر آئے ہیں۔ مہمانوں کی طرح ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا ہمیں شوق نہیں ہے۔" زلیخا بھی بول پڑیں۔

"کھانے دانے کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ کھانا وغیرہ کھا کر چلے تھے۔"

"اب آپ لوگ آج کی رات ہمارے گھر رہیں گے۔" حیدر علی نے کہا۔

"حیدر میاں آج نہیں پھر کبھی سہی آج مجھے بڑا ضروری کام ہے۔" حمید نے عذر پیش کیا۔ حیدر علی خاموش ہو گئے۔ لیکن ان سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے لیا ان لوگوں کے جاتے ہی وہ سمیرا پر برس پڑے۔

"کیا یہی ہیں تم لوگوں کے مینرز بڑی ایجوکیٹڈ اور ویل مینرڈ بنی پھرتی ہو تمہارے گھر مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔" وہ بے حد طیش میں بول رہے تھے۔

"اس میں اس قدر ریش ہونے والی کیا بات ہے۔ حیدر ان دونوں کو بھی تو چاہیے تھا کہ آتے وقت کم از کم اپنے حلیے درست کر کے آتیں۔ آپ کی عزت اور پوزیشن کا ہی خیال کر لیتیں۔" سمیرا نے دھیمی آواز سے جواب دیا۔

"ذات...... اس سے تمہارا کیا مطلب ہے کیا ان کو یہاں آنے سے پہلے بیوٹی پارلر کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ سمیرا بیگم ہم سیدھے سادھے دیہاتی لوگوں کو اپنی پہچان کرانے کے لیے لیپاپوتی کی ضرورت نہیں پڑتی ہے اور یہ بات تو تم کو شادی سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔" حیدر علی نے اونچی آواز سے جواب دیا۔ ان کے لہجے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے انہوں نے غصے سے کرسی کو زور سے ٹھوکر ماری اور باہر نکل گئے۔

سمیرا کے اس بدصورت رویے نے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔ انہوں نے حیدر علی کو جتنی بڑی خوشی دی تھی وہیں گھاؤ بھی ایسا لگایا تھا جس کو بھرنے کے لیے مدتیں درکار تھیں۔ کئی دن دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہے مگر ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے یہ کب تک چل سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ بچے کی موجودگی پھر انہیں قریب لے آئی۔

سمیرا کو کوئی پچھتاوا نہیں تھا نہ ہی انہوں نے ایکسکیوز کی ضرورت محسوس کی تھی۔ وہ تو ہمیشہ دوسروں کو اپنے سامنے جھکاتی رہی تھیں خود جھکنا نہیں سیکھا تھا اور ان کی فطرت کا یہ رخ بھی حیدر علی کے سامنے آ گیا تھا۔ حیدر علی کی طرف سے بددل ہونے کے بعد سمیرا اپنی پرانی روش کی طرف لوٹ آئی تھیں۔ سیر سپاٹے تفریح فنکشنز پارٹیز وغیرہ میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی گھر شوہر اور بچے تک کی کوئی پروا نہ تھی۔ گھر میں ہوتیں بھی تو بچے کی طرف دھیان نہ ہوتا بس فیشن میگزین پھیلائے ڈیزائن نوٹ کرتی رہتی اور وہ معصوم بچہ جس نے اتنی منتوں مرادوں اور قربانیوں کے بعد دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ ماں کی محبت بھری آغوش کو ترستا رہتا۔ اس کے کان کبھی ماں کی میٹھی لوریوں سے آشنا نہ ہو سکے۔ کالی کلوٹی اجنبی شکلوں کے درمیان رہتے رہتے وہ دن بدن کمزور چڑچڑا اور بے حد ضدی ہوتا جا رہا تھا۔

کبھی کبھی حیدر علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو وہ سمیرا سے اُلجھ پڑتے لیکن وہ اُن کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتیں۔ انہوں نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ آگے جا کر اس قدر

ناہموار اور پتھریلا ہوگیا تھا۔ کہ اس پر چلتے ہوئے ان کے پیر شل ہوئے جارہے تھے۔ لیکن اب وہ اتنی دور نکل آئے تھے کہ واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔ اور ان کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہیں تھا سو انہوں نے بھی چپ سادھ لی رات گئے تھکن سے چور بدن لیے گھر آتے تو پڑ کر اس طرح سو جاتے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش بھی نہ رہتا۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا اور مراد کی تعلیم کا مسئلہ گھر میں ڈسکس ہونے لگا۔ حیدر علی کی خواہش تھی کہ مراد کو مری کانونٹ میں بھیج کر پڑھائیں گے مگر اچانک سمیرا کی مامتا بیدار ہوگئی اور وہ اکلوتے بیٹے کو اپنی آنکھوں سے اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ مجبوراً کراچی ہی کے ایک اچھے اسکول میں اس کا ایڈمیشن کرادیا گیا۔ ماں کی بے توجہی نے مراد کو بے حد جھگڑالو اور غصے ور بنادیا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر اپنی کلاس کے بچوں سے لڑتا جھگڑتا رہتا۔ کسی بچے کی کاپیاں پھاڑ دیتا اور کبھی کسی کی کتابیں چھپا کر ڈیسک میں رکھ دیتا۔ ان باتوں پر اسے پنش بھی ملتی فائن بھی دینا پڑتا گھر پر کمپلین بھی آتی لیکن سمیرا اسے حیدر علی کی نگاہوں تک پہنچنے نہ دیتیں، خود سائن کر کے بھیج دیتیں۔

حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ شکل و صورت کے علاوہ اس کے اندر بات کی ایک بھی خوبی نہ تھی۔ ساری عادتیں اس نے ماں ہی کی اپنائی تھیں اسے بھی غریبوں کے بچوں سے بے حد نفرت تھی خاص طور سے نوکروں کے بچوں کے ساتھ تو وہ بے حد وحشیانہ سلوک کرتا۔ بہت سے ملازم اس لیے نوکری چھوڑ کر چلے گئے اور کچھ کو سمیرا نے نکال باہر کردیا تھا۔ جب بھی اس کی کسی بچے سے لڑائی ہوتی وہ ہمیشہ دوسرے کو ہی موردِ الزام ٹھہراتیں۔ کبھی اگر حیدر علی کے سامنے وہ ایسی ویسی حرکت کرتا تو وہ نصیحت کے طور پر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے مگر فوراً سمیرا ایسے موقع پر بیٹے کی طرف داری کرنے لگتیں اور حیدر علی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔

ماں کی شہ پا کر وہ اور بھی شیر ہوتا جارہا تھا۔ بڑوں کا ادب لحاظ کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ حیدر علی نے کلام پاک پڑھنے اور دینی تعلیم دینے کے لیے جو مولوی مقرر کیا تھا اسے مراد نے ایک ہفتے میں ایسا تنگ کیا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا اور پھر کبھی محلے میں اس کی صورت نہ دکھائی دی۔

وقت ہر بات سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتا رہا۔ مراد نے میٹرک پاس کیا تو سمیرا نے اس کے دوستوں کو پارٹی دے ڈالی انہیں تو ہلا گلا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے ہوتا۔ کالج پہنچ کر تو اس کے اور بھی پر پرزے نکل آئے۔ وہاں کا ماحول اسکول سے بالکل مختلف تھا۔ جس طرف نظر اٹھاتا بے فکرے لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں قہقہے بکھیرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ بہت جلد وہ ان سب میں گھل مل گیا۔ ویسے بھی سب اس کی اچھی شکل و صورت بڑھیا و قیمتی لباس سے خاصے مرعوب ہوچکے تھے۔

سب کے بیچ میں وہ راجہ اندر بن کر اپنی بڑائیاں جتاتا رہتا اور جب لڑکوں لڑکیوں کی سراہتی نظریں اس کا تعاقب کرتیں تو اس کی گردن فخر سے اکڑ جاتی آنکھوں میں غرور کی پرچھائیاں لہرانے لگتیں۔ انہی لڑکوں میں کچھ آوارہ قسم کے بھی تھے جو محض وقت گزاری اور تفریح طبع کی خاطر کالج آتے تھے اور باپ کی خون پسینے کی کمائی کو اپنی عیاشیوں پر لٹا کر تعلیم جیسی مقدس چیز کو بدنام کررہے تھے۔ مراد کو بھی ان لڑکوں نے اپنی لائن پر لگالیا۔ اور وہ بھی انہیں کے رنگ میں رنگ گیا۔ سگریٹ تو اس نے میٹرک سے ہی پینا شروع کردی تھی لڑکوں کے ساتھ رہ کر اسے نشے کی لت بھی پڑگئی۔ اور یہ کوئی انہونی بات نہ تھی جہاں کوئی روک ٹوک نہ ہو کھلی آزادی میسر ہو روپے پیسے کی فراوانی ہو اور سب سے بڑھ کر عیبوں پر پردہ ڈالنے والی ماں ہو وہاں قدموں کو بہکتے میں کیا دیر لگتی ہے۔

ماں باپ دونوں نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ حیدر علی نے بھی خود کو بس روپیہ کمانے کی مشین بنا رکھا تھا۔ اتنا وقت بھی نہ تھا کہ یہ تو پتہ کر لیتے کہ بیٹا تعلیم حاصل کرنے کی آڑ میں کیا گل کھلا رہا ہے۔ اتنے سمجھدار اور جہاں دیدہ ہونے کے باوجود وہ حالات سے اتنے مجبور تھے یہ احساس بھی نہ تھا کہ والدین کی ذمے داری محض اولاد کو عیش و آرام مہیا کردینے سے ختم نہیں ہوجاتی ان پر نظر بھی رکھنا پڑتی ہے۔ وہ تو اس وقت

چونکہ جب بی کام کا رزلٹ آنے کے بعد مراد نے آگے پڑھائی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ تو اس کو ہائیر اسٹڈیز کے لیے فارن بھیجنے کے خواب دیکھ رہے تھے مگر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان کا خواب بند پلکوں تلے ابھر کر آخری سانسوں کی طرح ڈوب گیا۔

کالج کو خیر باد کہنے کے بعد اس کی آوارہ گردیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد میں لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کو وہ اپنی شاموں کو حسین اور رنگین بنانے کے لیے اپنے پہلو میں لے کر گھومتا رہتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آ گیا جب لڑکوں کی تعداد بالکل گھٹ گئی صرف لڑکیاں ہی اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن گئیں۔ حیدر علی کے گھر سے نکلتے ہی وہ بھی اپنی کار لے کر نکل جاتا۔ ایک دن وہ حسبِ معمول کسی نئے شکار کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا کہ اس نے کسی ماڈرن لڑکی کو شاپنگ سینٹر کے اندر جاتے دیکھ لیا۔ مراد کی فوراً رال ٹپکنے لگی اس نے اپنی کار وہیں کھڑی کر دی اور لڑکی کے پیچھے خود بھی اسی دکان کے اندر داخل ہو کر چیزوں کی قیمت پوچھنے لگا۔ دکاندار اس وقت اتفاق سے اکیلا تھا۔ لڑکی نے کوئی چیز طلب کی تو وہ اس کو لینے کے لیے دکان کے اندر چلا گیا۔

مراد موقع کی تاک میں تھا۔ تیزی سے لڑکی کے قریب آ کر دھیرے سے نہ جانے کیا کہ لڑکی غصے سے آگ بگولہ ہو کر اول فول بکنے لگی۔ مراد اس صورتِ حال سے گھبرا کر دکان سے باہر آنے لگا لیکن پیچھے سے دکان دار نے اسے گھسیٹ کر وہ مار لگائی کہ مراد کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔

آس پاس کے لوگ جمع ہو کر تماشہ دیکھنے لگے انہی لوگوں میں حیدر علی کے پڑوسی بھی موجود تھے۔ مراد کو مار کھاتے دیکھ کر وہ آگے بڑھے اور دکاندار کو بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا تب کہیں جا کر مراد کی جان بچی اور وہ وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگ نکلا۔ اس رات پڑوسی نے حیدر علی کے پاس جا کر ساری روداد سنا دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ حیدر صاحب اپنے صاحبزادے کو سنبھال کر رکھیں آج تو میں نے دیکھ لیا کل اگر کوئی ایسا واقعہ درپیش ہوا تو وہ جیل کی ہوا کھاتے نظر آئیں گے۔

حیدر علی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ان کی نگاہیں شرم سے زمین میں گڑ کر رہ گئیں۔ پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ ویسے تو آزمائشوں کا سفر طے کرتے ہوئے انہیں مدت ہو چکی تھی۔ لیکن اس بار تو ان کی برداشت کی ساری حدیں ختم ہو گئی تھیں۔ خاندانی عزت و شرافت کو بیچ چوراہے پر دھجیاں بکھیر دی گئی تھیں جس پر ان کا دل آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا اور اس سے پہلے کہ رسوائیوں کے چھینٹے ان کے اُجلے دامن کو مزید داغ دار کرتے اور وہ لوگوں سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتے انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے بھی مراد اب اس حد تک گر چکا تھا کہ اس کو ان کی سرپرستی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ تمام رات اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا رہے اور صبح ہوتے ہی جانے کی تیاری کرنے لگے۔

حیدر کیا آپ ہم لوگوں سے رشتہ توڑ کر جا رہے ہیں سمیرا نے ان کو ملازم سے سامان پیک کراتے دیکھ کر سوال کیا۔ ظاہری بات ہے جن رشتوں کو نبھاتے ہوئے پل صراط پر چلنے کا یقین ہونے لگے ان کو توڑنا ہی پڑتا ہے۔ حیدر علی نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

لیکن آپ مراد کی بے راہ روی کی ساری ذمے داری مجھ پر کیوں ڈال رہے ہیں کیا باپ ہونے کے ناطے آپ کا فرض نہیں تھا کہ آپ اس پر نظر رکھتے وہ کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے اس کے دوست کس ٹائپ کے ہیں یہ سب میں تو باہر جا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سمیرا نے خود کو بے قصور ثابت کرنا چاہا۔

درست فرمایا آپ نے مگر یہ بات آپ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر پوچھیں کہ کیا آپ نے مجھ کو باپ ہونے کا حق استعمال کرنے دیا۔ بچپن سے لے کر اب تک جب بھی میں نے اُس کو کسی غلطی پر سرزنش کرنا چاہی آپ اسی کے منہ پر اس کو بے قصور ثابت کرتے ہوئے مجھ سے اُلجھ پڑتیں اور میں ہمیشہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا تھا۔ آج اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

حیدر علی کے لہجے میں طنز اُمڈ آیا تھا۔ سمیرا لاجواب سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ جیپ میں سامان رکھوا کر چلے گئے۔ وہ حق دق سی کھڑی دیکھتی رہیں۔ حیدر علی کے ساتھ گزارے دنوں میں کوئی جارم نہ تھا مگر پھر بھی ایسا

لگ رہا تھا جیسے ان کے سر سے سائبان ہٹ گیا ہو اور وہ جھلستے صحرا میں تنہا کھڑی رہ گئی ہوں۔

مراد رات کو گھر آیا تو خلافِ معمول گھر میں سناٹا چھایا تھا۔ ٹی وی بھی بند تھا وہ دبے پاؤں ماں کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اُداس بیٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے ممی کیا آج ڈیڈی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تمہیں اس سے کیا مطلب ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اب تم خوش ہو جاؤ۔ تمہارے ڈیڈی تمہاری حرکتوں کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

سمیرا نے جل بھن کر جواب دیا۔ مراد کی تیوریاں چڑھ گئیں اس نے کہا رہنے دیں ممی انہیں تو یہاں سے جانے کے لیے بہانہ چاہیے تھا۔ میں برا تھا لیکن آپ تو ان کی بیوی تھیں کیا آپ کا رشتہ ان کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو وہ آپ کو اس عمر میں تنہائیوں کے حوالے کر کے چلے گئے۔

مراد کی باتوں میں وزن تھا مگر سمیرا بے حد جذباتی ہو رہی تھیں۔ غصے سے کہنے لگیں۔ اچھا تم اپنی منطق اپنے پاس رکھو اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔

جانتا ہوں مجھے بھی آپ کے پاس بیٹھنے کا شوق نہیں ہے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

دھوپ سکندر ہاؤس کے در و دیوار سے رخصت ہو رہی تھی وہ دیر سے برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھی ہوئی لان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ہری بھری بیلیں پیلے پتوں سے ڈھکنے لگی تھیں۔ سارا دن گرد آلود ہوائیں چلتی رہتیں جو دل کی ویرانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیتیں۔ ویسے تو تنہائی کا عذاب جھیلتے ہوئے زمانے گزر گئے تھے لیکن ان دنوں گھر میں رونق اور چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ سناٹوں کا راج نہیں تھا۔ اب تو چاروں بیٹیاں بھی بیاہ کر اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ ثانیہ اور ثامنیہ تو پاکستان سے باہر اپنے شوہر اور بال بچوں کے ساتھ مقیم تھیں۔ نادیہ کی سسرال اسلام آباد میں تھی وہ بھی ایک سال بعد ہی چکر لگایا کرتی اور سب سے چھوٹی بیٹی عافیہ کو اس کی پھوپی زلیخا بڑے چاؤ سے بیاہ کر لے گئی

تھیں اور اسے پلکوں پر بٹھا کر رکھا تھا۔ شاید یہ ان کے صبر اور حوصلے کا قدرت کی طرف سے انعام تھا کہ سب لڑکیاں اپنے گھروں میں خوش و خرم اور شاد و آباد تھیں۔ داماد بھی بڑے لائق، مہذب اور کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

خدیجہ کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیٹی بیاہ کر سات سمندر پار چلی گئی تھی اور اکلوتے بیٹے کو بہو لے اڑی تھی۔ اب حویلی میں مدت سے ان کی پاٹ دار آواز گونجتی نہیں سنائی دیتی تھی۔ جوڑوں کے درد نے انہیں مریض بنا کر مستقل بستر پر ڈال دیا تھا۔ گھر میں نوکروں کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس سے دو گھڑی بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتیں۔ زلیخا بھی بیٹیوں کی شادی کے بعد اپنے نئے مکان میں شفٹ ہو چکی تھیں۔ اس ڈھلتی عمر میں جب سہاروں کی طلب ویسے بھی بڑھ جاتی ہے وہ خود کو بے سہارا محسوس کرتی تھیں۔ حیدر علی ہفتہ میں ایک آدھ چکر لگا لیتے تو بس ایسا لگتا جیسے سخت گرمی، لُو اور حبس میں کوئی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آ کر گزر گیا ہو۔ سارا دن وہ ڈال سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح اِدھر سے اُدھر ڈولتی پھرتیں۔

نہ جانے سائیں حیدر کا فون کیوں نہیں آیا۔ وہ شہتوت کے درخت پر نظریں جمائے سوچ رہی تھیں۔ سورج اپنی نرم کرنوں کو سمیٹ رہا تھا۔ اچانک انہیں ان قدموں کی آہٹ سنائی دی جن کی دھمک وہ سوتے میں بھی اپنے دل پر محسوس کرتی تھیں۔ اُن کا مرجھایا چہرہ کھل اٹھا نوری سے کہنے لگیں۔ بھاگ کر جا نوری سائیں حیدر آ گئے ہیں۔ نوری کیاریوں سے ہرے دھنیے کی نازک نازک پتیاں نوچ کر پلو میں رکھتی جا رہی تھی۔ گھبراہٹ میں اپنا پلو سنبھالتی باہر کی طرف بھاگی۔

اتنی دیر میں وہ مہربانو کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ حیدر علی کو دیکھتے ہی مہربانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ صورت سے مہینوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ چال میں شکستگی تھی اور آنکھوں میں اداسیوں کا غبار چھایا ہوا تھا۔ وہ حیران پریشان سی مستقل ان کی صورت دیکھے جا رہی تھیں۔

مجھ سے پوچھو گی نہیں مہر کہ مجھ پر وہ کون سی قیامت

ٹوٹی جو میں اس طرح اپنے دکھوں کی گٹھری اٹھا کر تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ حیدر علی کی آواز صدمے سے لرز رہی تھی۔

سائیں حیدر یہ آپ کا گھر ہے آپ جب چاہیں یہاں آئیں میں پوچھنے والی کون ہوتی ہوں مگر مجھے آپ کی یہ اُداسی ضرور پریشان کر رہی ہے۔ مہر بانو نے ہمدردی کے لہجے میں جواب دیا۔

ہاں ایک تم ہی تو ہو مہر جو میرا دکھ بانٹ سکتی ہو اور جس کے سامنے میں اپنے دل کا درد بیان کر سکتا ہوں۔

حیدر علی نے افسردگی سے کہا۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کے اوسان ٹھکانے پر آئے تو وہ غمگین لہجے میں اپنے دل کا سارا دل مہر بانو کے سامنے اُنڈیلنے لگے اور پھر آخر میں ان کا ہاتھ تھام کر محبت سے بولے میں تم سے بہت شرمندہ ہوں مہر میں نے تم پر جو زیادتی کی تھی قدرت نے مجھے اس کی بہت بڑی سزا دی ہے کاش میں صبر اور حوصلے سے کام لیتا اور اپنے رب کی دی ہوئی رحمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے بیٹے کی آرزو میں بے چین نہ ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ صدمے سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔

مہر بانو کا دل تڑپ گیا وہ نرم لہجے میں ان کو تسلیاں دینے لگیں۔ حیدر علی کے سلگتے دل پر مہر بانو کے لہجے کی ٹھنڈی پھوار گری تو انہیں قرار سا آ گیا اور پھر جیسے جیسے وقت گزرنے لگا۔ حیدر علی کی بے قراریوں میں کمی آتی گئی انہیں نئی زندگی کی آہٹیں سنائی دینے لگیں اور بجھی بجھی آنکھوں میں چمک لوٹ آئی۔ وہ جب بھی مہر بانو کی طرف دیکھتے ان کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز ہو جاتا اور وہ دل ہی دل میں ان کی عظمت کو سراہنے لگتے۔

کبھی کبھی وہ حیران ہو کر سوچنے لگتے کہ سنگ دلوں کی اس دنیا میں شیشے جیسا شفاف اور نازک دل رکھنے والی اس عورت کا خمیر بھی یقیناً محبت ہی سے اٹھایا گیا ہوگا۔

ویسے تو ان کا غم غلط کرنے کے لیے ڈھیر سارے پیارے رشتے موجود تھے۔ مگر سب سے زیادہ جسے دیکھ کر ان کی اُداسی اور نااُمیدی طمانیت میں بدل جاتی وہ عافیہ کا دو سالہ بیٹا عمیر تھا۔ گھر قریب ہونے کی وجہ سے وہ اکثر اسے لے کر آ جاتی وہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھتے اور گھنٹوں اس کے ساتھ کھیلا کرتے ویسے بھی یہ جگہ ان کے لیے ہمیشہ سے بڑی مانوس تھی وہ تو اس نگری کی ہر گلی کوچے ہر اینٹ پتھر سے واقف تھے۔ یہاں کا آسمان بھی انہیں اپنا اپنا سا لگتا زمین کے ذرے ذرے تک سے اپنائیت کی مہک پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔

اس چھوٹے سے خوبصورت شہر سے ان کی زندگی کی ڈھیروں یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں کی ٹھنڈی ہواؤں نے ان کو کسی شفیق ماں کی طرح بچپن میں ہولے ہولے تھپکیاں دے کر سلایا تھا۔ فضاؤں نے لڑکپن کی پُر پیچ گلیوں سے نکل کر جوانی کے لہکتے گلشن میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اسی سرزمین پر وہ مہر بانو کو دیکھ کر اپنا دل ہار بیٹھے تھے۔ وہ یہاں آ کر کیسے نہ سکون پاتے۔ کبھی کبھی ندامت کی اتھاہ گہرائیاں ان سے اکثر اپنوں سے نظریں ملانے کا حوصلہ چھیننے لگتیں۔ تب ایسے میں وہ اپنی سوچوں کا رخ کسی اور جانب موڑ دیتے۔

وہ روزانہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر کھیتوں کی طرف نکل جاتے دور تک بچھی ہوئی سبزے کی چادر آنکھوں میں عجیب سی ٹھنڈک کا احساس بخش دیتی وہ آگے بڑھتے جاتے۔ موٹے موٹے تنوں سے لپٹی ہوئی نرم و نازک بیلیں ہوا کے شریر جھونکوں سے اٹکھیلیاں کرتی نظر آتیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر سرسوں کے پیلے پیلے پھولوں کی تیز چنچل مہک ان کے دامن سے لپٹی ہوئی ساتھ ساتھ جاتی۔ وہ تھک کر کسی بڑے درخت کے نیچے پتھر پر بیٹھ جاتے۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم سبک رفتار جھونکے ان کی روح پر لگے زخموں کو سہلاتے گزرتے تو دل میں طمانیت کا احساس لہرانے لگتا درخت پر بیٹھے خوش الحان پرندوں کی میٹھی بولیاں ذہن پر وجد سا طاری کر دیتیں سامنے کھجور کے پیڑوں پر لٹکتے ہوئے زرد نارنجی خوشے دیکھ کر انہیں سورۂ رحمٰن کی ایک آیت یاد آ جاتی اور آنکھیں بند کر کے اُس کا ترجمہ دہرانے لگتے۔

”اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“ کچھ دیر بعد جب سورج کی آڑی ترچھی کرنیں پام اور کھجور کے چھدرے پتوں سے چھن کر زمین پر

لوٹنے لگتیں تو وہ چونک پڑتے اور اٹھ کر گھر کی طرف چل دیتے۔ جہاں مہربانو بڑے سے رنگین دسترخوان کے ساتھ آنکھیں بچھائے ناشتے پر اُن کی منتظر بیٹھی ہوتیں۔ وہ نورس کے ہاتھ کے بنے ہوئے دیسی گھی کے خستہ لذیز پراٹھے اور تازہ شکار کیے ہوئے فرائی بٹیر بڑی رغبت سے کھاتے۔ ناشتے سے فراغت پا کر وہ مردانی بیٹھک میں آ کر بیٹھ جاتے جہاں ملاقاتی چھوٹے چھوٹے مسائل لے کر ان کے انتظار میں بیٹھے ہوتے کام کے سلسلے میں ان کا کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے تیسرے دن کراچی آنا جانا لگا رہتا مگر اس کوچۂ ملامت کی طرف رُخ کرتے ہوئے اُن کی روح کانپ جاتی۔

حیدر علی کے جانے کے بعد مراد کو بالکل کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ تھوڑا بہت جو لحاظ یا ڈر تھا وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ سمیرا کو تو وہ کسی گنتی میں ہی نہیں لاتا تھا۔ اس کی زندگی بس لڑکیوں، پارٹیز، دوستوں اور کلب تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر پر ہوتا تو کمرہ بند کر کے لچر، بے ہودہ تہذیب و اخلاق سے گری موویز دیکھنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ سمیرا دل ہی دل میں اسے دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔

ویسے بھی حیدر علی کے جانے کے بعد وہ بالکل بجھ کر رہ گئی تھیں۔ خود ترسی کا شکار سمیرا پہروں آسمان کی لامحدود وسعتوں میں نظریں جما کر نہ جانے کیا کھوجتی رہتیں اب انہیں اپنے مشاغل سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ جو کبھی محفلوں کی جان سمجھی جاتی تھیں اور جن کے بغیر سب کو ہر محفل پھیکی اور بے رنگ لگتی اب دن رات گھر میں تنہا پڑی اپنے مقدر پر آنسو بہایا کرتیں۔ سب سے زیادہ انہیں کوفت کا سامنا اس وقت کرنا پڑتا جب کوئی ان سے حیدر علی کے بارے میں الٹے سیدھے سوال کرتا اس وقت ان کے دل کی گہرائیوں سے بس یہی آواز آتی۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

ڈیفنس کی یہ لق و دق کوٹھی انہیں کاٹنے کو دوڑتی جس کے چپے چپے سے حیدر علی کی یادیں وابستہ تھیں اور جب دل کی بے کلی حد سے بڑھنے لگی تو وہ کوٹھی میں چوکیدار کو چھوڑ کر ناظم آباد کے اس بنگلے میں منتقل ہو گئیں جو حیدر علی نے حال ہی میں بنوایا تھا۔ اتفاق سے حیدر علی جاتے وقت اس کی چابیاں گھر میں بھول گئے تھے۔ مراد وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ ناظم آباد ان دنوں خاصہ غیر آباد علاقہ تھا۔ جہاں مراد کی دلچسپی کے لیے کچھ نہ تھا۔ مگر سمیرا نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی اور یہ کہہ کر اسے خاموش کرا دیا کہ تمہارے لیے یہاں اور وہاں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم کون سا چوبیس گھنٹہ گھر میں رہتے ہو۔

اس دن وہ کار لے کر گھر سے نکلا تو کسی گرلز اسکول کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے ایک لڑکی نظر آ گئی۔ جو بڑے پُروقار انداز میں نپے تلے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر غضب کی کشش تھی اور اس کی بے داغ گوری رنگت سے روشنیاں سی پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کے سر پر سلیقے سے اسکارف بندھا تھا اور دونوں شانوں پر فیروزی کلف دار دوپٹہ پھیلا ہوا تھا۔

مراد وہاں رُک کر کھڑا ہو گیا اور للچائی نظروں سے اُس کے ہوش رُبا حسن کا نظارہ کرنے لگا اگر پچھلا تجربہ ذہن میں محفوظ ہوتا تو وہ کسی گھٹیا حرکت سے گریز کرتا مگر وہ مراد تھا سدا کا بے شرم..... اس نے اپنی کار لڑکی کے پیچھے لگا دی اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ لڑکی نے پہلے تو کوئی توجہ نہ دی۔ مزے سے خراماں خراماں چلتی رہی مگر اچانک اس کی چھٹی حس نے اسے احساس دلایا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے اس نے اپنی چال تیز کر دی اور پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی ایک نامعلوم سا خوف چھلانگ مار کر اس کے وجود میں سرایت کر گیا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی اپنے گیٹ پر پہنچ گئی اور باہر سے کھلنے والا لاک کھول کر گرتی پڑتی گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ اور پھر گیٹ کی جھری سے آنکھ لگا کر باہر کی طرف دیکھنے لگی اور یہ دیکھ کر اس کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ سیاہ رنگ کی کار جسے کوئی نوجوان چلا رہا تھا اور جو اب تک چیونٹی کی رفتار سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ تیزی سے فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے اندر آئی تو نظروں نے سب سے پہلے ماں کو ٹٹولا اور یہ دیکھ کر اس کے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کو ذرا سکون مل گیا کہ ماں کمرے میں موجود نہیں تھیں دوسرے کمرے میں کسی کام میں مصروف تھیں ورنہ اس کی اُڑی اُڑی رنگت اور سراسیمگی دیکھ کر پریشان ہو جاتیں

اور پھر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی وہ اس وقت ویسے ہی ان قدر نروس ہو رہی تھی گھبراہٹ میں سب کچھ اُگل دیتی۔ اس کے بعد ان کا جو جواب ہوتا وہ اس کو رٹا ہوا تھا۔

بس کل سے گھر میں بیٹھ کوئی ضرورت نہیں گھر سے باہر نکلنے کی میں تو پہلے ہی تمہارے گھر سے باہر جانے کے خلاف تھی مگر تم باپ بیٹی میری سنتے کب ہو۔

اب وہ ان کو کیسے سمجھاتی کہ یہ جاب وہ اپنے کسی شوق کے لیے نہیں کر رہی تھی بلکہ اس کا مقصد اپنے ابو کے شانوں کا بوجھ ہلکا کرنا تھا جو مہنگائی کی چکی میں اکیلے پس رہے تھے وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی جا کر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ ذہن اس قدر بوجھل ہو رہا تھا کہ اس نے چینج بھی نہ کیا اور پھر سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆......☆......☆

آفاق احمد کسی سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی سیلری بھی اسی حساب سے تھی۔ بس جیسے تیسے گزارا ہو رہا تھا۔ حالانکہ اگر آفاق احمد چاہتے تو اور لوگوں کی طرح وہ بھی چور راستوں سے اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیتے لیکن وہ ایک دیانت دار اور اصول پرست آدمی تھے۔ ناجائز آمدنی کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے تھے۔

ان کی بیوی کلثوم بھی بڑی نیک اور صابر تھیں۔ ہمیشہ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کی عادی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج تھا کہ چادر ہی اتنی چھوٹی پڑ گئی تھی۔ سر ڈھانکو تو پیر کھل جاتے اور پیر ڈھانکو تو سر ننگا رہ جاتا۔

کرن ان کی اکلوتی لڑکی تھی جو ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ آفاق احمد اپنی بیٹی کو جنون کی حد تک چاہتے اس کے منہ سے نکلی ہر بات ان کے لیے حدیث کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں کہا کرتے میری بیٹی سات بیٹوں کے برابر ہے۔ اس میں کچھ شک بھی نہ تھا کہ کرن واقعی ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں ایک ضرور تھی۔

بچپن سے ہی بڑی حساس اور ذہین تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کا اسے ہمیشہ سے بہت شوق تھا مگر اپنے حالات کو دیکھ کر اس نے بی ایڈ کرنے کے بعد گرلز اسکول میں جاب شروع کر دی تھی اسے اسکول جاتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو چکا تھا مگر ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے اس کو کسی ذہنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اس کوفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''کرن کب تک سوتی رہو گی۔ شام ہونے والی ہے۔'' ماں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ سامنے کھڑکی سے جامن کا درخت نظر آ رہا تھا۔ جس پر دھوپ کی کرنیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔

ہاتھ منہ دھو کر وہ سیدھی کچن میں چلی گئی چائے بنا کر اس نے اپنا پھولدار مگ بھرا اور ماں کے حصے کی چائے کیتلی میں چھوڑ کر اپنے ہاتھ میں چائے سے بھرا مگ لیے اوپر چھت پر آ گئی۔

صاف ستھری بڑی سی چھت پر آ کر اسے ہمیشہ سے بہت سکون ملتا اور اس کا دل اپنے مرحوم دادا کی مغفرت کے لیے دعا گو ہو جاتا جو ورثہ میں یہ مکان ان کے ابو کے نام کر گئے تھے۔

اس نے مگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا جہاں ڈوبتے ہوئے سورج نے وحشت ناک سرخیاں پھیلا رکھی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں میں نمی رچی ہوئی تھی وہ قریب پڑی جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھ کر ہلکے ہلکے سپ لینے لگی اور پھر اس کا دھیان دوپہر والے واقعے کی طرف چلا گیا۔

آخر اس اجنبی کو میرے مکان کی شناخت کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ کسی اچھے بھلے گھر کا لگ رہا تھا کار بھی قیمتی تھی لیکن حرکت گلی کے آوارہ لڑکوں جیسی کی تھی۔ وہ الجھ کر سوچ رہی تھی لیکن ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ جامن کے درخت پر چڑیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا اور چھت پر سرمئی شام اتر آئی تھی وہ خالی مگ لے کر نیچے آ گئی۔

کلثوم نے چاول کی دیگچی دم پر رکھی ہوئی تھی اور کڑھی میں بگھار لگانے کی تیاری کر رہی تھیں گھر میں کڑی پتے اور زیرے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

آفاق احمد کو شروع سے مغرب کی نماز کے فوراً بعد
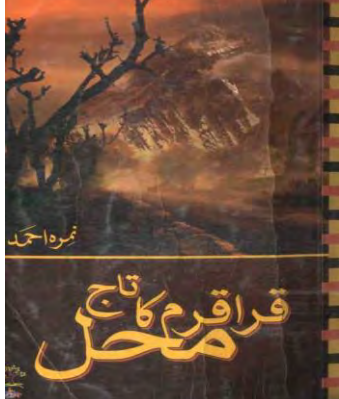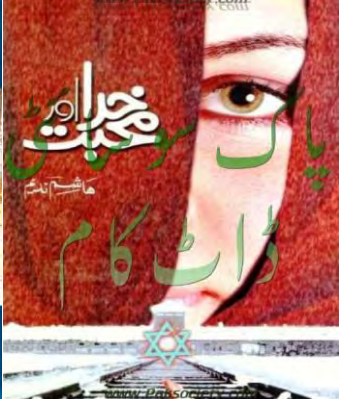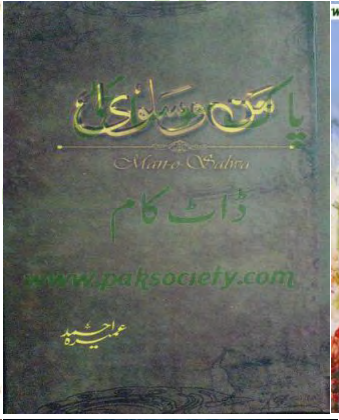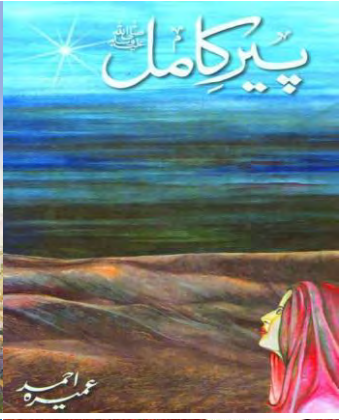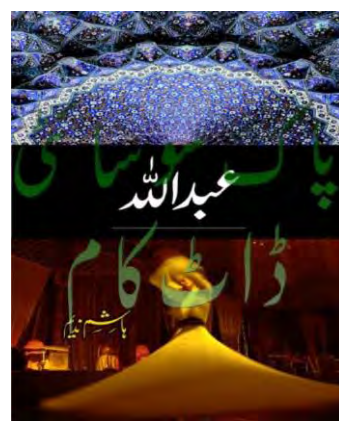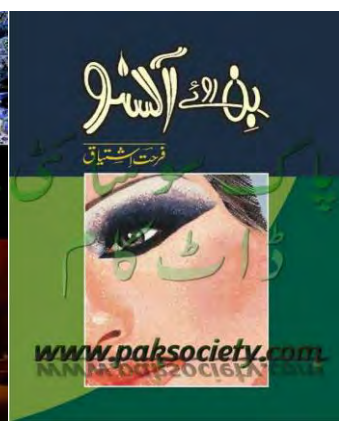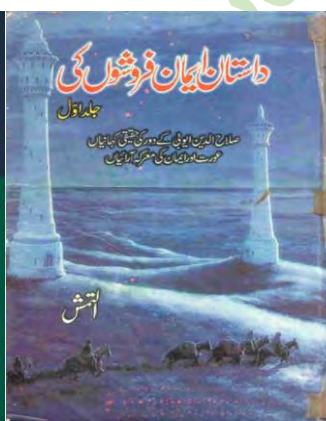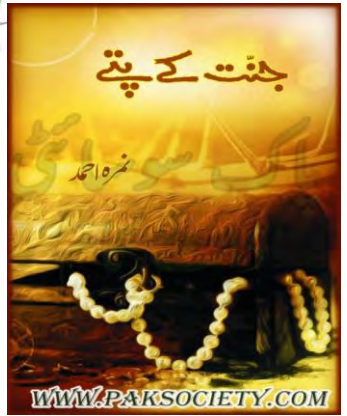
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کھانا کھانے کی عادت تھی۔ وہ نماز کے لیے مسجد جا چکے تھے۔

ان دونوں ماں بیٹی نے بھی ایک ساتھ مغرب کی نماز ادا کی۔ آفاق احمد کے آتے ہی کرن نے تخت پر دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ ایک دم آفاق احمد کو کچھ یاد آ گیا وہ کھانا اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے بولے۔

''ارے بیگم وہ تیسرے نمبر والی گلی میں جو سرمئی بنگلہ ہے جسے تم بھوت بنگلہ کہا کرتی ہو وہ اب انسانوں سے آباد ہو گیا ہے۔''

چلو یہ تو اچھا ہوا ہر وقت اندھیرا پڑا رہتا تھا مجھے تو ادھر سے گزرتے خوف آتا تھا اب کم از کم روشنی تو ہو گی۔ کلثوم خوش ہو کر کہنے لگیں۔ اور پھر پانی کا گلاس منہ سے ہٹاتے ہوئے بولیں۔

''آپ نے پتہ بھی کیا کون لوگ ہیں نئے لوگوں کے بارے میں اتنی معلومات تو رکھنی چاہیے۔''

ہاں مسجد میں لوگوں سے یہ سنا ہے کہ کوئی سیٹھ حیدر علی ہیں جو خود اپنی بڑی بیگم کے ساتھ سندھ میں رہتے ہیں۔ یہاں ان کی دوسری بیوی اور ایک جوان بیٹا ہے۔ جو یہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ آفاق احمد سے تفصیل سن کر کرن کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یقیناً وہ کار والا وہی امیرزادہ ہوگا۔

چلو اچھا ہے اگر وہ اس محلے میں رہنے کے لیے آیا ہے تو کسی ایسی ویسی حرکت کرنے سے پہلے اس کو سو بار سوچنا ضرور پڑے گا۔ اس خیال سے اس کو کافی تسلی ہو گئی حالانکہ یہ بھی اس کی غلط فہمی تھی۔

واقعی دو ہفتے خیریت سے گزر گئے مگر ایک رات جب وہ گھر کے کام نمٹا کر صبح اسکول کے لیے کپڑوں پر استری کر رہی تھی کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ کرن کا دل ہول گیا۔ رات کے گیارہ بجے تو آج تک بھی کسی نے اس کو فون نہیں کیا تھا۔

اسلام آباد والے خالو کی طبیعت کافی دن سے خراب چل رہی تھی۔ کہیں ان کو تو کچھ نہیں ہو گیا اس نے استری کا سوئچ بند کر کے فون اٹھا لیا اور جیسے ہی اس نے ڈرتے ڈرتے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے کسی کی مردانہ اجنبی آواز میں السلام علیکم کہنے کی آواز آئی۔

کرن کے سارے بدن میں غصے کی لہر دوڑ گئی اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''کون ہو تم تمہیں اتنی تمیز بھی نہیں کہ اتنی رات کو کسی شریف گھر میں فون نہیں کیا جاتا۔''

ریلیکس مس کرن آفاق دیکھیے اتنا غصہ صحت کے لیے مضر ہوتا ہے میں آپ کا نیا پڑوسی مراد بول رہا ہوں۔''

کرن غصے سے چلبلا کر بولی۔

''تم مراد ہو یا نا مراد مجھے اس سے کوئی غرض نہیں میں تمہارا بائیو ڈیٹا نہیں پوچھ رہی ہوں یہ بتاؤ تم کو میرا فون کہاں سے مل گیا۔

''چھوڑیں بس آپ یہ جان کر کیا کریں گی بس یوں سمجھ لیں کہ جن کے جذبوں میں سچائی ہو انہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔''

کرن کھول کر رہ گئی اس نے زور سے شٹ اپ کہتے ہوئے فون کاٹ دیا۔

یہ صورت حال کرن کے لیے انتہائی پریشان کن تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرے جو بیٹھے بٹھائے اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ سب سے زیادہ تو اس کو اس بات کی پریشانی تھی کہ وہ اس بارے میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ ماں سے کہنے کا نتیجہ تو اسے معلوم تھا اور باپ کے آگے شرم سے زبان نہ کھلتی۔

اس دن اسکول میں بھی وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ لنچ بریک میں وہ خاموشی سے آ کر اسکول کے گراؤنڈ میں بینچ پر بیٹھ گئی اسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ اس کی کولیگ اور بچپن کی بے تکلف سہیلی نوشین کب دھیرے سے آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ اس کے آہستہ سے کھنکارنے پر کرن چونک پڑی۔

''خیر تو ہے کیا سوچا جا رہا ہے؟ ویسے تمہاری محویت تو کچھ اور ہی بتا رہی ہے۔ لگتا ہے کہ تم نے راتوں کو جاگ جاگ کر تارے وغیرہ گننا شروع کر دیے ہیں بھئی ہمیں بھی تو بتاؤ یار وہ خوش نصیب آخر ہے کون؟'' نوشین کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''فضول باتیں مت کرو نوشی، یہ خرافات تمہیں کو مبارک ہوں۔ دنیا میں اس کے علاوہ بھی بہت سے غم

ہیں۔" کرن نے تیوریاں چڑھا کر غصے سے جواب دیا۔

"سوری یار میں مذاق کر رہی تھی۔ اچھا خیر اب بتاؤ کہ کیا بات ہے۔" نوشین سنجیدہ ہو کر بولی۔

کرن نے سوچا نوشین کو بتانے میں کوئی حرج نہیں ہو سکتا ہے وہی اس کے مسئلے کا حل تجویز کر سکے اس نے نوشین کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

کمال ہے کرن اتنی سی بات پر بیٹھ کر منہ بسورنے لگیں ارے ڈیئر یہی تو ہم جیسی مڈل کلاس لڑکیوں کا بڑا المیہ ہے کہ ہم اگر اپنی مجبوریوں کے تحت گھروں سے قدم نکالیں تو یہ مجنوں کے بیٹے اور فرہاد کے جانشین ہر جگہ ہمارا راستہ روک کر کھڑے رہتے ہیں۔ نوشین نے کہا۔

"مگر نوشین ان سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔" کرن روہانسی ہو رہی تھی۔

"اس کی یہی ایک صورت ہے کہ تم کو ہمت سے کام لینا پڑے گا کبھی اس پر اپنی کمزوری نہ ظاہر کرنا ورنہ وہ تمہیں ہر طرح بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔" نوشین نے تجربہ کارانہ انداز سے کہا۔

"ہاں یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" کرن مری مری آواز سے بولی۔ بریک ٹائم ختم ہو رہا تھا دونوں اپنی اپنی کلاسوں میں چلی گئیں۔

مراد کو اس محلے میں آئے بیس پچیس دن ہو رہے تھے۔ مگر کرن کا تصور ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن سے نہیں ہٹ رہا تھا۔

وہ اپنی کیفیت پر خود بھی حیران تھا۔ آج تک اس نے کبھی کسی لڑکی کو اس طرح ذہن پر طاری نہیں کیا تھا۔ لڑکیاں تو خود ہی اس کی چارمنگ پرسنلٹی پر مرتی تھیں۔

جس لڑکی سے ہنس کر بات کر لیتا وہ خود کو خوش نصیب سمجھتی یہ کون سی انوکھی لڑکی تھی جو اس کے سائے سے بھی بدکتی تھی۔

ویسے تو اس کے لیے کرن کا حصول اتنا مشکل نہ تھا جب چاہتا اپنے دوستوں سے اس کو اٹھوا کر ہوس کی آگ بجھا سکتا تھا مگر نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جو اس کو کرن کے ساتھ زیادتی کرنے سے روک رہا تھا۔

وہ اس کو باعزت طریقے سے اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا خواہش مند تھا اور اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی دور کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اس سے پہلے وہ کرن کی مرضی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

وہ کرن کے لیے اس حد تک بے قرار تھا کہ اس کو محض اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس محلے کے لڑکوں سے دوستی گانٹھنا پڑی۔ اور اس کا سارا جغرافیہ معلوم کر لیا ایک لڑکے نے تو مراد کو کرن کا موبائل نمبر بھی بہن کی ڈائری سے نوٹ کر کے اسے لا کر تھما دیا۔ اس کی بہن کرن کی اسٹوڈنٹ تھی اور اسی کے اسکول میں پڑھتی تھی لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا اور کرن نے بڑی کرختگی سے بات کر کے فون بند کر دیا۔

ایک دن اس نے ہمت کر کے کرن کو کسی بچے کے ہاتھ سرخ گلاب کا گجے اور کارڈ بھیجا مگر اس ظالم لڑکی نے کارڈ کو بغیر پڑھے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دیا اور پھولوں کو اپنی سینڈل کی ایڑی سے کچلتی آگے بڑھ گئی۔

وہ کار میں بیٹھا دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اپنے جذبوں کی تحقیر پر وہ غصے سے تلملا گیا اس دن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کرن کو ایسا سبق سکھائے گا کہ وہ تمام عمر کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔ مگر پھر جانے کیا سوچ کر وہ یہ انتہائی قدم اٹھانے سے باز رہا۔

اس نے یہ بات اپنے جگری دوست نوید کو بھی بتائی تھی تو اس نے مراد کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم کو اس لڑکی کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کس دن کے لیے ہیں۔ اگر اس کی شادی کسی اور سے بھی ہو گئی تو ہم اس کے شوہر کو موت کی نیند سلا کر اسے بھرے مجمع سے اٹھا لائیں گے۔

لیکن مراد تو اس کو اس کی خوشی اور اس کی مرضی سے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ اس کو امید تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن کرن کے دل کی بنجر زمین پر اپنی محبت کا بیج بو دے گا۔ اور اگر وہ سیدھی طرح راہ راست پر نہ آئی تو پھر اسے کوئی اور راستہ اختیار کرنے میں بھی تامل نہ ہو گا مگر وہ اس سے دست بردار ہونے کو کسی صورت میں تیار نہ تھا۔

اور پھر ایک دن قسمت سے اس کو یہ موقع خود بخود مل گیا کہ وہ کرن سے بات کر سکے۔ اس دن کرن اسکول پہنچی تو موسم کے تیور بہت خطرناک ہو رہے تھے آسمان پر

سیاہ بادل منڈلا رہے تھے اور وقفہ وقفہ سے دھیمی دھیمی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ کرن اسکول کے گیٹ سے باہر نکل ہی رہی تھی کہ ایکدم سے بارش نے زور پکڑ لیا وہ پناہ لینے کے لیے کسی مکان کے نیچے آ کر کھڑی ہوگئی۔

اس وقت نہ جانے کدھر سے مراد کی گاڑی آ کر اس کے قریب رک گئی۔ کرن کا دل دھک سے ہوگیا۔ ہاتھ پیر خوف سے ٹھنڈے پڑنے لگے اور گلا خشک ہوگیا۔

کرن آج تمہیں میرے ایک سوال کا جواب دینا پڑے گا وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ کرن کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی اس نے ہمت کر کے مراد پر چبھتی ہوئی نظر ڈالی اور تلخ لہجے میں کہنے لگی۔ آخر آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔

لیکن میں تم سے یہ پوچھے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گا کہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہو۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ تمہاری زندگی میں کوئی اور آ چکا ہے۔

کرن اس کی اس بات پر بڑی طرح جھنجلا گئی اس نے غصے سے کہا۔

مسٹر اس قسم کے ذاتی سوال پوچھنے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔ اور نہ میں ان فضول باتوں کا جواب دینا ضروری سمجھتی ہوں۔"

"لیکن یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے یہ تو تم کو بتانا ہی پڑے گا۔" مراد نے سرخ سرخ آنکھیں نکال کر اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ کرن ٹپٹا کر رہ گئی۔ اس نے اپنی نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔

"میری بات چھوڑیں لیکن آپ جو کچھ چاہتے ہیں وہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے یہی تو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔" مراد نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ میں ایک غریب مگر شریف اور غیرت مند باپ کی بیٹی ہوں ہمارے گھر بیٹیوں کو کسی دولت مند کی خوشی کے لیے بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا۔ اس لیے میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ آپ اپنی سوسائٹی کی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر ناطہ جوڑ لیں اور پلیز میرا پیچھا چھوڑ دیں۔

میں کسی صورت بھی آپ کے قابل نہیں ہوں۔ وہ اس کے ماتھے کی شکنوں کی پروا کیے بغیر نہ جانے کیسے اتنا سب کچھ کہہ گئی۔

مراد کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ اس نے ذرا جھنجلا کر کہا۔ لیکن میں ان فضول باتوں کو نہیں مانتا۔ میں ہر اس دیوار کو گرانے کی ہمت رکھتا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہوگی۔ میں تمہیں ہر حال میں اپنا کر رہوں گا اور اس کے لیے مجھے کسی حد تک بھی جانا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ مجھے میرے اس ارادے سے کوئی نہیں باز رکھ سکتا نہ میرے پیرنٹس نہ تمہارے والدین اور نہ تم اس نے کرن کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آپ اپنی امارات کے زعم میں بڑھ چڑھ کر بول تو رہے ہیں لیکن آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ زندگی کے یہ سنجیدہ معاملے گن پوائنٹ پر نہیں طے کیے جاتے۔" کرن نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ حقیقت تلخ ضرور تھی مگر مراد کو اس کی سچائی سے بھی انکار نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ کرن کو بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کرن کے بغیر زندہ رہنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے اپنے تڑپتے مچلتے دل کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

کرن میں تم سے صرف التجا کر سکتا ہوں زور زبردستی کا تو میں خود بھی قائل نہیں ہوں۔ کیا تم میرے دامن کو خوشی کے پھولوں سے نہیں بھر سکتیں۔ بولو کرن تمہاری ایک ہاں یا ناں پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔" اس کے لہجے سے ٹوٹ کر دکھ برس رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے کرن ڈگمگا گئی لیکن اس نے اپنے سنسناتے دماغ پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"مراد صاحب میں آپ کو کوئی خوب صورت دلاسا نہیں دے سکتی۔ لیکن آپ سے ایک التجا ضرور کر سکتی ہوں۔ پلیز آپ اس طرح بار بار میری راہوں میں آ کر میری بدنامیوں کا باعث نہیں بنیں۔"

مراد نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کرن کی طرف دیکھا نہ جانے کیوں اسے اب لگا جیسے یہ جملہ ادا کرتے وقت کرن کی نگاہوں میں وہ نفرت اور غصہ نہیں تھا۔ وہ ایک بوجھل سانس لیتے ہوئے سامنے والی روش میں لگے ہوئے

اونچے اونچے سرخ پھولوں والے درختوں کو دیکھنے لگا۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کرن کہ آئندہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' مراد نے اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''تھینک یو مراد صاحب کرن کے چہرے پر ہلکا سا خوشی کا تاثر ابھر آیا۔ اب میں چلتی ہوں بارش رُک گئی ہے۔ اس نے چلنے کا قصد کرتے ہوئے کہا۔ اس کے نرم گلابی چہرے پر ٹھہرے ہوئے بارش کے قطرے اور گالوں پر سایہ فگن گھنیری پلکیں مراد کے دل کو ڈانواڈول کیے دے رہی تھیں۔ اس کے لیے کرن کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو رہا تھا۔

کرن نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا۔ جیسے ہی اس کی نظریں مراد کی نظروں سے ٹکرائیں کرن کی نظریں بے ساختہ نیچے جھک گئیں۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی مراد وہیں کھڑا سگریٹ پھونکتا رہا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے لیے یہ احساس بھی خاصہ خوش کن تھا کہ کرن اس پر نفرت اور غصے کے تیر برسائے بغیر خاموشی سے چلی گئی تھی۔

ایک عجیب سا احساس اس نے اپنی رگوں میں سرایت کرتا ہوا محسوس کیا۔ کیا کار میں لگا ہوا کیسٹ پلیئر آن کر کے اس نے جھٹکے سے کار اسٹارٹ کر دی۔ احمد رشدی کی خوبصورت سحر انگیز آواز نے اس پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دی۔

بے کل رات بتائی
بے چین دن گزارا
کسی آس پر نہ جانے
ہم نے تجھے پکارا
کسی گیت میں کسی آہ میں
یونہی تو بان ہیں راہ میں
کبھی اجنبی کبھی آشنا
کہیں دھند میں کہیں دھوپ میں

کار تیزی سے دوڑاتا ہوا گھر پہنچا تو وہاں افراتفری پھیلی تھی۔ سمیرا اپنی نگرانی میں ملازم سے گھر کی صفائی کروا رہی تھیں۔ کھانے کے کمرے میں قیمتی ڈنر سیٹ میز پر رکھا تھا جو خاص موقعوں پر نکالا جاتا تھا۔ کرسٹل کے بڑے سے گلدان میں گلاب کے خوش رنگ پھول مہک رہے تھے اور کچن سے بہت اچھی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔

''معلوم ہوتا ہے آج کوئی خاص مہمانوں کو انوائٹ کیا گیا ہے۔ مراد نے بالوں پر جلدی جلدی برش پھیرتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

''ہاں بس خاص ہی سمجھو تمہارے ماموں کے دوست نیورو سرجن عارف ضیاء کو آج میں نے ڈنر پر انوائٹ کیا ان کے ساتھ شیبا بھی آ رہی ہے۔ بڑی کیوٹ لڑکی ہے اس سال ایم بی اے کر کے فارغ ہوئی ہے۔ تم کہیں جانا نہیں گھر ہی پر رہنا۔'' سمیرا کے لہجے سے خوشی جھلکتی پڑتی تھی۔

''لیکن میرا یہاں رہنا کیوں ضروری ہے؟'' مراد نے حیرانی سے سوال کیا۔

اس لیے کہ میں نے شیبا کے ساتھ تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور آج اس کو اس سلسلے میں بلایا ہے تاکہ تم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لو۔ آپس میں باتیں کر کے ایک دوسرے کے خیالات اور پسند ناپسند معلوم کر لو۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

لیکن ممی آپ کو یہ فیصلہ کرتے وقت مجھ سے تو پوچھنا چاہیے تھا۔ مراد نے شکایتی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ سمیرا کے چہرے پر ناگواری کے اثرات چھا گئے۔ انہوں نے کہا ''مراد میں تمہاری ماں ہوں تمہارے مستقبل کے لیے مجھ سے زیادہ بہتر اور کون سوچ سکتا ہے۔''

''یہ بات نہیں ممی دراصل میں اپنے لیے لڑکی پسند کر چکا ہوں۔'' مراد نے سر کھجاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

سمیرا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ بے یقینی سے مراد کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔ مگر تم نے مجھ سے پہلے اس کا تذکرہ کیوں نہیں کیا کون لڑکی ہے کہاں رہتی ہے۔ خاندان کیا ہے۔ والد کیا کرتے ہیں۔ وہ ایک سانس میں ڈھیروں سوال کر گئیں۔

(اس خوبصورت ناول کی دوسری اور آخری قسط اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

اللہ کا فرمان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جو اس کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی بڑی آفت آپڑے یا دردناک عذاب پہنچے۔ (سورۃ نور)

دوستی

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب حالت سجدہ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا تم سجدے میں خوب دعائیں کیا کرو۔''

غزالہ رشید۔ کراچی

غیبت

کوئی طبیب کہتا ہے۔
بڑا گوشت صحت کے لیے مضر ہے۔
تو کوئی کہتا ہے بکرے، مرغی، مچھلی کا۔
لیکن......
سب سے زیادہ مضر اپنے بھائی کا گوشت ہے۔
جو غیبت کرکے کھایا جاتا ہے۔

پروین شیروانی۔ کراچی

صبر

پھر یوں ہوا کہ صبر کی انگلی پکڑ کر ہم
اتنا چلے کے راستے حیران رہ گئے

محمد زاہد۔ چکوال

لطیفہ

اسکول ٹیچر نے مناسب سمجھا کہ اپنے شاگردوں کو بجلی کے بارے میں بتانے کے لیے روزمرہ زندگی میں سے مثالیں دی جائیں۔ چنانچہ انہوں نے شاگرد کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور کہا بتاؤ اگر میں پنکھے کا بٹن دباؤں اور پنکھا نہ چلے تو اِس کا کیا مطلب ہے؟
ذہین شاگرد نے جواب دیا۔ ''یہی کہ آپ نے بجلی کا بل نہیں دیا۔''

فضا احمد۔ اسلام آباد

اچھی باتیں

☆......شہنائیاں اور اداسیاں بہت درد ناک ہوتی ہیں۔

☆......خوش اخلاقی اور انکسار میں ہی آپ کے لیے کامیابی ہے۔

☆......اگر آپ کی بات متعلقہ شخص تک کسی تیسرے فریق کے ذریعے پہنچتی ہے تو شاید الفاظ نہ بدلیں مگر لہجہ ضرور بدل جائے گا۔

راسب۔ لاہور

مقدمہ

سوچتا ہوں کچھ دوستوں پر مقدمہ ہی کردوں
اس بہانے ہر تاریخ پر ان سے ملاقات تو ہوگی

تابش علی۔ سیالکوٹ

براہِ راست

دو معزز اور خوش لباس خواتین ایک بڑی کمپنی کے دفتر میں داخل ہوئیں۔ باس کے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے نہایت شائستہ انگریزی میں کہا۔

''جناب ہماری تنظیم راہ سے بھٹکی ہوئی خواتین کی اصلاح کے لیے کام کرتی ہے کیا آپ اس سلسلے میں چندہ دینا پسند کریں گے؟''

''میں چندہ ضرور دوں گا لیکن آپ کے توسط سے نہیں۔ میں براہِ راست یہ نیکی کرنا چاہوں گا۔'' باس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ثمرہ علوی۔ پشاور

سادگی

مشہور شاعر نظامی نے کسی مشاعرے میں ایک خاتون کو دیکھا اور حسبِ عادت ہزار جان سے اس پر فدا ہو گئے۔ مشاعرے کے بعد موصوف اس خاتون کے پاس گئے اور کہنے لگے۔

''اے دشمنِ ایمان و آگہی کیا تم یہ گوارا کرو گی کہ میرے دل کے مرتعش جذبات تمہارے پاکیزہ عطر بیز تنفس کو آمد شدہ سے ہم آہنگ ہو سکیں۔''

بیچاری خاتون اس انداز بیان کو بالکل نہ سمجھ سکیں اور حیرت سے بولی۔

''آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

اب باکمال شاعر نے حقیقت پسندانہ انداز بیان میں کہا۔

''میں چاہتا ہوں تم مجھ سے شادی کر لو اور میرے بچوں کی ماں بننا گوارا کرو۔''

خاتون نے چند لمحے سوچا اور حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

''کتنے بچے ہیں آپ کے؟''

آفتاب۔ لندن

مثالی انسان

مثالی انسان وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ مروت اور احسان کا سلوک روا رکھے، اپنے پاس سے کچھ دینے میں راحت اور دوسروں سے کچھ لینے میں عار محسوس کرے، فطرات میں خوامخواہ نہ اُلجھے مگر وقت پڑنے پر جان کی بازی لگا دے۔

میمونہ حسن۔ شاہدرہ

ایک شعر

بستیاں دور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دم بہ دم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

شازیہ۔ ملتان

خودکشی

کسی شخص کا اپنے آپ کو قصداً اور غیر قدرتی طریقے پر ہلاک کر لینے کا عمل خودکشی کہلاتا ہے۔ 85 فیصد لوگ دماغی خرابی کی وجہ سے خودکشی کرتے ہیں۔ 15 فیصد سے کم ایسے لوگ ہیں جو (......) بیماری کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو ہلاک کرنے والوں کا تعلق بھی دماغ کے عدم توازن سے ہی ہوتا ہے۔ عورتوں کے مقابلے میں مرد اور حبشیوں کے مقابلے میں گورے یعنی سفید فام زیادہ خودکشی کرتے ہیں۔

صبا ذیشان۔ کراچی

پاگل

پاگل خانے کے ڈاکٹر نے ہمارا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ہمیں پاگل قرار دے دیا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے۔

''دیکھو بھائی اس زمانے میں جو سچ بولتا ہے بلاشبہ وہ پاگل ہے۔ سچ بولنے والے تو کبھی کے دنیا سے اٹھ گئے۔ سچ بولنے کے جرم میں سقراط زہر پی کر مر گیا۔ منصور پھانسی پا گئے، عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا دیا۔ سچ

پوچھو تو سچ پیغمبروں کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھ گیا۔
ڈاکٹر کی بات نے ہمیں قائل تو کر دیا۔
''لیکن ہم نے کہا کہ ہم پاگل خانے میں نہیں رہنا چاہتے۔'' ڈاکٹر نے اس کی ایک ہی صورت بتائی۔
''اگر تم وعدہ کرو کہ کبھی سچ نہ بولو گے۔ مظلوم کی طرف داری نہ کرو گے، کوئی کام ایمانداری سے نہ کرو گے تو میں تمہیں ابھی عقلمندی کا سٹیفکیٹ دیتا ہوں۔''
ہم نے کہا۔ ''سچا وعدہ تو نہ کریں گے کہ یہ تو پاگل پنا ہے۔'' ڈاکٹر خوش ہو گیا اور ہمیں پاگل خانے سے رہا کر دیا۔

کامران شیخ۔ پنڈی

سڑک

ماں بچے سے: ''منے یہ بتاؤ اگر بہت سے گدھے ایک ساتھ ہوں تو انہیں کیا کہیں گے؟''
بچہ: ''سڑک......!''

سدرہ شیخ۔ پنڈی

انتساب

ایک مصنف نے اپنی کتاب کا انتساب لکھا۔
''پیاری بیوی کے نام...... جس کی غیر موجودگی میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔''

فائزہ خان۔ اٹک

سنہری حروف

☆......ظرف وسیع ہو تو کسی تعلق کو کبھی موت نہیں آتی۔
☆......لالچ سے ذلت اور پرہیزگاری سے عزت حاصل ہوتی ہے جو دو گے وہی لوٹ کے واپس آئے گا۔
☆......تلخ رویے دلوں میں نفرت پیدا کرتے ہیں۔
☆......اپنے عمل درست کر لو اعمال خود درست ہو جائیں گے۔
☆......دوسروں کی قدر کرو تمہاری قدر خود بخود ہو گی۔

صابر رحمٰن۔ ہالا

ہماری پولیس

ہماری پولیس بہت اچھی اور فرض شناس ہے ہمیشہ چوروں کے پیچھے ہوتی ہے۔ لیکن پتہ نہیں لوگ اسے پروٹوکول کیوں کہتے ہیں۔

رازِ عدنان۔ بحرین

زندگی

زندگی ایک کھلونا ہے آخر اس کو ٹوٹ ہی جانا ہے۔ اچھا ہو کہ یہ کسی کے کام آ کر ہی ٹوٹ جائے۔

نارہ۔ ناروے

احتیاطاً

''اس آدمی سے تمہارا جھگڑا ہو رہا تھا تو اس نے تمہیں کیا کہا؟'' تھانیدار نے ملزم سے پوچھا۔
''ناہنجار...... خبط الحواس۔'' ملزم نے جواب دیا۔
''ان الفاظ کا مطلب جانتے ہو۔'' پولیس افسر نے ملزم سے کہا۔
''مجھے معلوم نہیں لیکن میں نے احتیاطاً اسے ایک لات رسید کر دی تھی۔'' ملزم نے سینہ تان کر کہا۔

زینب فضل۔ کوئٹہ

ایک شعر

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

فرزانہ اقبال۔ تربت

یاد رکھنے کی بات

یاد رکھیں اگر آپ کسی کی تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ تو پھر ترقی بھی نہیں پا سکتے۔

علیشبہ کریم۔ کوہاٹ

انسان

بے وقوف اور سمجھدار انسان میں صرف اتنا فرق

ہوتا ہے کہ سمجھدار کو اپنی حدود کا پتہ ہوتا ہے۔

منور علی۔ساہیوال

میں اُس دن لوٹ آؤں گی

میں اُس دن لوٹ آؤں گی
مری دھرتی پہ جب نکلے گا
سورج، امن خوشحالی، محبت کا
میں اُس دن لوٹ آؤں گی
ملے گا جب ہم وطنوں کو
انصاف آسانی سے
اُس دن لوٹ آؤں گی
اندھیرے ختم ہو جائیں گے گلیوں سے
ملے گا عورتوں کو حق بھی جینے کا
ملے گی بچوں کو تعلیم سب کے ہی
میں اُس دن لوٹ آؤں گی
مری دھرتی پہ جب نکلے گا
سورج، امن، خوشحالی، محبت کا
میں اُس دن لوٹ آؤں گی

شاعرہ: سعدیہ سیٹھی۔لندن

دعا

دعا کے تین پہلو ہوتے ہیں۔
یا تو قبول ہوتی ہے۔
یا آخرت کے لئے ذخیرہ کر لی جاتی ہے۔
یا مصیبت کو ٹال دیتی ہے، مگر رد نہیں ہوتی۔

عمرانہ۔کراچی

شور

سکے ہمیشہ بہت شور کرتے ہیں مگر کاغذ کے روپے بالکل آواز نہیں نکالتے تو جب زندگی میں آپ کو مرتبہ ملے تو اپنے اندر انکساری اور خاموشی پیدا کریں۔

نازیہ مجید۔حیدر آباد

جمعۃ المبارک

زم زم جیسا کوئی پانی نہیں......
نماز جیسی کوئی عبادت نہیں......
قرآن جیسی کوئی کتاب نہیں......
کلمہ جیسی کوئی دولت نہیں......

اور......

جمعہ جیسا کوئی دن نہیں......

فضیلہ کریم۔زیارت

محبت

موسم بہار میں، میں اور محبت پہلو بہ پہلو سیر کریں گے۔ ہم دونوں ٹیلوں اور گھاٹیوں کے درمیان گیت گائیں گے۔ بنفشہ اور گلاب کے پھولوں سے پر بہار زندگی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ گرمیوں کے موسم میں، میں اور محبت تھک کر معصوم بچوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سو جائیں گے۔ ہمارا بستر سبزہ اور چادر آسمان ہوگا۔

خزاں کے موسم میں، میں اور محبت انگور کے باغوں میں جائیں گے اور ان درختوں کو دیکھیں گے جنہوں نے اپنا زرد لباس اتار دیا ہوگا اور سمندر کی طرف جاتے پرندوں پر غور کریں گے۔

سردیوں کے موسم میں، میں اور محبت آتش دان کی آگ کے پاس بیٹھ کر ماضی کی کہانیاں سنائیں گے اور گزری ہوئی قوموں اور قبیلوں کی داستانیں دہرائیں گے۔

جوانی میں مجھے یہ محبت تہذیب سکھائے گی اور بڑھاپے میں میرا بازو بنے گی۔ محبت تمام عمر میرے ساتھ رہے گی۔ (خلیل جبران)

پلوشہ محمود۔پشاور

ایک شعر

بھائی جیتے رہیں ہزار برس
اور بہنیں دعائیں کرتی رہیں

شاعر: اظہر حسیب۔کراچی

☆☆......☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
صائمہ اکرام
عُشنا کوثر سردار
اشفاق احمد
نمرہ احمد
سعدیہ عابد
نبیلہ عزیز
نسیم حجازی
فرحت اشتیاق
عفت سحر طاہر
فائزہ افتخار
عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو
تنزیلہ ریاض
نبیلہ ابر راجہ
ہاشم ندیم
نگہت سیما
فائزہ افتخار
آمنہ ریاض
مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ
سباس گُل
عنیزہ سید
مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ
رُخسانہ نگار عدنان
اقراء صغیر احمد
علیم اُلحق
رفعت سراج
اُمِ مریم
نایاب جیلانی
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

شب لہجے شبنمی آوازیں

کورا کاغذ

ورق ہے کورا...... نہ کورا پڑھنا
ہر اک سطر کو
بغور پڑھنا
کہیں پہ گیلا نشاں ملے گا
کہیں پہ خط کچھ مٹا ملے گا
کہیں پہ جذبے جذب ہوں گے
کہیں پہ حرفِ گلہ ملے گا
محبتیں بے شمار پڑھنا
ہر اک لمحہ انتظار پڑھنا
ہیں خواہشیں ناتمام پڑھنا
خواب ٹوٹے ہزار پڑھنا
صلیب چڑھ چکی امیدیں
کہیں بھی تیری خطا نہیں ہے
وفا کی بیری پہ دنیا ساری
جفا پہ کوئی سزا نہیں ہے
عجیب دستورِ عاشقی ہے
کہ تشنگی ہی زندگی ہے
ابھی ہوں زندہ...... ضرور پڑھنا
یہ کورا کاغذ...... نہ کورا پڑھنا!

شاعرہ: خولہ عرفان۔کراچی

اُداس لمحے

اُداس سے لمحوں کی اُداس سی کہانی ہے
گہری جھیل میں جیسے ٹھہرا پانی ہے
زندگی پیار کے انتظار میں گزار دی
اس دل پہ غموں کی حکمرانی ہے
بچھڑ کر کسی سے بے مقصد زندگانی ہے

بیچ سمندر میں اپنی کٹی بادبانی ہے
کرب اور بڑھ جاتا ہے ہم دیکھیں جب
رات ہے گہری اور چاند کے گرد چاندنی ہے
باہر ہے روشنیوں کے قافلے رواں دواں
گھر میں اندھیروں کی راج دھانی ہے
اُداس سے لمحوں کی اُداس سی کہانی ہے
گہری جھیل میں جیسے ٹھہرا پانی ہے

شاعرہ: شبانہ نسیم۔کراچی

ہم تم چاہیں یا نہ چاہیں

جسموں کے آئینے میں
میری اور تمہاری روحیں
جب ملتی ہیں
لفظوں کے رنگین اُجالے
آسمان کو ڈھک لیتے ہیں
آنکھوں کے موہوم اشارے
منظر دھندلا کر دیتے ہیں
پھر یہ منظر سو جاتا ہے
سب کچھ غائب ہو جاتا ہے
جسموں کے سارے آئینے
دیکھو تو حیرت خانے میں
میری اور تمہاری روحیں
ان حیرت خانوں کے اندر
جسم کے جامے ڈھونڈ رہی ہیں
ان جاموں سے باہر رہ کر
میری اور تمہاری روحیں
کب تک یہ دکھ سہہ سکتی ہیں

ہم تم چاہیں یا نہ چاہیں
ان روحوں کو
آخرکار رو ہیں جانا ہے
جسم کے گہرے سناٹے میں
لمس کے اندھے ویرانے میں
شاعرہ: نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ۔ سیالکوٹ

یاد کا دریا

آؤ! یادوں کے دریا کے کنارے
ننگے پاؤں چلتے ہوئے
خود کو دریافت کرنے کی خواہش لیے
چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں نہاتے ہوئے
تاروں کی چھاؤں میں
ہم دونوں ہاتھ تھامے ہوئے
یخ بستہ ہوا کی چادر اوڑھے ہوئے
پھر سے کہیں دور نکل جائیں
اور پھر کبھی بھی لوٹ کر نہ آئیں
شاعرہ: شمسہ قمر۔ کراچی

پیامبر

تمہاری آنکھیں
کھلی کتاب لگتی ہیں
اور مقدس اتنی
جتنے آسمانی صحیفے
اپنی آنکھوں سے
مرے دل پر
دستک دینے والے
تم مری محبت کے
پیامبر ہو
شاعر: علی رضا عمرانی۔ سجاول

سوغات

اب کی عید پہ ساجن مورے
ہم کو کیا تم بھیجو گے
لال، ہری، ست رنگی چوڑی
دھانی رنگ کا سوٹ
کنگن، گجرے، بیلے کے
گیروے رنگ کے ہار
اب کی عید پہ ساجن مورے
یہ سب بھیج سکو نہ تم گر
بس تم خود آ جانا
تم آ جانا...... میں سمجھوں گی
چاند عید کا آج گگن سے
میرے آنگن اترا ہے
اب کی عید پہ ساجن مورے
دینا یہ سوغات
شاعرہ: شازلی سعید مغل۔ کراچی

رحمتوں کا مہینہ

موسم عید کا
قریب آرہا ہے
جانے کیوں
گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ
لگ رہا ہے
جیسے کچھ ہونے والا ہے
مالک! اس برس
رحمتوں کے مہینے میں
اپنا خاص کرم کر دینا
رحمتوں کے مہینے میں
کسی کو کوئی دکھ نہ دینا
شاعر: انیل پٹھان۔ جامشورو

منی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

قارئین گرامی جب آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہوں گے تو رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا ہوگا۔ ARY ڈیجیٹل کے پروگراموں نے ہمیشہ ناظرین کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہمیں سرخرو کیا ہے۔ ARY ناظرین آپ کا شکریہ کہ آپ کے ماہرانہ مشورے ہمیں نیا حوصلہ دیتے ہیں۔ آیئے اب چلتے ہیں ARY ڈیجیٹل کے پروگراموں کی طرف اور امید ہے کہ آپ ہمیں حوصلہ دیں گے۔

ARY ڈیجیٹل سے آن ایئر ہونے والی سیریل ''بے شرم'' نے ناظرین کے حلقے میں خاص طور پر خواتین میں مقبولیت حاصل کر لی ہے اور صبا قمر نے خوبصورت اداکاری کر کے اپنے آپ کو منوا لیا۔ سیریل ''بے شرم'' کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ عورت محبت کے بغیر تو زندہ رہ لیتی ہے مگر عزت کے بنا نہیں اور عزت ہی عورت کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔

جب عورت کو عزت نہیں ملتی تو اس کے اندر کی باغی عورت جنم لیتی ہے اور یہ بغاوت سب کچھ ختم کر دیتی ہے حتیٰ کہ اپنا آپ بھی مگر جب محبت کے ساتھ ساتھ عزت کا احساس حاوی ہوتا ہے تو عورت اپنا تن من سب اُس مرد پر نچھاور کر دیتی ہے اور بس سیریل بے شرم بھی کچھ ایسی ہی عزت اور محبت کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ہے مشعل اور حیدر کی۔ مشعل ایک مایہ ناز اور پائے کی ماڈل ہے۔ جس نے بہت کم عرصے میں شہرت کے دروازے بجا دیے۔ حیدر ایک الگ دنیا کا باسی ہے۔ مگر انجانے میں ایک بندھن میں بندھ گیا اور یہ انجانا رشتہ ان کی زندگی بن گیا۔ عتیقہ اوڈھو (ساحرہ) نے اس میں مشعل (صبا قمر) کی والدہ کا کردار بہت بھرپور انداز سے کیا ہے یہ اپنی زندگی میں مگن رہنے والی خاتون ہیں اور اس عورت کو زندگی سے بہت شکایت ہے کہ اُسے کبھی سچا پیار نہیں ملا۔

وہ ایک سچے پیار کی تلاش میں اپنی شادیاں ختم کرتی رہی۔ سیریل 'بے شرم' کی کہانی مختلف کرداروں کے گرد گھومتی رہتی ہے اس سیریل کو تحریر کیا ہے ثروت نذیر نے جبکہ ہدایت فاروق رند کی ہیں۔ سیریل کے مرکزی کرداروں میں عتیقہ اوڈھو' صبا قمر' محمود اختر' زاہد احمد' سندس طارق' صوفیہ خان' عنا علی' شائستہ جبیں' فیصل رحمان اور ریحان شیخ قابل ذکر ہیں۔ سیریل 'بے شرم' ARY ڈیجیٹل سے ہر منگل کی رات 8 بجے دکھائی جا رہی ہے۔

اِدھر ڈیجیٹل سے دکھائے جانے والے پروگرام 'جیتو پاکستان' نے اپنی انفرادیت برقرار

رکھی ہوئی ہے اور تمام چینلز سے آن ایئر ہونے والے شوز میں نمبر 1 کی پوزیشن برقرار رکھنے میں

ایک کثیر حلقے کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں خاصے کامیاب ہیں۔ یہ پروگرام ہر جمعہ اور اتوار کی

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''بے شرم'' میں صبا قمر اور زاہد خان

کامیاب ہوگیا ہے۔

فہد مصطفٰے کے انداز اور محبت بھرے جملے جو وہ ناظرین سے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی اور ان پروگرام بحیثیت ہوسٹ وہ ناظرین سے بہت قریب نظر آتے ہیں اور پھر 'جیتو پاکستان' کے ہدایت کار

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''تم میری ہو'' میں سدرہ خان اور اعجاز اسلم

کامران خان کی محنت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پروگرام کی خوبصورتی میں کامران خان ناظرین کی جانب سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ فہد مصطفٰے

رات 7:30 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھایا جارہا ہے۔

جس کے سینئر ایگزیکٹو پروڈیوسر علید خان ہیں۔ ڈیجیٹل سے آن ایئر ہونے والے دلنشین پروگرام 'گڈ مارننگ پاکستان' نے اپنی کامیابی کی روایات کو برقرار رکھا ہے اور نئے آئیڈیا پیش کرنے پر اس خوبصورت پروگرام میں دن بہ دن نکھار آتا جارہا ہے۔ یہ پروگرام پیر سے لے کر جمعہ تک ندا پاشا صبح 9 بجے پیش کرتی ہیں۔ علی

عمران کا تحریر کردہ کھیل 'بلبلے' کی 400 اقساط مکمل ہو گئی ہیں۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا سٹ کام ہے جس کو یہ اعزاز ملا ہے اور ابھی اس کی کامیابی کا سفر جاری رہے گا۔ اس کی ہدایت نبیل جبکہ فنکاروں میں حنا دل پذیر' نبیل' محمد اسلم اور عائشہ عمر قابل ذکر ہیں۔ مزاحیہ کھیل 'بلبلے' ہر اتوار کی شام 7 بجے ڈیجیٹل سے دکھایا جارہا ہے۔

اب چلتے ہیں ARY ڈیجیٹل سے کامیابی کا سفر طے کرنے والی سیریل 'تم میری ہو' کی طرف یہ کہانی دو بھائیوں کی ہے جو ایک ہی لڑکی کو پسند کرتے ہیں چھوٹے بھائی کو جب پتہ چلتا ہے جب وہ بڑے بھائی کی بیوی بن کر آجاتی ہے۔ چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے جلتا ہے اور وہ غلط طریقے سے بڑے بھائی کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کی خوشیوں میں بھی شریک نہیں ہوتا اور مزے کی بات دیکھیں کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی میں غلط فہمی پیدا کرنیوالے کے بعد چاہتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے یہ ایک خطرناک ڈھما کہ ہوگا کہ بڑا بھائی بیوی کو چھوٹے بھائی کے غلط رویے کی وجہ سے طلاق دے۔ کیا چھوٹا بھائی بڑے بھائی کا گھر برباد کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو سیریل "تم میری ہو" دیکھنا ہوگی کیونکہ بھائیوں کے کردار میں فیصل قریشی اور اعجاز اسلم نے بہت خوبصورت اداکاری کی ہے۔ اس سیریل کو تحریر کیا ہے ثمینہ اعجاز نے جبکہ ہدایت نجف بلگرامی کی ہیں۔ سیریل کے فنکاروں میں فیصل قریشی' اعجاز اسلم' سارا خان' شازیہ ناز' ندا ممتاز' زینب قیوم' شہزاد نواز اور دیگر شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر منگل کی رات 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جارہی ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ اور آپ کو اسلامی چینل کیو ٹی وی لے کر چلتے ہیں بعد خطبہ جمعہ 1 بجے سے 2 بجے تک مفتی رمضان سالوی درس بھی دیں گے اور تراویح آپ دیکھ سکیں گے روزانہ داتا دربار سے یہ دونوں پروگرام لائیو دکھائے جائیں گے۔ پروگرام 'صبح خیر' اتوار 10 بجے سے لے کر 12 بجے تک بروز اتوار یسرا خان لائیو پیش کرتی ہیں۔ جبکہ پروگرام 'روحانی دنیا' ہفتہ اور اتوار رات 12 بجے اقبال باوا لائیو آن ایئر ہوتے ہیں۔ پروگرام سحری اور افطار میں آپ کے پسندیدہ میزبان شرکت کررہے ہیں۔

اور ناظرین جنہیں دیکھ کر مستفید ہو رہے ہوں گے اور یقیناً بچے اپنی باری کے انتظار میں ہوں گے تو اب بتاتے ہیں ARY نک (Nick) کے حوالے سے پروگرام "Motu Patlu" روزانہ دوپہر 4 بجے اور شام 7 بجے پیش کیا جائے گا پروگرام "Tuff Puppy" پیر سے جمعرات روزانہ شام ساڑھے پانچ بجے "Ogg & The Cockeroaches" روزانہ شام 5 بجے اور رات 8 بجے یہ پروگرام اپنی مثال آپ ہے "Pawpartol" یہ پیر سے لے کر جمعہ تک دوپہر 1:30 بجے دکھایا جائے گا۔ پروگرام "Legend Of Koora" روزانہ 6 بجے شام پیر سے لے کر جمعہ تک دکھایا جائے گا۔ جبکہ H.B.O سے خوبصورت فلم "Terminator Genisys" دن 1 بجے پھر رات 9 بجے اتوار کو دکھائی جائے گی۔ کچھ سیریز جون میں ناظرین کے لیے پیش کی جائے گی اس کے ساتھ ہی قارئین ہم اگلے ماہ پھر خوبصورت پروگراموں کے ساتھ حاضر ہوں گے اجازت دیں۔

☆☆......☆☆

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

پاکستان کی مٹی

شادی کے بعد فلم انڈسٹری سے دوری اختیار کرنے والی اداکارہ ریما نے ایک بار پھر فلم انڈسٹری میں سرگرم ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ریما

مختلف اسکرپٹ دیکھ رہی ہیں اور فیصلہ ہوتے ہی فنکاروں کو کاسٹ کیا جائے گا۔ خبر یہ ہے کہ ریما خان نے فلم کو مکمل طور پر کراچی میں بنانے کا فیصلہ کیا ہے ان کا ماننا ہے کہ فلم انڈسٹری کا Revival ہو چکا ہے لہٰذا انہیں بھی اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے ریما جی کہ پاکستان کی مٹی میں بہت کشش ہے یہاں سے جانے والے جلد ہی لوٹ آتے ہیں۔

ہمت نہیں ہاری

عاشر عظیم نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی ایک اور فلم بنائیں گے۔ یہ بات انہوں نے ایک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

انٹرویو میں بتائی کہ وہ مالک پر پابندی سے بالکل مایوس نہیں ہیں اور امید کرتے ہیں کہ جلد یہ پابندی ہٹالی جائے گی۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ جن لوگوں نے فلم مالک دیکھی اُن کا ماننا ہے کہ اس قدر بہترین فلم شاید ہی اب کوئی بنا سکے اور اس پر پابندی لگانا پاکستانی عوام کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔

دوبارہ پھر سے

مہرین جبار کے نام سے فلمی اور غیر فلمی سب ہی لوگ واقف ہیں۔ 'رام چند پاکستانی' کے بعد

مہرین کی دوسری فلم 'دوبارہ پھر سے' تکمیل کے مراحل میں ہے اس فلم کی 80% عکس بندی امریکہ میں کی گئی ہے۔ یہ فلم خوبصورت لوکیشنز اور سیٹ ڈیزائننگ سے آراستہ ہے۔ فلم کی کاسٹ میں عدیل حسین' تحریم فاروق' طوبیٰ صدیقی' صنم سعید' شاز خان' موکس خان اور علی کاظمی شامل ہیں۔ ان تمام جونیئرز کے ساتھ فلم اور ٹی وی کی منجھی ہوئی اداکارہ عتیقہ اوڈھو کا بھی اہم کردار ہے۔ امید کرتے ہیں کہ 'دوبارہ پھر سے' فلمی دنیا میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوگی۔

سرد جنگ

ذرائع بتاتے ہیں کہ آج کل سلمان خان اور سنجے دت کے تعلقات کافی کشیدہ ہوگئے ہیں۔

جب سے سنجے دت جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک سرد جنگ سی جاری ہے۔ جبکہ سلمان اور سنجے کی ماضی میں بہت دوستی رہی ہے اور سلمان خان نے اُن کا دوران حراست بہت خیال بھی کیا ہے اب یہ جاری کشیدگی کیوں ہے وجہ ابھی تک سامنے نہیں آئی مگر امید ہے کہ جلد بلی تھیلے سے باہر آجائے گی۔

آرزو ہوگئی پوری

وینا ملک جو اپنے نام سے زیادہ اسکینڈل کوئین کے نام سے مشہور ہیں۔ تائب ہونے کے

بعد دوبارہ فلموں میں جلوہ افروز ہو رہی ہیں اور اسی مقصد کے لیے وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ

لاہور میں مقیم ہیں۔ جس فلم میں وہ بطور ہیروئن کام کر رہی ہیں اس کے گانے اُن کے شوہر اسد خٹک گائیں گے۔ مبارک ہو خٹک صاحب آپ نے تو اپنی منزل پالی یعنی مشہور ہونے کی آرزو پوری ہو ہی گئی۔

XXX-Return Of Zander Cage کی ہیروئن ہیں دپیکا پڈوکون جی ہاں آج کل بالی وڈ
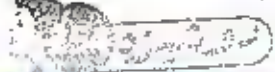
ہیروئنز اسی بی چھلانگ کی منتظر رہتی ہیں کہ انہیں بالی وڈ سے کوئی زبردست قسم کی آفر آجائے اور دپیکا اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئیں۔ وہ امریکہ میں اپنی فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہیں جو جلد ہی بڑی اسکرین پر نمائش کے لیے پیش کی جائے گی۔

ایشوریا، جیکولین اور دپیکا کے بعد اب پریانکا چوپڑا بھی مشہور ٹی وی سیریل Bay Watch جو اب مکمل فلم کی شکل میں تیاری کے

مراحل میں ہے۔ اس میں اہم کردار نبھا رہی ہیں انگریزی زبان سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ بے واچ پاکستان میں کس قدر شہرت کا حامل پروگرام مانا جاتا تھا۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ جو لوگ انگریزی زبان سے بالکل بھی واقف نہیں تھے وہ اس شو کو زیادہ شوق سے دیکھتے تھے اب دیکھنا ہوگا کہ کیا سانولی سلونی بھارتی ناری پامیلا کا متبادل ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

کچن کارنر

شبانہ عنایت

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

آلو گوبھی

اجزاء

بند گوبھی	ڈیڑھ کپ (کدوکش کریں)
آلو	تین عدد
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
ہری مرچ	ایک عدد
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچ
تیل	دو کھانے کے چمچے
پانی	آدھا کپ
نمک	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

ایک فرائنگ پین میں دو کھانے کے چمچے تیل ڈال کر زیرہ ڈال دیں۔ اس کے بعد اس میں چاپ کی ہوئی پیاز ڈالیں۔ جب وہ ہلکی براؤن ہوجائے تو اس میں ادرک، لہسن پیسٹ شامل کردیں۔ اچھی طرح فرائی کرنے کے بعد اس میں ہلدی پاؤڈر، سرخ مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور گرم مسالا پاؤڈر ڈالیں۔ اب اس کو دو منٹ تک پکائیں۔ اس کے بعد ٹماٹر ڈالیں اور اس وقت تک پکائیں جب تک وہ نرم نہ ہوجائیں۔ اب اس میں چاپ کیے ہوئے آلو اور کدوکش کی ہوئی بند گوبھی شامل کردیں، ساتھ ہی نمک بھی شامل کردیں۔ آدھا کپ پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ اگر سبزی گل جائے تو ٹھیک، ورنہ مزید پانی ڈال کر گلنے تک پکائیں۔ جب پانی خشک ہوجائے تو چولہے سے اتارلیں۔ ہرا دھنیا سے گارنش کریں۔

مسالے دار جھینگے

اجزاء

میرینیشن کے لیے جھینگا	آدھا کلو
ادرک، لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچ
لال فوڈ کلر	ایک سے دو چٹکی

لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچ
شملہ مرچ	ایک کپ
کڑی پتہ	4 سے 5 پتے
چلی سوس	ایک کھانے کا چمچ
پیاز	آدھا کپ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب:

سب سے پہلے جھینگوں کو دھو کر صاف کر لیں۔ ایک باؤل میں جھینگے ڈال کر اس میں لہسن ادرک پیسٹ، سرخ مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، کارن فلور، لال فوڈ کلر، لیموں کا رس ڈال کر اسے ایک گھنٹے کے لیے میرینیٹ کرنے کے لیے رکھ دیں۔ پھر ایک فرائنگ پین میں تیل ڈال کر اس میں کڑی پتہ ڈالیں اور نکال لیں۔ پھر اسی پین میں پیاز ڈالیں اور پھر اسی میں ہی شملہ مرچ لمبائی میں کاٹ کر شامل کر دیں۔ اس کے بعد اس میں چلی سوس اور سویا سوس بھی ڈال دیں۔ اچھی طرح فرائی کرنے کے بعد اس میں جھینگے ڈال کر اسے اچھی طرح پکائیں۔ پھر جب اس کا مسالا خشک ہونے لگے تو ہلکی آنچ کر دیں اور مزید 4 سے 5 منٹ پکائیں۔ اگر گریوی بنانے کے لیے پانی شامل کرنا چاہیں تو اس موقع پر پانی بھی ڈال دیں، جب جھینگے گل جائیں اور مسالا بھی پک جائے تو اسے ڈش میں نکال لیں اور سادہ چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

بٹر چکن

اجزاء

مونگ پھلی کا تیل	2 کھانے کا چمچ
چکن (بون لیس)	ایک کلو (بڑے چوکور ٹکڑے)
مکھن	50 گرام
گرم مسالا	2 چائے کے چمچے
کٹا ہوا زیرہ	2 چائے کے چمچے
ادرک تازہ	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دار چینی	ایک ٹکڑا
ہری الائچی	6 عدد
ٹماٹو پیسٹ	ایک سے ڈیڑھ کپ
دہی	ایک چوتھائی کپ
کریم	آدھا کپ
لیموں کا رس	ایک ٹیبل اسپون

ترکیب:

فرائنگ پین میں دو ٹیبل اسپون تیل ڈال کر اسے گرم ہونے دیں۔ اب اس میں چکن ڈال کر اچھی طرح فرائی کریں۔ 4 سے 5 منٹ تک اچھی طرح فرائی کرنے کے بعد جب اس کا رنگ تبدیل ہو جائے تو چکن کو نکال دیں۔ اب اسی فرائنگ پین میں مکھن ڈالیں۔ جب وہ پگھل جائے تو اس میں ایک ایک کر کے تمام مسالے ڈال دیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو چکن کو دوبارہ سے اسی فرائنگ پین میں شامل کر دیں۔ اب اس میں ٹماٹو پیسٹ بھی شامل کر دیں، ساتھ ہی چینی بھی ڈال دیں۔ اگر چکن گلنے سے رہ گئی ہو تو تھوڑا سا پانی بھی شامل کر دیں اور ڈھکن ڈھک کر تقریباً 15 منٹ پکنے دیں۔ جب چکن گل جائے تو اس میں دہی، کریم اور لیموں کا رس شامل کر دیں اور 5 منٹ تک مزید پکائیں یہاں تک کہ اس کا مسالا گاڑھا ہو جائے۔ اب چولہا بند کر دیں۔ بٹر چکن تیار ہے۔ بوائل چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

نان

اجزاء

میدہ	ایک کپ (125 گرام)
بیسن	2 کھانے کے چمچے
بیکنگ سوڈا	ایک چٹکی
بیکنگ پاؤڈر	1 چوتھائی چائے کا چمچہ
پانی	ایک کپ

ہلدی	ایک چٹکی
شوگر سیرپ کے لیے چینی	ایک کپ
پانی	آدھا کپ
گھی/کوکنگ آئل	حسب ضرورت

ترکیب:

مکسنگ باؤل میں ایک کپ میدہ، دو کھانے کے چمچے بیسن، ایک چٹکی بیکنگ سوڈا، ہلدی ایک چٹکی ڈال کر مکس کریں، پھر اس میں پانی ڈالیں۔ اگر ایک کپ پانی ڈالنے کے بعد آمیزہ گاڑھا ہو تو تھوڑا پانی مزید اس میں شامل کردیں۔ اس آمیزے کو اچھی طرح مکس کریں، یہاں تک کہ سب چیزیں یکجان ہو جائیں۔ اب اس آمیزے کو 12 سے 15 گھنٹے تک کچن میں ہی ڈھک کر رکھ دیں۔ اگر آپ کے علاقے میں سردی زیادہ پڑتی ہے تو 20 سے 24 گھنٹے تک رکھیں۔ جب مقررہ وقت گزرنے کے بعد آپ اس آمیزے کو دیکھیں گی تو اس میں بلبلے ہوں گے اور یہ مزید پتلا ہو چکا ہوگا، لہٰذا اس میں دوبارہ سے ایک سے دو ٹیبل اسپون میدہ شامل کردیں اور اچھی طرح مکس کریں۔ اب اس آمیزے کو ٹماٹو کیچپ کی بوتل میں بھرلیں۔ شوگر سیرپ کے لیے ایک پین میں چینی ڈالیں اور اگر چٹکی بھر زعفران ڈالنا چاہیں تو ڈال دیں۔ چولہے کو ہلکی آنچ پر رکھیں جب تک شوگر سیرپ تیار نہ ہو جائے۔ چولہا بند کردیں اور اس میں ایک چوتھائی چائے کا چمچہ لیموں کا رس ڈالیں، پھر اسے چولہے پر رکھ دیں تاکہ یہ شیرہ گرم رہے۔

تلنے کے لیے ایک کڑاہی میں گھی/کوکنگ آئل گرم کریں۔ جب تیل گرم ہو جائے تو بوتل کی مدد سے جلیبی کی طرح کے گول دائرے بنائیں۔ جب تل جائیں تو اسے کڑاہی سے نکال کر شیرے میں ڈال دیں۔ 2 سے 3 منٹ تک شیرے میں الٹ پلٹ کریں اور نکال دیں۔ گرما گرم جلیبی چائے کے وقت پیش کریں۔

شاہی بادامی حلوہ

اجزاء

بادام کا پاؤڈر	100 گرام
گھی	آدھا کپ
دودھ	دو کپ
چینی	ایک چوتھا کپ
کھویا	100 گرام
گارنشنگ کے لیے بادام، پستے	حسب ضرورت

ترکیب:

سب سے پہلے ایک دیگچی میں گھی ڈالیں۔ جب وہ گرم ہو جائے تو پھر اس میں بادام کا پاؤڈر ڈال دیں اور اسے اس وقت تک فرائی کریں جب تک وہ ہلکا براؤن نہ ہو جائے، اس دوران دھیان رکھیں کہ چولہے کی آنچ ہلکی ہونی چاہیے، ورنہ تیز آنچ کی صورت میں بادام پاؤڈر ڈالتے ہی جل جائے گا اور حلوے میں جلنے کی بو آنے لگے گی۔ دوسرے پین میں دودھ گرم کریں اور اس میں چینی ڈال دیں، پین میں اس وقت تک چمچ چلائیں، جب تک چینی مکمل طور پر حل نہ ہو جائے۔ جب دیگچی میں موجود بادام پاؤڈر لائٹ براؤن ہو جائے تو پھر اس میں چینی ملا دودھ اس میں شامل کر کے چمچ چلائیں، آہستہ آہستہ حلوہ گاڑھا ہونا شروع ہو جائے گا۔ اس دوران ہی اس میں کھویا بھی شامل کردیں۔ مسلسل چمچ چلاتی جائیں، یہاں تک کہ گھی الگ دکھائی دینے لگے یا وہ دیگچی کی سائیڈز سے ہٹنے لگے۔ حلوے کو کم از کم 15 سے 20 منٹ مستقل پکانا ہے۔ جب وہ تیار ہو جائے تو اسے پیالیوں میں نکال کر بادام پستے سے گارنش کریں، گرما گرم شاہی بادامی حلوہ مہمانوں کے سامنے پیش کریں۔

☆☆......☆☆